حیدرآباد ٹیچر

جلد ۱۶ شمارہ ۱

مقاصد

(۱) طبقہ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا ۔

(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا ۔

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر ۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا ۔

قواعد

(أ) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا ۔ اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکارعالی سے یہ ہرماہ شہریور ۔ آذر ۔ اسفندار ۔ خورداد مطابق جولائی ۔ اکتوبر ۔ جنوری ۔ اپریل میں شائع ہوگا ۔

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی ۔

اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکارعالی تین روپیہ مع محصولڈاک سالانہ (سکہ رائجہ) صرف اردو حصہ (یک روپیہ ۱۴ آنہ) سالانہ قیمت فی پرچہ اُردو انگریزی (۱۲ آنہ) صرف اُردو (۸ آنہ)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اُردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکے گا

(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں ۔

(ھ) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے ۔

(و) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ھذا رہے گا ۔

شتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ھے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورہ صفحہ	دس روپیہ	پانچ روپیہ	تین روپیہ
نصف صفحہ	پانچ روپیہ	دو روپیہ	۱ روپیہ ۸ آنہ
ربع صفحہ	۲ روپیہ ۸ آنہ	۱ روپیہ ۶ آنہ	۱۵ آنہ
فی سطر	۱۰ آنہ	۸ آنہ	۶ آنہ

اعظم [illegible] پریس مغلپورہ حیدرآباد دکن میں طبع ہوکر صدر انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکارعالی موقوعہ دفتر نظامت تعلیمات سے شایع ہوا

جلد ۱۶ شمارہ ۱

زیر سرپرستی جناب سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔ اے (آکسن) ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

صدر انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

کا

سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت

سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسئول۔ عبدالنور صدیقی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

سعید الدین خاں بی۔ اے۔ ڈپ ایڈ (عثمانیہ)۔ ملا فخر الحسن۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ شہر یور لغایتہ آبان ۱۳۵۰ف

فہرست مضامین

جلد ۱۶ — شمارہ ۱

مدرسہ اور مدرس

چند اصلاحی تجاویز

از

مولوی محمد اعظم خاں صاحب ایم - اے ، ڈپ - ایڈ صدر مدرس
مدرسہ وسطانیہ پاتھری

مدرسہ کے عناصر اربعہ اور ان میں مدرس کی اہمیت

ماہرین تعلیم اس دنیا کی طرح مدرسہ کے بھی چار عناصر بتاتے ہیں :-

۱- اسٹاف ۲- نصاب ۳- آلات تعلیم ۴- عمارت مدرسہ

گذشتہ مضمون میں ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ مدرسہ کے ان عناصر اربعہ میں کوئی عنصر اتنا اہم نہیں جتنا کہ اسٹاف مدرسہ یعنی مدرس ہے - ایک سے زیادہ وجوہ کی بنا پر (جن کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے) مدرس در اصل مدرسہ کی روح رواں ہے اور اسی کی ذات پر بڑی حد تک ملک کی آئندہ نسلوں کی ہر جہتی اصلاح و ترقی منحصر ہوتی ہے -

جب یہ واضح ہو گیا تو اب یہ مسئلہ نہایت اہم ہو جاتا ہے کہ مدرس کے انتخاب میں کن امور کو پیش نظر رکھا جائے اور ایک دفعہ انتخاب ہو جانے کے بعد اسکے لئے کون سے سامان مہیا کئے جائیں جس سے اس کی قابلیتیں پوری طرح بروئے عمل آسکیں اور

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو حیدرآباد ٹیچر جلد ۵ شمارہ ۲ بابتہ آذر لغایتہ بہمن ۱۳۵۰ ف -

وہ زیادہ سے زیادہ اپنے ملک و قوم کی خدمت کرنے کے قابل ہو سکے۔

مدرس کے اوصاف اور فرائض

مدرس کے اوصاف کے متعلق ماہرانِ تعلیم میں سخت اختلاف رائے ہے۔ کوئی کسی صفت پر زور دیتا ہے تو کوئی کسی پر۔ بعض نہایت اہم خصوصیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو بعض کی فہرست اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ کوئی انسان اِن سب کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس بحث کی طوالت میں جانے سے پیشتر ہمیں اس کا تعین صاف اور واضح پیرایہ میں کر لینا چاہیئے کہ ایک مدرس کے فرائض کیا ہیں۔

جب ہم اس کے فرائض کا تعین کر لیں گے تو بڑی حد تک اس کے اوصاف کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں یہ خیال بہت عام ہو گیا ہے کہ مدرسین کا کام محض طلبہ کی ذہنی تربیت کرنا ہے اور بس۔ انھیں انکی جسمانی اور اخلاقی نشو و نما سے کوئی تعلق نہیں۔

حالانکہ کمی نیس سے لے کر اسپنسر تک تمام بڑے بڑے ماہرانِ تعلیم اس پر متفق رہے ہیں کہ حقیقی تعلیم وہی ہے جس میں طلبہ کے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی قویٰ کی متوازن اور ہم آہنگ تربیت کی جائے ورنہ وہ تعلیم نہیں محض تدریس ہو گی۔

اگر ہم اس نقطۂ نظر کو قبول کر لیں اور اس کے لحاظ سے غور کریں تو معلوم ہو گا کہ وہی شخص پیشۂ مدرسی کے لئے موزوں ہے جو نہ صرف خود جسمانی، ذہنی اور اخلاقی صفات سے متصف ہو بلکہ ان اعتبارات سے اپنے شاگردوں کی تربیت اور رہنمائی کی بھی قابلیت رکھتا ہو۔

ظاہر ہے کہ ان صفات کا دائرہ ہم جہاں تک چاہیں وسیع ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک معمولی انسان کے دسترس سے باہر ہو جائے اور تمام عملی اغراض کے لئے بے کار ہو کر صرف ایک خیالی چیز بن جائے اس لئے ضرورت ہے کہ ہم ان سہ گونہ صفات کی مناسب تعریف و تحدید کر کے چند کار آمد اصول و ضوابط مقرر کر لیں اور ہمیشہ انتخاب مدرسین کے وقت انھیں پیش نظر رکھیں۔

۵

۱۔جسمانی اوصاف جسمانی اعتبار سے مدرسین کے متعلق دو امور کا اطمینان کر لینا ضروری ہے۔

ایک تو یہ کہ خود ان کی جسمانی حالت، صحت اور ظاہری وجاہت اچھی ہو۔ وہ کسی ایسے مرض یا جسمانی سُقم میں مبتلا نہ ہوں جو ان کے فرائض منصبی کی ادائی میں رکاوٹ ڈالے یا انھیں بچوں کے تمسخر کا نشانہ بنائے۔ پیشۂ مدرسی میں چونکہ دوسرے پیشوں کے بہ نسبت دماغی کام زیادہ کرنا پڑتا ہے اور اس کے ساتھ ہی مسلسل بولنے کی وجہ سے تمام اعضائے رئیسہ پر بہت بار پڑتا ہے۔ اس لئے اس طبقہ میں اعصابی اور عام جسمانی کمزوری کے علامات بہت جلد ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

پس اس بات کی ضرورت ہے کہ انتخاب کے وقت مدرسین کی صحت جسمانی کا بخوبی اطمینان کر لیا جائے اور خصوصیت کے ساتھ ان کی آواز اور قوت گویائی کو پیش نظر رکھا جائے۔

ان کی ظاہری وجاہت کو پیش نظر رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ مدرس کی شخصیت کا اثر طلبہ پر بہت زیادہ پڑتا ہے اگر وہ کسی جسمانی سقم، بدصورتی، وجاہت کی کمی یا اور کسی وجہ سے طلبہ کے معیار پر پورا نہ اترے تو، چونکہ بچوں میں فطرتاً ظرافت کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے ایسا مدرس بالعموم ان کے تمسخر کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اور وہ ان پر کوئی اثر اور اخلاقی دباؤ قائم نہیں رکھ سکتا۔

جسمانی اعتبار سے دوسری خصوصیت جس کا مدرسین میں ہونا ضروری ہے یہ ہے کہ انھیں کسی قسم کی ورزش یا کھیل کود سے دلچسپی اور لگاؤ ہو۔ کیونکہ کوئی ایسا شخص جو خود کسی کھیل یا ورزش سے دلچسپی نہ رکھتا ہو وہ نہ تو اس کی اہمیت و فوائد کا کماحقہ احساس رکھ سکتا ہے اور نہ طلبہ میں اس کا ذوق پیدا کر کے انکی رہ نمائی کر سکتا ہے۔ اسلئے ہر مدرس کے واسطے لازم ہے کہ وہ تندرست اور وجیہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی جسمانی ریاضت یا کھیل کا بھی شوق رکھتا ہو۔ اور طلبہ کی جسمانی نشو و نما میں اسیطرح حصہ لے سکے جسطرح ان کی ذہنی نشو و نما میں۔

۲ - ذہنی اوصاف

ذہنی اعتبار سے مدرس کا سوسائٹی کی عام سطح سے کسی نہ کسی قدر بلند ہونا ضروری ہے ۔ وہ نہ صرف فطرتاً ذہین و فریس ہو بلکہ اچھا تعلیم یافتہ بھی ہو۔ اسنادی قابلیت کے ساتھ اس کے شوق مطالعہ اور عام معلومات کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے ۔ کیونکہ یہ بہت ممکن ہے کہ بعض لوگ اعلیٰ ڈگریاں نہ رکھتے ہوں لیکن اپنی فطری استعداد، عمیق مطالعہ، شایستہ ماحول اور وسیع تجربہ کی بنا پر پیشۂ مدرسی کے لئے اُن لوگوں سے زیادہ اہل و موزوں ثابت ہوں جو ڈگریاں تو بہت کچھ رکھتے ہوں لیکن ان صفات سے محروم ہوں ۔

جس طرح شاعروں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پیدائشی ذوقِ شعری لیکر آتے ہیں ۔ اسی طرح روزمرّہ کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ بعض لوگ پیشہ مدرسی سے فطری مناسبت رکھتے ہیں ۔ اِسی فطری صلاحیت کی تلاش و جستجو کرنا اور اُسے دوسری تمام صفتوں پر مقدم رکھنا انتخاب کنندہ کا اصلی فرض ہے ۔

۳ - اخلاقی اوصاف

مدرس کے اخلاقی خصوصیات سے مراد نہ صرف وہ عام اخلاقی صفات ہیں جن سے ہر مہذب آدمی کا بہرہ ور ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے ۔ بلکہ ان کے علاوہ اور بھی چند ایسے اوصاف درکار ہیں جنکی دوسرے پیشہ میں چنداں ضرورت نہیں ہوتی ۔ مثلاً بچوں سے محبت، انسانی ہمدردی، خوش مزاجی اور ظرافت ۔ ایک عرصہ تک عوام میں یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ مدرس کیلئے سخت مزاج اور خشک طبع ہونا ضروری ہے، اور وہی مدرس زیادہ کامیاب سمجھا جاتا تھا جس سے طلبہ زیادہ نفرت اور وحشت کا اظہار کریں ۔ لیکن موجودہ زمانہ میں یہ معیار بالکل بدل گیا ہے اور بچہ کی تعلیم کا پورا پورا دارومدار اس کی فطری دلچسپی کے ابھارنے پر سمجھا جاتا ہے ۔ جیسا کہ ہم اس مضمون کے پہلے حصّہ میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں ۔

ظاہر ہے کہ اس کام کو وہی مدرس بخوبی پورا کر سکتا ہے جس کی شخصیت بچوں کے لئے زیادہ سے زیادہ جاذبیت رکھتی ہو، اور جو اپنے عمدہ طرز تعلیم، اپنے اعلیٰ کردار اور اپنے شفقت آمیز برتاؤ سے ان کے دل میں گھر کر لے ۔ ایسا مدرس اور صرف

ایسا ہی مدرس بچوں کے شوق و دلچسپی کو پوری طرح ابھار سکتا ہے ۔

صدر مدرس کی اہمیت اور خصوصیات

اس سلسلہ میں صدر مدرسین کے متعلق بھی چند امور کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ مدرسہ میں صدر مدرس کی وہی اہمیت ہے جو کہ انسان کے جسم میں دماغ کی ۔ اس کا کام دیگر مدرسین کی طرح محض تعلیم و تدریس نہیں بلکہ انتظام و نگرانی بھی ہے ۔ اکثر ماہران تعلیم کا خیال ہے کہ صدر مدرس کا کام ¼ حصہ تدریس کا ہوتا ہے تو ¾ نگرانی کا اور یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ اُسے ایک طرف مدرسین کے کام کی نگرانی کرنی پڑتی ہے تو دوسری طرف طلبہ کی۔ اس کے علاوہ عمارت کی صفائی، آلات تعلیم کی حفاظت کھیلوں کا انتظام رجسٹرات کی تنقیح اور دفتر کا کام غرض مدرسہ کا ہر شعبہ اسکی ذاتی نگرانی اور رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے ۔

مسٹر رن اپنی کتاب نظم و نسق مدرسہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "صدر مدرس کی حیثیت مدرسہ میں ایسی ہی ہے جیسے کہ اسپرنگ کی گھڑی میں"۔ بالخصوص ہمارے ملک میں جہاں فرض شناسی کا احساس لوگوں کے دلوں سے بالکل مفقود ہو چکا ہے صدر مدرس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے ۔

ایک اچھا صدر مدرس خراب سے خراب حالات میں بھی مدرسہ کی بہت کچھ اصلاح کر سکتا ہے اور ایک نا اہل صدر مدرس اچھے سے اچھے مدرسہ کو بھی خاک میں ملا سکتا ہے ۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے انتخاب میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا جائے اور علاوہ اُن صفات کے جو مدرسین کے لئے ضروری قرار دیئے گئے ہیں اسکی انتظامی قابلیت اور فرض شناسی کا بطور خاص لحاظ رکھا جائے لیکن یہ واضح رہے کہ جس طرح اسکے لئے فرض شناس اور منتظم ہونا ضروری ہے، اُسی طرح اس کا مروت، ہمدردی اور خوش خلقی سے بہرور ہونا بھی لازمی ہے کیونکہ جب تک ان دونوں صفات میں مناسب امتزاج نہ ہو کوئی صدر مدرس کامیاب ثابت نہیں ہو سکتا ۔

ہمارے مدارس میں بالعموم صدر مدرسین یا تو اس قدر بے پروا اور نرم مزاج ہوتے

ہیں کہ اس سے مدرسہ کے کام پر بہت برا اثر پڑتا ہے یا اس قدر سخت گیر کہ ان کا طرز عمل انسانیت کے حدود سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ یہ دونو صورتیں نہایت مذموم ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صدر مدرسین اپنے طرز عمل میں ایسا توازن قائم رکھیں کہ ایک طرف تو مدرسہ کا کام خراب نہ ہو سکے، دوسری طرف اخلاق و مرت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ صدارت پر ایسے اشخاص کا انتخاب عمل میں آئے جو فرض شناسی اور اعلیٰ انتظامی قابلیت کے ساتھ عمدہ اخلاق اور اعلیٰ انسانی صفات سے بھی بہرور ہوں۔

انتخاب مدرسین کا طریقہ اب ہم مدرسین کے طریقہ انتخاب کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ امیدواروں کے انتخاب کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ سررشتہ کے ماہر اور تجربہ کار عہدہ داروں کا ایک بورڈ ہر سال آغاز میقات تعلیمی سے قبل امیدواروں کو بغرض معائنہ (انٹرویو) طلب کرے اور ہر ممکنہ طریقہ سے ان کے مندرجہ بالا جسمانی، ذہنی اور اخلاقی خصوصیات کی جانچ کرے۔ اس غرض کے لئے حسب ذیل طریقے بڑی حد تک مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں:—

ا۔ امیدواروں کی صحت جسمانی کا امتحان، ان کی ظاہری وجاہت کا لحاظ اور کسی ورزش یا کھیل سے ان کی دلچسپی کی تحقیق۔

۲۔ زبانی سوالات کے ذریعہ ان کے عام خیالات اور میلانات کی جانچ۔

۳۔ تقریری مقابلہ کے ذریعہ ان کی قوت گویائی اور معلومات کا امتحان۔

۴۔ امتحان مقابلہ کے ذریعہ ان کی تحریری قابلیت کا اندازہ۔

۵۔ کسی جماعت کو تعلیم دلاکر ان کی تدریسی استعداد کی جانچ۔

۶۔ ان کے علمی اسناد، تعلیمی رکارڈ، متعلقہ اساتذہ یا عہدہ داران کے صداقت نامے وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ اس طرح تحقیق و جستجو کے بعد جو انتخابات کئے جائیں گے وہ کس قدر صحیح اور موزوں ثابت ہوں گے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ طریقے بڑی محنت اور فرصت چاہتے ہیں۔

لیکن سررشتہ کے مفاد اور ملک کی آئندہ فلاح و بہبود کی خاطر سال میں ایک مرتبہ عہدہ داران انتخاب کنندہ کو اتنی زحمت گوارا کرنی چاہئیے۔ اس طرح جن امیدواروں کا انتخاب کیا جائے، انھیں ایک سال کے لئے منصرمانہ طور پر چند ایسے مدارس میں مامور کردیا جائے، جہاں کے صدر مدرسین کا تعلیمی تجربہ وسیع اور جن کی صائب رائے مسلّمہ ہو۔

اس طرح ایک طرف تو ان نوآموز مدرسین کی عملی تربیت صحیح رہنمائی میں ہو سکیگی، دوسری طرف سال بھر کے تجربہ کے بعد ان کے متعلق صدر مدرسین کی رائے بڑی حد تک وقیع اور صحیح ثابت ہوگی۔

اس قدر چھان بین کے بعد جو لوگ پیشۂ مدرسی کے لئے انتخاب ہوں گے ان کے متعلق بہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوں گے۔ قوم کی ہونہار نسلیں ان کے مبارک سایہ میں پھولیں پھلینگی اور ملک کی آئندہ قسمت کا ستارہ ان کے ہاتھوں چمکے گا۔ ایسے گوہر گراں مایہ کی (جو اس قدر تلاش و جستجو سے ہاتھ آئے ہوں) کما حقہٗ قدر کرنی چاہیے اور ان کے لئے وہ تمام سامان بہم پہنچانا چاہئیے جو ان کی حقیقی قابلیتوں کو بروئے عمل لاتے ہیں مدد دے سکیں۔

سررشتہ تعلیمات کی دشواریاں

بدقسمتی سے ملک کے موجودہ حالات سررشتہ تعلیمات کے لئے ناساعد ہیں۔ دولت اور حکومت جو ابتدائے آفرینش سے بیشتر انسانی آبادی کے لئے موثر ترین موجبات ترغیب ثابت ہوئے ہیں سررشتہ تعلیمات کے لئے پہلے ہی سے مفقود تھے۔ لے دیکے صرف ایک اعزاز و احترام باقی رہ گیا تھا، سو موجودہ زمانہ میں یہ بھی رخصت ہوگیا ہے۔ اب ہماری سوسائٹی میں مدرسین کی کوئی وقعت باقی نہیں رہی اور ان کے ساتھ ایک علمی برادری کے معزز ارکان کے بجائے معمولی ملازمین کا سا سلوک ہونے لگا۔

اس طرح یہ سررشتہ دولت و حکومت کے ساتھ اس اعزاز و احترام سے بھی محروم ہوگیا جو عہد قدیم میں ایشیائی ممالک اور عہد حاضر میں مغربی اقوام کا طغرائے امتیاز رہا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ ہماری سوسائٹی کا ہونہار، اولوالعزم اور عالی دماغ طبقہ

فطرتاً دوسرے ایسے پیشوں کی طرف مائل ہوجاتا ہے جن میں دولت وحکومت اور جاہ وشہرت کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں اور وہ تلچھٹ جسے کہیں اور موقع نہیں ملتا بادلِ ناخواستہ یہ پیشہ اختیار کرتا ہے چنانچہ ہمارے موجودہ ناظم صاحب تعلیمات (مولوی محمد حسین صاحب جعفری) نے ایک موقع پر نہایت صحیح فرمایا تھا کہ "موجودہ طبقہ مدرسین میں تقریباً ۹۶ فی صدی اس پیشہ کے نااہل ہیں" یہ صورت حال سخت افسوسناک ہے اور جب تک اس کی اصلاح نہ ہو قوم سے اچھے افراد پیدا ہونے کی توقع رکھنا عبث ہے۔ اس اصلاح کی خاطر سوسائٹی کی موجودہ تنظیم وترتیب میں بہت کچھ ردّوبدل لازم ہوگا جو نہ تو ممکن العمل ہے اور نہ جسکی تفصیل کی یہاں گنجایش ہے۔ بحالات موجودہ سب سے آسان اور قابل عمل صورت یہی ہے کہ ایک تو مدرسین کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیا جائے، دوسرے اُن کے لئے جہاں تک ہوسکے ایسے موجباتِ ترغیب پیدا کئے جائیں کہ ایک طرف تو ملک کے قابل افراد اسکی جانب خود بخود مائل ہوں اور دوسری طرف جو لوگ اس پیشہ میں داخل ہوچکے ہیں وہ پورے اطمینان و فارغ البالی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی انجام دے سکیں۔

انتخاب کا معیار اور طریقے اوپر عرض کئے جاچکے ہیں۔ اب ہم اُن تدابیر پر غور کریں گے جن سے منتخب شدہ مدرسین کی قابلیتیں پوری طرح بروئے عمل آسکیں کیونکہ کسی کام کی خرابی کے دو ہی اسباب ہوسکتے ہیں۔ یا تو اس کے کرنے والے میں اس کام کی صلاحیت نہیں یا اس نے اپنی صلاحیت سے پوری طرح کام نہیں لیا بالفاظِ دیگر عدم صلاحیت اور عدم دلچسپی۔

عدم صلاحیت کا علاج اوپر بیان ہوچکا یعنی حسن انتخاب۔

جب امیدواروں کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی خصوصیات کی اسقدر چھان بین کی جائے گی اور اس کے بعد ان کا انتخاب عمل میں آئے گا تو ان کی عدم صلاحیت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اب رہی دوسری وجہ یعنی عدم دلچسپی، یہ بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ پہلی وجہ۔ کیونکہ انسان کی فطری صلاحیتیں خواہ کتنی ہی بلند پایہ ہوں۔

لیکن جب انھیں کام کرنے کے پورے مواقع نہ حاصل ہوں تو ان کا عدم اور وجود یکساں ہوجاتا ہے۔ اس لئے اس کے اسباب اور انسدادی تدابیر پر بھی غور کرنا نہایت ضروری ہے۔

مدرسین کی عدم دلچسپی کے اسباب اور ان کا علاج

۱۔ معاوضہ کی کمی غالب کی طرح اس دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو سچے دل سے یہ کہہ سکیں کہ ع "نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا" ورنہ بیشتر تعداد ان ہی دو (ستائش و صلہ) کے توقعات پر کام کرتی ہے۔ سررشتہ تعلیمات میں دوسرے سررشتوں کی بہ نسبت (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) معاوضہ اس قدر کم ہے کہ اس کی وجہ سے قابل لوگ حتی الامکان اس سے بچنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ بعض خیالی مصلحان Idealists نے ایثار و قناعت پسندی کی تلقین کرکے اس صورت حال کی تلافی کرنی چاہی، لیکن اس سے حقائق پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔ انھیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ عہد حاضر میں ضروریات زندگی اس قدر بڑھ گئی ہیں اور مغربی تہذیب نے انھیں اسقدر ناگزیر بنا دیا ہے کہ کوئی متمدن انسان ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پس اپنے نفس کی تسلی کے لئے نہ سہی اپنی حیثیت ہی قایم رکھنے کے لئے ایک مدرس کو کم سے کم اتنا تو ملنا چاہیئے کہ وہ اپنے بالکل ابتدائی اور معمولی ضروریات پورے کرسکے۔ اس طرح ملک کے موجودہ حالات اور معیار زندگی کے لحاظ سے اگر ایک مدرس کی قلیل ترین آمدنی پچاس روپیہ ماہانہ قرار دی جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔

اس کے برخلاف ہندوستان میں بالعموم مدرسین کی اقل ترین آمدنی پندرہ بیس روپیہ ہوتی ہے۔ درآنحالیکہ ایک معمولی بڑھئی اور مزدور بھی روپیہ سوا روپیہ روز سے کم مزدوری پر کام نہیں کرتا۔ پس ظاہر ہے کہ پندرہ بیس روپیہ میں جو مدرسین ملیں گے وہ کس قسم کے ہوں گے اور اگر بدقسمتی سے کوئی اچھا شخص مل بھی جائے تو وہ ان حالات میں کس حد تک مطمئن اور خوش دل رہ سکیگا۔ پس سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ مدرسین کی تنخواہوں کے اسکیل پر نظر ثانی کی جائے اور انکی کم سے کم

یا فنت پچاس روپیہ ماہانہ قرار دی جائے خواہ وہ مدارس تحتانیہ سے تعلق رکھتے ہوں یا فوقانیہ سے۔

۲۔ گریڈوں کی تحدید دوسری چیز گریڈوں کی وہ تحدید ہے جس کی رو سے ہر مدرس کا گریڈ اس کی علمی سند کے لحاظ سے مقرر کر دیا گیا ہے، جس کے آگے وہ کسی حالت میں ترقی نہیں کر سکتا۔ خواہ اسکی کارگزاری کیسی ہی پسندیدہ کیوں نہ ثابت ہو۔ اس طرح اپنا مقررہ گریڈ پانے کے بعد اس کے لئے کوئی مزید ترغیب و تحریض باقی نہیں رہتی اور محنتی اور کاہل، لائق و نالائق فرض شناس اور بے پرواسب ایک ہی زمرہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اگر گریڈوں کی یہ تحدید اٹھادی جائے جس کی رو سے ایک گریڈ کا مدرس اعلیٰ تر گریڈ میں ترقی نہیں پا سکتا، تو ہر مدرس کے لئے مسلسل موجبات ترغیب پیدا ہوتے جائینگے اور اس کی ترقی کے امکانات بہت بڑھ جائیں گے۔ چنانچہ اس وقت بھی دیگر تمام سررشتوں میں یہ حال ہے کہ جب ایک شخص سلسلہ ملازمت میں داخل ہو جاتا ہے، تو پھر اُسے اعلیٰ ترین ترقی کے زینوں تک پہنچنے میں کوئی امر مانع نہیں ہوتا بلکہ بعض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جہاں کہ فرض شناس اور کارگزار لوگ محض اپنی حُسن کارگزاری کی بدولت ایک معمولی نان گزیٹیڈ خدمت سے ترقی کرتے کرتے وزرات عظمیٰ کے عہدہ جلیلہ تک پہنچ گئے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ سررشتہ تعلیمات کے ملازم محض معیار قابلیت کی بناء پر ایسی ترقی سے محروم کر دئے جائیں جو دوسرے سررشتہ کے ملازمین کو حاصل ہے۔ اس عمل سے سررشتہ پر کوئی مزید مالی بار عائد نہ ہوگا۔ اور کارگزار ملازمین کی ترقی کے امکانات غیر محدود ہو جائینگے۔

۳۔ معائنہ کے طریقے مادّی صلہ کے علاوہ قدردانی کے اظہار کا دوسرا طریقہ عہدہ داران بالادست یا افسران معائنہ کنندہ کا اظہار خوشنودی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے ملک میں معائنہ کے طریقے ایسے رسمی اور بندھے بندھائے Stereotype ہو گئے ہیں جس سے مدرس کی صحیح کارگزاری کا کسی طرح اندازہ نہیں ہو سکتا۔

پہلے تو معائنوں کے یہ طریقے طلبہ کی محض ذہنی آزمائشوں سے متعلق ہیں اور انہیں ان کی جسمانی اور اخلاقی نشو و نما کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت کم معائنہ کنندہ افسر مدرسہ کی ان زائد از نصاب مصروفیات کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں جس سے طلبہ میں اجتماعی زندگی کی حقیقی اسپرٹ پیدا ہو یا اُن کے جمالیاتی ذوق کی تربیت ہو سکے مثلاً طلبہ کی انجمن امداد باہمی، انجمن مباحثہ، تمثیلی اور شعری انجمن۔ Poetic and Dramatic Societies نگارخانے Picture gallaries کشافہ Scout باغبانی، پالتو جانور، کھیلوں کے میدان، اقامت خانے، مدرسہ کی زیب و زینت کے اشیاء، طلبہ کا یونیفارم وغیرہ۔

اِس کے برخلاف اُن کی ساری توجہ چند ذہنی آزمائشوں تک محدود ہوتی ہے اور ان میں بھی مقررہ نصاب کے مقررہ حصوں سے آگے بڑھنے نہیں پاتی اور ان میں طالب علم کی عام ذہنی نشو و نما کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔

اس طرز معائنہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک تو مدرسین اپنے شاگردوں کی جسمانی اور اخلاقی تربیت کو اپنے فرائض منصبی سے بالکل خارج سمجھنے لگتے ہیں اور ان کی توجہ کا دائرہ صرف طلبہ کی ذہنی قابلیت تک محدود ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر مدرس کی کوشش اپنے مخصوص مضمون کے مخصوص نصاب کی حد تک محدود ہوتی ہے یعنی وہ متعلم کے بجائے مضمون کو اپنا مقصود بالذات قرار دے لیتا ہے۔ اور دوسرے مضامین سے ارتباط باہمی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا جسکی اہمیت پر ہربارٹ اور اس کے متبعین نے استقدر زور دیا ہے اور اُسے بچوں کی وحدت خیال کے لئے ناگزیر بتایا ہے۔ معائنہ کے مروجہ طریقوں کا دوسرا نقص یہ ہے کہ اُن میں اہم امور کے بجائے ایسی معمولی اور فروعی باتوں پر تنقید کی جاتی ہے جن سے مدرسہ کے تعمیری کاموں میں کوئی مدد نہیں ملتی اور نہ ان میں مدرسہ کے ضروریات مشکلات اور مقامی حالات کا کوئی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس بارے میں صدر مدرسین کی حالت خصوصیت کے ساتھ بڑی قابل رحم ہوتی ہے۔ اُنھیں ایک طرف اپنے اسٹاف کو خوش رکھنا پڑتا ہے تو دوسری طرف

طلبہ کو ۔ اِدھر سر پرستوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے تو اُدھر عہدہ داران بالادست کو راضی رکھنے کی ۔ مدرسہ کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو ان کی نگرانی اور رہنمائی سے بے نیاز ہو ۔ عمارت کی صفائی، آلات تعلیم کی حفاظت، طلبہ کے ڈسپلین، مدرسین کی کارگزاری غرض سب باتوں کا وہی ذمہ دار ہوتا ہے ۔ اس کے باوجود اگر معائنہ کنندہ افسر آکر چھوٹی چھوٹی باتوں پر اعتراض اور بازپرس کرنے لگے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا دل کیا کہے گا ۔ اور اس کا جوشِ عمل کہاں تک باقی رہے گا ۔ کہیں تو وہ دفتری معاملات کی ذرا ذراسی غلطیوں کا جوابدہ ہوتا ہے تو کہیں معمولی معمولی انتظامی خامیوں کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے ۔

ہمارے ملک میں عام خیال یہ ہو گیا ہے کہ معائنہ کی غرض وغایت ہی محض نکتہ چینی ہے اور کوئی معائنہ رپورٹ بغیر اس کے مکمل نہیں ہو سکتی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بیشتر معائنہ رپورٹیں عام اصلاحی تجویزوں، مفید تعمیری مشوروں، مسلّمہ تعلیمی اصولوں اور جدید تحقیقات و تجربوں کے بجائے نہایت معمولی معمولی دفتری خامیوں اور ضابطہ کی موشگافیوں پر مشتمل ہوتی ہیں ۔ اس طرح مدارس کو معائنہ کنندہ افسروں کی اعلیٰ قابلیت، وسیع تجربہ اور عمیق مطالعہ سے مستفید ہونے کا موقع نہیں ملتا ۔

ان کی توجہ اعلیٰ تعمیری کاموں کے بجائے بہت فروعی مسائل اور معمولی باتوں میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے ۔ اس لئے ضروری ہے کہ معائنہ کی اصلی غرض وغایت اور صحیح اسپرٹ کو سمجھا جائے اور اِسے محض تکمیلِ ضابطہ کا ایک ذریعہ نہ بنایا جائے ۔ اس سلسلہ میں قارئین کی توجہ اُن بیش قیمت خیالات کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے جو سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کے اسپشل انسپکٹنگ آفیسر جناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے ۴۹ ف کی آل حیدرآباد ٹیچرس کانفرنس کے سالانہ جلسہ میں ظاہر فرمائے تھے ۔ آپ نے اپنی تقریر میں معائنہ مدارس کے مروجہ طریقوں پر تنقید فرماتے ہوئے نہایت خوبی کے ساتھ اسکے صحیح اصولوں کی طرف رہنمائی فرمائی ہے ۔

چنانچہ آپ ایک جگہ فرماتے ہیں :—

"معائنہ کرنے والے عہدہ دار کو جو وسیع اقتدار حاصل ہوتا ہے وہ اس کے ماتحتین اور خود مدارس کیلئے خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ مدرسین کی قسمت اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور جس طرح وہ مدارس کو بنا سکتا ہے اسیطرح انکو بگاڑ بھی سکتا ہے"

آگے چل کر آپ فرماتے ہیں :—

"جس معائنہ کنندہ افسر کو اپنے اختیارات کا بھرا ہوتا ہے اس کا اخلاقی اثر مدارس اور ماتحتین پر بہت برا پڑتا ہے لہذا سب سے بڑی ضرورت اسبات کی ہے کہ معائنہ کرنے والے عہدہ دار کی حیثیت ایک مشیر کی ہو نہ کہ ایک حاکم کی۔"

"معائنہ کے وقت مہتمم کا طرز عمل دوستانہ ہو اور اس میں مداح کا مادہ بھی ہونا چاہیئے۔"

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں :—

"مہتمم تعلیمات میں تخیل کا مادہ بھی ہونا چاہیئے، اسکو لکیر کا فقیر نہ بنا چاہیئے۔ جو ممدد مدرسین نئے تجربے کریں انکی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے اور مقامی حالات اور ضروریات کے لحاظ سے مقررہ قاعدوں کے خلاف بھی عمل کرنے کی اجازت دینی چاہیئے........"

"تعلیم دینے میں جدت و آزادیٔ فکر سے کام لینے والے مدرسین اور عام طور پر مسلمہ طریقہ ہائے تعلیم کی پابندی کرنے والے مدرسین دونو اسبات کے مستحق ہیں کہ ان کی یکساں حوصلہ افزائی کی جائے........."

"مہتمم کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ نکتہ چینی کرے بلکہ جو مدرسین اچھا کام کریں ان کی حوصلہ افزائی بھی کرنا چاہیئے۔" [۱]

ہمیں افسوس ہے کہ بخوفِ طوالت ہم اِن بیش بہا نصایح کا تفصیلی اقتباس نہ پیش کرسکے۔

---

[۱] ماخوذ از حیدرآباد ٹیچر شمارہ ۳ جلد ۱۲ بابتہ اسفندار لغایتہ اردی بہشت ۱۳۴۹ف۔

لیکن ہم اپنے قارئین، خصوصاً اُن اصحاب کو جن کے فرائض میں معائنہ مدارس کا کام داخل ہے، یہ مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ضرور اس تقریر کو شروع سے آخر تک ملاحظہ فرمائیں۔

اگر ان تمام ہدایات پر عمل کیا گیا جو اس بصیرت افروز خطبہ میں دیئے گئے ہیں تو یقین ہے کہ مدارس کی موجودہ تمام خرابیاں بڑی حد تک رفع ہو جائینگی۔

۴۔ بے اطمینانی (الف) تبادلے

ہر اہم کام کے لئے عموماً اور تعلیم و تدریس کے لئے خصوصاً دلجمعی اور اطمینان خاطر ازبس ضروری ہے۔ جب تک مدرسین کو کسی ایک مقام پر کافی عرصہ تک رہنے کا یقین نہ ہو انھیں نہ تو اس جگہ سے دلچسپی ہو سکتی ہے اور نہ وہ وہاں کوئی کام اطمینان سے انجام دے سکتے ہیں۔ مدرسین کو چونکہ دیگر پیشوں کے برخلاف ذی روح افراد سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ انھیں اپنے ماحول سے انس و ہمدردی پیدا کرنے کے لئے مناسب موقع اور کافی مہلت دی جائے۔

لیکن ہمارے ملک میں مدرسین کے تعیّن و تبدل کے جو طریقے رائج ہیں ان سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ مدرسین کو حتی الامکان ان کے وطن میں رکھنے کی کوششیں جو اکثر مغربی ممالک میں کی جاتی ہیں، اُن کی اہمیت اور فوائد کو یہاں پورے طور پر محسوس نہیں کیا جاتا، اور نہ تبادلوں کے وقت مدرسین سے ان کے ضروریات و خواہشات کے متعلق کوئی استمزاج کیا جاتا ہے، بلکہ عموماً اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ آخر وقت تک اپنے تبادلہ اور جائے تبدلہ سے بالکل بے خبر رہیں اور اُس وقت انھیں اسکی اطلاع ہو جب کہ ترمیم و تنسیخ کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔ حالانکہ اگر تبادلہ سے قبل خود اُن سے استمزاج کر لیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ کی نشان دہی کرتے جہاں بھیجنے میں سررشتہ کو بھی کوئی امر مانع نہ ہوتا اور ان کی خواہش بھی پوری ہو جاتی۔

یہ ظاہر ہے کہ سررشتہ اس معاملہ میں ہر مدرس کو خوش نہیں کر سکتا اور اُسے اپنے اغراض و مصالح کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مدرسین سے استمزاج ہی نہ کیا جائے اور ان کی ضرورت اور خواہش معلوم ہی نہ کی جائے۔ ہونا تو

یہ چاہیئے کہ جب اغراض سررشتہ یا کسی مدرس کی خواہش کی بنا پر تبادلہ کی ضرورت لاحق ہو تو سب سے پہلے مدرسین متعلقہ کی مرضی معلوم کی جائے کہ وہ کسی خاص مقام یا ضلع یا صوبہ کے مدارس میں کام کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد سررشتہ اپنے اغراض و مصالح پر غور کرے اور جہاں تک ممکن ہو سررشتہ کے مفاد کے ساتھ ساتھ مدرسین کی خواہش کا بھی لحاظ رکھے۔ اس طرح جو تبادلے ایک دفعہ عمل میں آئیں وہ طویل مدت تک برقرار رکھے جائیں تاکہ مدرسین ایک جگہ سکون و اطمینان سے رہ کر اپنی وہ تمام قابلیتیں جو قدرت نے ان میں ودیعت کی ہیں، طلبہ کی نشوونما اور مدرسہ کے فلاح و بہبود میں صرف کر دیں اور یہ محسوس کریں کہ ان کی زندگی محض بے غایت و بے مصرف نہیں بلکہ وہ ایک مفید اور اہم کام کے آغاز کرنے اور اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ بات اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ وہ کم سے کم آٹھ، دس برس ایک جگہ جم کر رہیں۔ وہاں کے حالات اور ماحول سے واقفیت اور دلچسپی پیدا کریں اور یہ سمجھیں کہ ان کی تمام تر کارگزاری کا دارومدار بلکہ ان کی زندگی کا اصل مقصد اس مدرسہ کی فلاح و بہبود کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا ہے۔

سررشتہ تعلیمات کوئی انتظامی سررشتہ نہیں کہ جہاں چند سال کے بعد ملازمین کا تبادلہ ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف مدرسین کے لئے ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصہ تک ایک مقام پر رہیں تاکہ وہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہو سکیں اور اپنی اس واقفیت اور اثر کو مدرسہ کے سود و بہبود کیلئے استعمال کر سکیں۔

کوئی شبہ نہیں کہ بعض مدرسین اپنے اُن اثرات کو جو زیادہ عرصہ تک کسی مقام پر رہنے سے انھیں حاصل ہوتے ہیں بعض دفعہ مدرسہ کے بجائے اپنی ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ایسی صورتوں میں عموماً ان کا تبادلہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بخوبی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ تبادلے اکثر و بیشتر قصوروار مدرسین سے زیادہ اُن بے قصور مدارس کے حق میں مضر ثابت ہوتے ہیں، جہاں یہ مدرسین

بھیجے جاتے ہیں۔ کیونکہ خلاف مزاج جگہ میں رہنے کی وجہ سے جو بددلی اور عدم دلچسپی ان مدرسین میں پیدا ہو جاتی ہے، اُس کے زبوں اثرات لازماً طلبہ کی ترقی اور مدرسہ کی عام فضاء پر پڑتے ہیں۔

اس لئے تبادلوں کو کسی حالت میں سزا کے طور پر استعمال کرنا صحیح نہیں۔ بلکہ مدرسین کو جہاں تک ہو سکے زیادہ سے زیادہ مدت تک ایک ہی مقام پر رکھنا چاہیئے۔ اگر وہاں ان کی کارگزاری یا طرز عمل کے متعلق کوئی شکایت پیدا ہو تو اس کے لئے وہ تمام تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں جن کی ضابطہ اجازت دیتا ہے جناب مولوی محمد حسین صاحب جعفری اپنی بیش قیمت کتاب " ڈنمارک اور اس کے نظام تعلیم " میں ڈنمارک کے مدرسین کے تبادلوں کے متعلق ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:—

" وہاں مدرسین حتی الامکان کئی سال تک ایک ہی جگہ رکھے جاتے ہیں اور بجز خاص حالات کے جلد جلد ان کے تبادلے نہیں کئے جاتے۔ کم سے کم مدت جو ایک مدرس مدرسہ میں رکھا جاتا ہے دس سال ہوتی ہے۔ جب یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ کسی مدرس کا وجود کسی مدرسہ میں مفید نہیں ہو رہا ہے یا وہ اُس مقام سے دل برخواستہ ہو گیا ہے تو اس کا تبادلہ دوسرے ایسے مدرسہ پر کر دیا جاتا ہے جہاں اُس کا وجود مفید ثابت ہونے کا اطمینان ہو۔"

آگے چل کر آپ اور ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:—

" ڈنمارک کے مدارس میں عام طور سے جو اچھی تعلیم ہوتی ہے اس کا یہی راز ہے کہ اساتذہ قابل ہوتے ہیں۔ اپنے فن سے دلچسپی رکھتے ہیں اور معقول تنخواہیں ملنے کی وجہ سے اطمینان قلب کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں۔ سررشتہ اسبات کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے کہ معلمین کو انہی کے وطن میں رکھا جائے تاکہ وہ اپنے مقامی اثرات کو مدرسہ کی فلاح و بہبود کے کام میں لائیں۔"

غرض ہمارے ملک میں مدرسین کی بے اطمینانی کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے تبادلے بغیر ان کے استمزاج اور مرضی کے جلد جلد کر دیئے جاتے ہیں اور انھیں کسی ایک جگہ جم کر رہنے کا

موقع نہیں ملتا۔ اس پر طرّہ یہ کہ وطن سے دور جن مقامات پر وہ جاتے ہیں وہاں اُن کے لئے بسا اوقات معمولی ضروریاتِ زندگی کا بھی انتظام نہیں ہوتا۔

بہت سے مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں انہیں معمولی سے معمولی درجہ کا مکان میسّر تک نہیں آتا اور نہ کھانے پینے کی کوئی چیز دستیاب ہوتی ہے۔ اگر ان مقامات پر سررشتہ کی جانب سے مدارس کے عمارات کے ساتھ ساتھ مدرسین کے مکانات بھی تعمیر کرادئے جائیں تو ایک طرف تو اُن کی تکلیف رفع ہوجائے گی۔ اور دوسرے طرف طلبہ اور مدرسین میں ارتباط اور یکجائی کے زیادہ مواقع پیدا ہوجائیں گے۔

یہ ضروری نہیں کہ وقت واحد میں اس اسکیم کو بردئے کار لانے کی کوشش کیجائے۔ بلکہ بتدریج ایسے مقامات کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جو دور افتادہ ہوں اور جہاں مکانات کی زیادہ ضرورت ہو۔ اس طرح کچھ عرصہ کے بعد ان کے کرایہ سے اصلی لاگت وصول ہوجائے گی اور دوسرے مکانات کی تعمیر میں صرف ہو سکے گی۔

ب۔ نظام الاوقات مدرسہ کی ترتیب

جس طرح جلد جلد تبادلوں کے باعث کسی ایک مقام سے مدرسین کو دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح نظام الاوقات مدرسہ کی بار بار تبدیلی کے سبب مدرسین کو کسی ایک مضمون میں مہارت پیدا کرنے کا موقع حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارے مدارس کے ایک معمولی مدرس کا نظام الاوقات دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ کتنے مختلف مضامین کی تعلیم اسکے ذمّہ کی جاتی ہے جن میں باہم کوئی ربط اور تعلق نہیں ہوتا۔ ایک ہی مدرس ایک جماعت میں ریاضی سکھاتا ہے تو دوسری میں السنہ، کہیں معلومات عامہ کا درس دیتا ہے تو کہیں سائنس کا۔ غرض نظام الاوقات کی ترتیب کے وقت مدارس کے پیش نظر صرف جماعتیں اور اُن کے مختلف مضامین ہوتے ہیں اور اس کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا کہ اس طرح تقسیم کار سے مدرسین کی پریشان خیالی میں کسقدر اضافہ ہوتا ہے اور وہ کس طرح وقتِ واحد میں ان مختلف علوم و فنون کی تیاری خاطر خواہ کر سکتے ہیں۔ اس کا حل چنداں مشکل نہیں، بشرطیکہ صدر مدرسین اس کی اہمیت کو محسوس کریں اور اس کے علاج کیطرف

پوری طرح متوجہ ہوں۔ مدارس وسطانیہ و فوقانیہ میں بالعموم مدرسین کی کافی تعداد ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی مضمون سے خاص واقفیت اور دلچسپی رکھتا ہے۔ کوشش اس کی کرنی چاہیے کہ ہر مدرس کو اس کی مرضی اور مشورہ سے کوئی ایسا مضمون دیا جائے جس سے وہ خاص دلچسپی رکھتا ہو اور اُسے مختلف جماعتوں میں اُسی مضمون کی تعلیم پر مامور کیا جائے۔ اِس طرح وہ ساری توجہ کسی ایک مضمون پر مرکوز کر سکے گا۔ اور جب وہ مضمون ایسا ہوگا، جس سے اُسے فطری لگاؤ اور دلچسپی بھی ہو تو یقیناً تھوڑے ہی عرصہ میں وہ اس مضمون میں بڑی مہارت پیدا کر لے گا۔

اِس کے علاوہ مختلف جماعتوں میں ایک ہی مضمون کی تعلیم دینے سے وہ مختلف جماعتوں کے طلبا کی حالت اور ان کے باہمی معیار سے بخوبی واقف ہو سکیگا اور اُن میں مناسب ارتباط قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح مدرسین کی وہ عدم دلچسپی جو مختلف مضامین کی وجہ سے ان میں پیدا ہو جاتی ہے مدفع ہو جائے گی اور ہر مدرسہ میں ہر مضمون کا ایک ماہر پیدا ہو جائے گا۔ جس سے مدرسہ کی کارکردگی پر نہایت خوشگوار اثر مترتب ہوگا۔

(۵) **کثرتِ کار** مدرسین کی عدم دلچسپی کا ایک بڑا سبب اُن کے کام کی کثرت اور اس کی تھکا دینے والی نوعیت ہے۔ دیگر پیشوں کے برخلاف تدریس میں علاوہ سخت دماغی محنت کے آدمی کو مسلسل کئی گھنٹے بولنا پڑتا ہے۔ جس سے اس کے اعضاء رئیسہ پر بہت بار پڑتا ہے اور اگر مناسب احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو اس میں قبل از وقت انحطاط و ضعف کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ پس نہایت ضروری ہے کہ اُسے اُس کی تلافی کے لئے جس قدر فرصت و سہولت ممکن ہو بہم پہنچائی جائے۔

مسٹر جارج برنارڈ شاہ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "Intelligent Women's guide to Socialism" میں بڑا اچھا اُصول یہ پیش کیا ہے کہ "جو پیشے زیادہ مشقت طلب اور جلد تھکا دینے والے ہوں اُن میں ملازمین کو زیادہ فرصت بھی یکجا کر

تاکہ وہ مختلف تفریحی مشاغل سے اپنی ضائع شدہ توانائی کی تلافی کرسکیں۔

پیشۂ مدرسی کے سخت محنت طلب ہونے سے کسی کو انکار نہیں۔ البتہ عام طور پر یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ مدرسین کو دیگر سررشتہ جات کی بہ نسبت تعطیلایں بہت زیادہ ملتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کے باہر دوسرے ممالک میں ایسا ہی ہو۔ لیکن ہمارے ملک میں تو واقعہ اِس کے برعکس ہے۔

یہاں پر مدرسین کو دیگر سررشتہ جات کے مقابلہ میں صرف ایک موسمی تعطیلات زیادہ ہیں یعنی گرما میں تقریبًا ایک مہینے کی اور سرما میں تقریبًا ایک ہفتہ کی۔ لیکن اس کی وجہ سے اپنی رخصت خاص بیافت سالم کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس طرح وہ دوسرے سررشتوں کے برابر ہوجاتے ہیں بلکہ دوسرے سررشتوں کے ملازمین کو تو یہ بڑی سہولت حاصل ہے کہ وہ اپنے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے جب چاہیں رخصت خاص سے استفادہ کریں۔ اس کے برخلاف مدرسین مجبور ہیں کہ موسمی تعطیلات سے استفادہ کریں خواہ اُس وقت اُنہیں اُس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اِس طرح وہ غریب اپنی دوسری ضروریات کے موقع پر رخصت خاص بیافت نصف لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کی تلافی کے لئے مختلف تدبیریں ہوسکتی ہیں۔ یا تو یہ کہ موسمی تعطیلات میں اضافہ کر دیا جائے یا مدرسین کو رخصت خاص بیافت سالم کا حق مثل دوسرے سررشتوں کے حاصل ہو۔ یہ سب صورتیں بلاشبہ محتاج توجہ ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے مقدم اور سب سے آسان اصلاح تو یہ ہوسکتی ہے کہ اوقات مدارس بجائے دن بھر کے صبح کے کردئے جائیں۔ کیونکہ پہلے سے لے کر آج تک تمام ماہرین تعلیم اس پر متفق رہے ہیں کہ درس و تدریس کے لئے صبح سے بہتر کوئی وقت نہیں ہوسکتا، جبکہ انسان بالکل تازہ دم اور ہشاش بشاش رہتا ہے۔ خصوصًا ہندوستان جیسے گرم ملک میں تو یہ اصول اور بھی زیادہ مفید اور قابل عمل ہے۔

یہاں سال میں کم وبیش نو دس مہینے گرمی رہتی ہے اور باقی دو تین مہینے کی سردی بھی کچھ ناقابل برداشت نہیں ہوتی۔ بالخصوص دکن کے علاقہ میں تو سردی بالکل برائے نام ہوتی ہے۔ اس طرح جاڑے، برسات اور گرمی تینوں موسموں کے لئے صبح کے اوقات نہایت

موزوں ثابت ہو سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے دوپہر کی گرمی میں کھانے کے بعد کسی قسم کی جسمانی یا دماغی محنت کی طرف طبیعت مطلق راغب نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہمارا روزمرّہ کا تجربہ بتاتا ہے کہ جن دنوں میں مدارس صباحی ہوتے ہیں۔ مدرس نہایت چاق وچوبند رہتے ہیں اور پورا کام کرنے کے بعد بھی کسی قسم کی تکان محسوس نہیں کرتے مگر جب دووقتہ مدارس ہوتے ہیں تو اِن بچاروں کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے اور مدارس سے واپسی کے بعد وہ کسی اور کام کے قابل نہیں رہتے۔ پس مدارس صباحی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ بغیر کسی قسم کا ہرج کار یا تعلیمی گھنٹوں میں تخفیف کئے ایک ہی نشست میں پورا تعلیمی کام ختم ہو جاتا ہے۔ اور دن کے باقی حصہ میں مدرسین اور طلبہ کچھ آرام لے کر دوسرے دن کے اسباق کی تیاری اور عام مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح رات کے وقت عموماً روشنی کے خراب انتظام میں مطالعہ کرنے کے بجائے وہ دن ہی کو اپنی نوشت وخواند کا کام بھی ختم کرلیں گے اور اس کے ساتھ ہی ان کے اوقات فرصت بھی بڑھ جائیں گے۔

صباحی مدارس کا ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ دیہات کی کثیر آبادی جو بحالت موجودہ اپنے بچوں کو دن بھر کے لئے کام کاج چھوڑا کر مدرسہ نہیں بھیج سکتی اور جس کی وجہ سے دیہات میں بچوں کی قابل لحاظ تعداد مدرسہ کی تعلیم سے محروم رہ جاتی ہے، وہ صبح کے مدارس کی صورت میں بآسانی اپنے بچّوں کو تعلیم دلا سکیگی۔ اس طرح دیہاتی طلبا کی تعداد میں کثیر اضافہ ہو جاے گا۔

۶۔ سرپرستوں کی بے توجہی مدرسین کی عدم دلچسپی کا ایک اور سبب یہ ہوتا ہے کہ والدین اور سرپرست اپنے بچوں کی تعلیمی ترقی اور جسمانی اور اخلاقی نشو ونما میں اساتذہ کا ہاتھ نہیں بٹاتے اور ایک دفعہ مدرسہ میں شریک کرا دینے کے بعد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی سب ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگئے۔ حالانکہ کئی وجوہ سے بچوں پر گھروں کے اثرات مدرسہ کے بہ نسبت زیادہ مستحکم ہوتے ہیں۔ خصوصًا ہندوستان میں جہاں مدارس اطفال Nursery Schools کا بالکل رواج نہیں، بچوں کی ابتدائی نشو ونما کا دار و مدار بالکلیہ گھروں پر ہوتا ہے اور

اپنی عمر کا ابتدائی زمانہ (جبکہ اُنکی فطرت میں اثر پذیری کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے) بچے اپنے گھروں میں گذارتے ہیں۔

ماہرین تعلیم کا اس پر اتفاق ہے کہ بچہ کی فطرت بنانے میں سب سے زیادہ حصّہ اس کے موروثی اور آبائی اثرات کا ہوتا ہے۔ اِس کے بعد اُس ماحول کا جو اُسے زندگی کے چند ابتدائی سالوں میں میسّر آئے اور جب یہ دونوں اثرات تقریبًا یکساں ہوں تو جو نقوش بچہ کے دل و دماغ پر مرتسم ہو جائیں گے وہ بہت گہرے ہوں گے اور اُن کا مٹانا یا بدلنا بہت مشکل ہوگا۔ اسی لئے مغربی ممالک میں مختلف ناموں سے بکثرت ایسے ادارے قائم ہیں، جہاں بچّہ کی ابتدائی زندگی کے چند سالوں میں ان کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی نشو ونما کے خاص انتظامات عمل میں لائے جاتے ہیں۔ اور اُن کے لئے ممکنہ سہولتیں بہم پُہنچائی جاتی ہیں۔(مثلاً عالیشان مکانات۔ دلکش باغات۔ بہترین آلات تعلیمی ماہر اور مستند مدرسین وغیرہ) لیکن ہندوستان میں (جو عام جہالت اور افلاس میں ضرب المثل ہے) ایسے اداروں کی ابتک کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اور بچے بالعموم اپنی زندگی کا یہ قیمتی زمانہ تنگ و تاریک مکانوں، متعفن گلی کوچوں، جاہل سرپرستوں اور نادان دوستوں کی صحبت میں گذار دیتے ہیں۔ اور اُس وقت مدرسہ میں آکر شریک ہوتے ہیں، جبکہ اُن کی عمریں بڑی اور عادتیں پختہ ہوجاتی ہیں۔ ان کی اثر پذیری کی صلاحیت مفقود ہوچکتی ہے اور اُن کا کیریکٹر بن چکتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ بیچارہ مدرس ان سوکھی لکڑیوں کو موڑے تو کیونکر موڑے۔ اس پر طُرّہ یہ کہ اکثر سرپرست اس مشکل کام میں مدرسین کے ساتھ اشتراک عمل کی زحمت بھی گوارا نہیں فرماتے اور چاہتے ہیں کہ مدرس ایک جادو کی چھڑی سے آنِ واحد میں بچّے کے تمام موروثی اور ماحولی نقائص دور کردے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر مدرسین اپنی سعی لاحاصل سے تنگ آکر بد دل ہوجاتے ہیں اور محض دفع الوقتی کرنے لگتے ہیں۔ اس افسوسناک صورت حال کی اصلاح بھی نہایت ضروری ہے اور اس کی سب سے پہلی تدبیر تو وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا یعنی جابجا مدارس اطفال کا قیام۔ دوسری تدبیر یہ ہے کہ صدر مدرس اور جملہ مدرسین ان غافل اور فرائض

ناشناس سرپرستوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور اُن کا تعاون حاصل کرنے کی وہ تمام کوششیں کریں جو حالات کے لحاظ سے ممکن ہوں ۔ مثلاً ہر بچہ کا سالانہ تعلیمی کارنامہ بنایا جائے ۔جس میں اس کی حاضری، تعلیمی اور اخلاقی حالت کھیلوں سے دلچسپی غرض جملہ ضروری امور کا اندراج کیا جائے اور اس پر ہر مہینے سرپرستوں کے دستخط لئے جائیں ۔ نیز ایک خانہ ایسا رکھا جائے جس میں سرپرست اپنے مشکلات اور انتظامات مدرسہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر سکے ۔

اس طرح مدرسہ اور سرپرستوں میں تعاون حاصل ہوگا اور دونوں ایک دوسرے کے حالات و مشکلات سے واقف ہوسکیں گے ۔ تیسری تدبیر یہ ہے کہ مدرسہ کے مختلف جلسوں اور تقریبوں میں سرپرستوں کو مدعو کیا جائے ۔ اور ایک طرف مدرسہ کے حالات سے ان کو باخبر رکھا جائے تو دوسری طرف اُن کے مشکلات سے مدرسہ بھی واقف ہوتا رہے ۔ اس کے علاوہ عہدِ حاضر کے ان تمام ذرائع سے بھی کام لیا جائے جو نشر و اشاعت کے لئے ایجاد ہوئے ہیں ۔ مثلاً تعلیمی اخبارات اور رسائل، لکچر، ریڈیو وغیرہ ۔ اس سلسلہ میں یہ تجویز بے محل نہ ہوگی کہ سررشتۂ تعلیمات، اسٹاف مدرسہ اور اولیاء اطفال کی متفقہ کوشش سے ہر مدرسہ کے لئے ایک ریڈیو سٹ ضرور فراہم کرئے ۔ جس کے ذریعہ مدرسہ اور سرپرستوں میں اتحادِ عمل بھی ہوتا رہے ۔ اور طلبا و اساتذہ کے عام معلومات میں اضافہ بھی ہوسکے ۔

۷ ۔ نصابِ تعلیم مدرسین کی آواز

اور ایک وجہ جو اکثر مدرسین کی عدم دلچسپی کا باعث ہوتی ہے وہ نصابِ تعلیم ہے جو اُن کی رائے میں حالات اور ضروریات کے مطابق نہیں ہوتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ مدرس کے عام معلومات خواہ کتنے ہی وسیع ہوں ۔ لیکن اُسے کسی نہ کسی نصاب کا ضرور پابند ہونا پڑتا ہے اور اگر یہ نصاب طلبہ کے حالات اور مختلف جماعتوں کی استعداد کے مطابق نہ ہو تو مدرسین کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے ۔

اِس مشکل کو رفع کرنا جس قدر ضروری ہے اُسی قدر آسان بھی ہے۔ اُسکی تدبیر یہ ہے کہ تدوینِ نصاب کے وقت ہر مضمون کے خاص تعلیم دینے والے اور وسیع تجربہ رکھنے والے مدرسین کی ایک مناسب تعداد کو کمیٹی میں شریک کیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے مخصوص حالات و مشکلات سے کمیٹی کو مطلع کرسکیں اور اپنے وسیع تجربوں سے فائدہ پہنچا سکیں۔

اس طرح جو نصاب مرتب ہوگا یقین ہے کہ وہ بڑی حد تک طلبہ کے لئے مفید اور ضروریات زمانہ کے مطابق ہو۔ اس کی تدریس مدرسین نہ صرف ایک فرض کی ادائی کے طور پر کریں گے۔ بلکہ اسمیں انہیں خاص مسرت حاصل ہوگی۔

اگر اِن چند تجویزوں کو جو اوپر عرض کی گئی ہیں عملی جامہ پہنایا جائے تو یقین ہے کہ مدرسین کی کارکردگی اور مدارس کی حالت میں حیرت انگیز اصلاح ہوجائے گی۔ اور تعلیم و تدریس کا مقصد بخوبی پورا ہوسکے گا۔

ضبطِ مدرسہ کے ذریعہ اخلاقی تربیّت

از

مولوی غلام حسن صاحب بی۔ ایس۔ سی ڈپٹیٹی ٹیچرس ٹریننگ اسکول اگجو

آج کل یہ عام شکایت ہے کہ ہمارے سماج کے افراد اپنے اپنے شعبوں میں فرائض کی بجاآوری میں قاصر نظر آتے ہیں۔ چاہے وہ ملازمت ہو یا کوئی پیشہ۔ اِن میں ایک مشترکہ خرابی پائی جاتی ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ان کے قول اور فعل میں بہت کم مطابقت ہوتی ہے۔ اور اُن میں اخلاقی صفات کی کمی ہے۔ جس کی بدولت وہ اپنے مفوضہ کام کو قابلیت اور سرگرمی سے پورا نہیں کرسکتے۔ ان میں قوّتِ عمل، جوش، ولولہ اور اُمنگ نہیں پائی جاتی اور معاشرہ کے اصولوں پر چلنے میں وہ ہچکچاتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی تمامتر ذمہ داری مدارس کی تربیت پر ہے۔ یوں تو بچہ کی شخصیت کی تعمیر میں معاشرہ کے بہت سے تمدنی ادارے حصّہ لیتے ہیں۔ مثلاً گھر، مدرسہ، محلّے، بازار، حکومت اور معاشرتی طبقے۔ مگر بچہ کی ذات پر گھر اور مدرسہ کا اثر سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بچہ کا پہلا تعلیمی ادارہ ماں کی گود ہے۔ مگر ہم جب ماؤں کی اس قدرتی ذمہ داری پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اکثر مایوس ہونا پڑتا ہے۔ گھروں میں جو قانون اور اخلاق کارفرما ہیں اس کا اثر نامعلوم طریقہ پر بچہ کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ بُرے اور اچھے اثرات بچوں کے مزاج میں داخل ہوجاتے ہیں۔ گھر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونا چاہئے کہ وہاں بھی ایسا تعلیمی ماحول بچوں کے لئے مہیا کیا جائے کہ بچے گھر اور مدرسہ میں بہت کم فرق کرسکیں اور نامعلوم طریقہ پر بہت سی کارآمد باتوں کی عادت اپنے میں ڈال لیں۔ گھر کے خدمتگار اور عزیز و اقارب بچہ کے

٭ یہ مضمون انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی چوتھی سالانہ کانفرنس میں بمقام ورنگل پڑھا گیا۔

ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور وہ خود بھی اپنے عمل سے اخلاقی اثرات پیدا کرتے رہیں تاکہ بچہ اپنی تقلید کے ذریعہ ان باتوں کو دُہراتا رہے۔ مگر بچہ کو ایسے نمونوں سے واسطہ پڑتا ہے جن کی اخلاقی حالت بہت ہی پست ہوتی ہے۔ والدین بچوں کی تربیت کی ذمہ داری کو ہرگز محسوس نہیں کرتے اور اپنی غلط محبت کے باعث بچہ میں بُری عادتوں کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ مفلس اور جاہل والدین ہر لحاظ سے قابلِ معافی ہیں۔ ہم کو بڑی شکایت پڑھے لکھے اور بعض اچھے گھرانوں سے ہے۔ وہ اپنے پالتو جانوروں پر زیادہ وقت صرف کرتے اور اپنی دولت کا بڑا حصہ صرف کر دیتے ہیں۔ میں آپ کے سامنے ایسی بیشمار مثالیں پیش کر سکتا ہوں اور ایسی بہت سی مثالیں خود آپ کے تجربہ میں آچکی ہیں کہ بچے سنِ شعور کو پہنچنے سے قبل اپنے والدین سے بغاوت کر جاتے ہیں۔ اور اپنے گھر کا اثاثہ اور سرمایہ بہت جلد ختم کر دیتے ہیں۔ جب یہ حالت ہمارے گھروں کی اور والدین کی ہو تو ہم بچوں کی بھلائی کی کس طرح توقع کر سکتے ہیں۔ ہمارے مدرسوں کی حالت بھی کچھ اس سے کم نہیں ہے۔

یہ شکایت آئے دن بڑھتی جارہی ہے کہ شاگرد اور استاد کے تعلقات خراب سے خراب تر ہو رہے ہیں۔ اور ایک قسم کے بازاری اور تجارتی تعلقات کا یہ اثر ہے کہ طلبار اخلاقی قدروں سے ناآشنا ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بچہ کی شخصیت کے پیدا کرنے میں اساتذہ اور مدرسہ کا ماحول کس حد تک اُن کی امداد کر رہا ہے۔ بہت سے والدین کو یہ خیال ہے کہ بچہ مدرسہ میں بری عادتیں سیکھتا ہے اور اس کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں بدتمیزی، جھوٹ، خود غرضی، تساہل اور پست ہمتی جیسی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہت سے طلبہ پڑھنے لکھنے کے بعد اپنے والدین کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اپنے آبائی پیشوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ اکثر مقامی صنعتیں دم توڑ رہی ہیں اُس کی تمام تر ذمہ داری مدرس اور مدرسہ کے نظم و نسق پر عائد ہوتی ہے۔ اور ضبط و تادیب کا جو نظریہ کارفرما ہے وہ قابل توجہ ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مدرسین خود بہت سی اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ اس کی تصویر آپ کو یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ کی کی تقریر ''علما رکی صحبت'' میں نظر آتی ہے۔ ایک دو جملہ صاحبِ موصوف کی تقریر سے

آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں "جب کسی قوم میں انحطاط آتا ہے تو اس کا معیار علم بھی بہت کم ہو جاتا ہے۔ معلموں کی زندگی اور عام پیشہ وروں کی زندگی میں مطلق فرق نہیں ہوتا۔ ذاتی مفاد تحصیل و تدریس کا نصب العین بن جاتا ہے اور علمی تلاش کا حقیقی ذوق مفقود ہو جاتا ہے۔ ہمارے بدنصیب ملک کی آج کل یہی حالت ہے"!

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا کارِ طفلاں تمام خواہد شد

اخلاق کی وضاحت

مدرسہ کے ڈسپلین کے ذریعہ بچہ میں کس طرح اخلاق کی تربیت کیجا سکتی ہے، یہ بتانے سے پہلے میں یہ ضروری خیال کرتا ہوں کہ اخلاق کا صحیح مفہوم آپ کے سامنے پیش کردوں۔ اخلاق کا مفہوم اور یہ معیار نہیں ہے کہ کوئی شخص اِتنا جان لے کہ آداب نشست و برخاست کیا ہیں۔ طریقۂ طعام و کلام کیا ہے؟ عام طور پر لوگ یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا اخلاق اچھا ہے تو اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی بات چیت اور برتاؤ میں شائستگی پائی جاتی ہے اور وہ آدابِ محفل سے واقف ہے۔ لیکن اخلاق کو اس محدود معنی میں استعمال کرنا اور اسی پر قناعت کرنا ایسا ہے کہ ہم بڑے تالاب میں غوطہ لگانے کے بجائے کسی ایک گڑھیا میں تیرنے کی کوشش کریں یہ درست ہے کہ ایک با اخلاق شخص میں اِن صفات کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ مگر یہ صفات تہذیب نفس کا نتیجہ نہیں ہیں تو پھر نمود و نمائش ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ایک بدکردار شخص لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے اس قسم کے مصنوعی اخلاق سے کام لے۔ ہمیں ایسی شخصیتیں ملتی ہیں جو سطحی اخلاق میں ماہر ہونے کے علاوہ حد درجہ ذلیل ہوتی ہیں۔ اس مختصر بحث سے ہمیں اخلاقی تربیت کا ایک بنیادی اصول ہاتھ آتا ہے وہ یہ کہ اخلاقی تعلیم وسیع اور جامع ہو اور طلبہ کی پوری زندگی پر حاوی ہو سکے۔ اور اس کی بنیاد ان کے ماحول اور ان کی فطری خواہشات پر رکھی جائے۔ میرا منشا اس سے یہ ہے کہ اخلاقی تعلیم زیادہ تر عملی ہو۔ یعنی ان کی زندگی کے گوناگوں تجربات اور مشاغل کو پیش نظر رکھ کر ایک خاص تنظیم اور ترتیب قائم کیجائے اور اصول اخلاق کی تشریح بچوں کی زندگی سے مہیا کیجائے۔ فلسفہ اخلاق کا ایک نظریہ ہے کہ سماجی زندگی اس وقت تک مکمل

نہیں ہوسکتی اور نہ افراد کو آزادانہ زندگی بسر کرنے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ جب تک کہ لوگ چند باتوں کے عادی نہ ہو جائیں۔ مثلاً ایک دوسرے کا لحاظ کریں، رواداری برتیں، اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور دوسروں کے معاملات میں دخل درمعقولات نہ کریں۔ مگر یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان کو زبانی سمجھا دینا کافی سمجھ لیا جائے۔ اسلئے مدرسہ میں ایک ایسا معاشرتی ماحول پیدا کرنا چاہیئے کہ بچے خود اپنے تجربوں سے زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھ لیں، اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر سکیں، حقوق اور فرائض کے فرق کو پہچانیں اور باہمی اشتراک عمل کے فوائد کو پوری طرح سمجھیں۔ یہ باتیں بچوں کو کمرۂ جماعت میں دارالاقامہ کی زندگی میں، کھیل کے میدانوں میں۔ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اشتراک عمل میں معلوم ہوں گی۔ کیونکہ ان کے ساتھی قدم قدم پر یہ سبق براہِ راست اچھی طرح ذہن نشین کرا دیتے ہیں۔ چنانچہ کوئی طالب علم مدرسہ کے بن لکھے قوانین اور روایات کی خلاف ورزی کرتا ہے تو طلباء خود مجرم کو سزا دے لیتے ہیں۔ اور اُسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ مدرسہ کی روایت کی پیروی کرے اور یہ سزا اُسے ایسی ناگوار نہیں معلوم ہوتی جیسی کہ استاد کی سزا۔ جن لوگوں کو علیگڈھ یونیورسٹی یا اس کے مدرسہ میں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو وہ اس خیال کی تائید کرینگے کہ ٹھنڈی اور گرم فاختہ کے کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

اخلاقی تعلیم کا منشاء یہ ہے کہ بچوں کے کاروبار اور مشاغل کو اعلیٰ مقصد سے مربوط کر دے تاکہ اُس کے حصول میں وہ اپنی شخصیت بالکلیہ محو کر دیں۔ اس سے میرا منشاء یہ ہے کہ بچہ اپنی توجہ ذاتی اغراض اور مفاد سے ہٹ کر ایک مستقل اور بلند تر اجتماعی ضرورت کی جانب پھیر دے۔ وہ کسی کام کو اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو اُس کام میں لذت حاصل ہوتی ہے اور کسی کام سے اس لئے گریز نہ کرے کہ اس میں محنتِ شاقہ اٹھانی پڑتی ہے۔ بلکہ وہ اپنی ذات کو اعلیٰ نصب العین سے اس طرح وابستہ کر دے کہ کام کی تکمیل میں دشواریوں کا احساس نہ ہو۔ اور مقصد کے حصول میں جسمانی آسائش کی پرواتک نہ ہو۔ نیز جسمانی صحت کو اس حد تک برقرار رکھے کہ مقصدِ حیات کے حاصل کرنے میں رکاوٹ نہ ہو اور خورد و نوش کا انتظام اس حد تک ضروری سمجھے کہ کہیں آسائش اور فرض میں ٹکر نہ ہو جائے۔ اب ایک

اور چیز کی طرف میں آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں وہ انسان کی تقلیدی قوت ہے۔ رضا جوئی اور تقلید کی خواہش زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی بات چیت، وضع قطع، ادب و آداب اور معاشرتی معاملات کا معیار یہی ہوتا ہے کہ کوئی بات چیت ایسی نہ کریں، جو دوسروں کی نظر میں کھٹکے۔ اس قسم کے لوگ سراسر رسم پرست اور تقلید پرست ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی اخلاقی تربیت کو ہم مکمل نہیں کہہ سکتے جس کا مرکز ثقل دوسروں کی رائے اور اُن کی خوشنودی پر ہو۔ جس میں انسان کے اپنے ضمیر کا کوئی دخل نہ ہو۔ بلکہ ہر معاملہ میں معاشرتی روایات اور تعصبات کی پیروی کیجاتی ہو۔ مکمل اخلاق کا مقتضا یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے نورِ باطن اور ضمیر کی آواز پر چلے۔ مثلاً کوئی عہدہ دار رشوت لینے سے اسلیئے ڈرتا ہے کہ نوکری سے علحدہ کردیا جائے گا یا ہم چشموں میں اسکا احترام باقی نہیں رہیگا۔ تو یہ دیانت داری ایک قسم کی ریا کاری ہے۔ اگر اس کی دیانت داری عزّتِ نفس اور ضمیر کے مطمئن کرنیکی خاطر ہے تو قابل ستائش ہے۔ اخلاقی ترتیب کو محض سماج کی تقلید تک محدود کردینے میں بڑا قومی نقصان یہ ہے کہ نظام اخلاق میں ارتقا کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور مروجہ تعلیم حالات کو قائم رکھنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اگر ابتدا سے یہی خیال کارفرما ہوتا تو آج تک شاید انسان اُس وحشیانہ دَور میں ہوتا۔ معاشرہ کی اصلاح اسی میں ہے کہ کوئی انقلاب آفرین شخصیت پیدا کیجائے، جو دلیری سے کام لے کر موجوہ نظام کو تہ و بالا کردے اور لوگوں کو صحیح معیار زندگی تک پہنچا دے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلعم نے رومیوں اور جاہل عرب قوم کا مقابلہ کیا اور ایک قعر مذلّت میں گری قوم کو منظم اور با اخلاق بنا دیا۔ ان مثالوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اِس سے کم درجہ پر بھی فرض ہر معلّم پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے طلبا میں ایسی قابلیت پیدا کردے کہ وقتِ ضرورت سماج کی جکڑ بندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرسکیں رائے عامہ کے خلاف ایسا کام کرجائیں، جن میں ان کا ضمیر مطمئن ہو۔ یہی اخلاقی جراءت انسانی سیرت کا بڑا زیور ہے۔

ضبط و تادیب کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اخلاق کے حدود کس قدر وسیع ہیں اور اب سوال یہ پیدا ہے کہ اس کے

حاصل کرنے کے کیا ذرائع موجود ہیں اور اُن سے کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات ایک دفعہ پھر دُہرائی جاتی ہے کہ اخلاقی تربیت زبانی یا کتابی طریقہ پر نہیں دی جا سکتی۔ پیراکی کے اصول اور قواعد کو جان لینے کا مفہوم یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمیں پیرنا آگیا۔ جبتک اُس پر عمل نہ کیا جائے اور جب تک علم، عمل کی کسوٹی پر نہ کسا جائے اور قوت سے فعل میں نہ آئے تب تک وہ بے معنی چیز ہے۔ دراصل اخلاق نام ہے چند مخصوص عملیات کا جن کی مشق کرانا ضروری ہے۔ اخلاقی صفات بچہ کی زندگی کا جزو اسی وقت ہو سکتی ہیں جب اس کو روزمرہ زندگی میں مشق کرائی جائے۔ اب سوال یہ ہے پیدا ہوتا ہے کہ مدرسہ کے ماحول کی تشکیل کس طرح پر کیجائے۔ اس کی بڑی شرط یہ ہے کہ مدرسہ کی دنیا میں اور بیرونِ دنیا میں ایک گہرا رابطہ پیدا کر دیا جائے اور بچہ کو مدرسہ ایک چھوٹی دنیا معلوم ہونے لگے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ مدرسہ میں ایسا قدرتی ماحول پیدا کیا جائے کہ بچوں کو یہاں کے مشاغل میں وہی دلچسپیاں نظر آئیں جو مدرسہ کے باہر کی دنیا میں نظر آتی ہیں۔ کیونکہ مدرسہ نام ہے ایک ایسے ادارہ کا جس کو سماج نے اپنی حیات اجتماعی کی بقا کے لئے قائم کیا ہے۔ وہ اِن روایات کو بچوں تک پہنچانا چاہتا ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتے ہیں۔ اگر اس کے خلاف ان کی نشو و نما مصنوعی ماحول میں ہوگی اور حقیقی زندگی کے مشاغل وہاں مفقود ہوں گے تو ہم کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ مدرسہ کی تربیت باہر بھی کام آسکے گی۔

پس اس مقصد کو حاصل کرنے لئے مدرسہ کا ضبط اور تادیب کس طرح کا ہونا چاہیئے، اب ہم غور کرینگے۔ طلبہ کی شخصیت کو پیدا کرنے میں مدرسے کے قواعد اور قوانین کو بہت بڑا دخل ہے۔ طریقۂ تعلیم کی خوبی یہ ہونا چاہیئے کہ طلبہ میں اعتماد ذات اور امداد باہمی کی عادت پیدا ہوا۔ اگر اس اصول پر کام کیا جائے تو درس و تدریس کے ضمن میں ان صفات کی نشو و نما خود بخود ہو جائے گی۔ کیونکہ بچے ایک مشترک مقصد کے تحت ساتھ لکھتے پڑھتے، اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے اور کھیلتے کودتے ہیں تو اُن میں علاوہ تعلقات علمی کے بہت سے معاشرتی تعلقات بھی قائم ہو جائیں گے۔ اِن کے حاصل کرنے کے لئے وہ ایک دوسرے کی امداد کے طالب ہوتے ہیں، انجمنیں اور کلب بناتے ہیں، انفرادی آزادی اور اجتماعی نظام

کو قائم رکھنے کے لئے قوانین اور قواعد بناتے ہیں تاکہ ہر فرد اور ہر گروہ دخل درمعقولات کے بغیر اپنا کام تکمیل کرسکے ۔اس طرح پر ایک خاص فضا (Atmosphere) پیدا ہوجاتی ہے ۔لیکن اس کی اہمیت پر پورا زور نہیں دیا جارہا ہے ۔ جدید نظریہ تعلیم نے اس کو مدرسہ کی زندگی کا لازمی جُز قرار دیا ہے اور مدرسین کو اس بات کی تاکید کی ہے کہ وہ اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں ۔عام طور پر مدرسین درسی تعلیم کے علاوہ ہر چیز کو مقصد کے خلاف خیال کرتے ہیں ۔مگر باوجود اس کے طلبا فطرت کے مقتضا سے مجبور ہوکر معاشری زندگی کی بنیاد ڈال لیتے ہیں اور کھیلوں میں بالخصوص اس کا اظہار ہوتا ہے ۔نہایت افسوس کی بات ہے کہ طلبار کی ان قدروں سے بہت سے مدرسین ناآشنا ہیں ۔یورپ کے بعض ملکوں میں انگلستان سوئزرلینڈ ۔جرمنی اور امریکہ کے مدرسوں میں طلبار کی اجتماعی زندگی کا باقاعدہ مطالعہ کیا گیا ہے ۔جنکے تجربوں سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ طلبار کے آپس کے تعلقات کا ان کی سیرت پر گہرا اثر پڑتا ہے ۔اگر ان کی مناسب اصولوں پر تنظیم کی جائے تو معلم نامعلوم طریقہ پر طلبہ کی سیرت کو بہترین سانچوں میں ڈھال سکتے ہیں ۔

ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ انفرادی آزادی اور ذمہ دارانہ خیال مدرسہ کے ماحول میں بڑا دخل رکھتا ہے ۔لیکن حقیقی فائدہ اس وقت حاصل ہوتا ہے ۔جبکہ معاشری زندگی کی تنظیم خود طلبار کے ہاتوں میں ہو ۔اور اس کی حکومت ضبط اور نظم کی بنیاد ان کے سماجی احساس پر رکھی جائے ۔اس خیال کی تشریح اس طرح کیجاسکتی ہے کہ حکومت خود اختیاری قائم کیجائے اور اس چھوٹی سی ریاست کے انتظام اور معاملات و اختلافات کے شیرازہ کو منظم کرنیکا کام انکے سپرد کردیا جائے جب تک انہیں معاشری معاملات میں آزادی عمل حاصل نہ ہوگی وہ باہمی مشورہ اور اتفاق رائے سے مسائل کو حل کرنا نہیں سیکھیں گے اور نہ اُن میں اعتماد ذات پیدا ہوگا ۔خصوصًا موجودہ جمہوری نظام میں ایسے افراد کی مانگ بہت زیادہ ہے ۔جن مدارس میں حکومت خود اختیاری کا تجربہ کیا گیا ہے اور دارالمطالعہ، کھیل کے میدان، دارالاقامہ میں طلبار کو آزادی اور ذمہ داریاں دی گئی ہیں بالعموم انکے نتائج بہت عمدہ حاصل ہوئے ہیں ۔طلبار قوانین بناتے ہیں ۔ان پر بحث و مباحثہ کرتے ہیں اور انکی پابندی کرتے ہیں ۔خلاف ورزی کی سزا مقرر کرتے ہیں ۔اسی طرح پر طلبار میں اخلاقی محاسن ۔اعتمادات ۔رواداری اور اشتراک عمل کی

صلاحیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔ اِن مدرسوں کے اُستادوں کو اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ ہروقت جاسوس بنے رہیں اور اپنے شاگردوں کی شرارتوں کی ٹوہ میں رہیں اور عیب جوئی کا ناگوار فرض ادا کرتے رہیں۔ وہاں ضبط و تادیب کے فرائض طلبا ء انجام دے لیتے ہیں جو کوئی اپنے فرائض کی تکمیل میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ خود اس سے باز پرس کر لیتے ہیں۔ اور اس کے لئے سزا تجویز کرتے ہیں۔ حکومت خود اختیاری کے جو فوائد بیان کئے ہیں ان میں اختصار سے کام لے کر صرف اصولوں کو پیش کیا گیا ہے اور عملی مشکلات سے بحث نہیں ہے جو اس کے دوران میں پیدا ہوتے ہیں اور بعض اوقات تجربہ کو کامیاب ہونے نہیں دیتے۔ اس نظریہ کی صحت اور مقبولیت میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ گو اسے عمل میں لانے کے لئے احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ اکثر مدرسین اس کو استعمال کرنے میں اس لئے پس وپیش کرتے ہیں کہ مذہب کی تعلیم کی وجہ سے یہ خیال ذہن نشین ہو گیا ہے کہ انسان بالطبع شر کی طرف مائل ہے۔ اور نفس کو مارنے کے بعد وہ خیر کی طرف قدم بڑھا سکتا ہے۔ انسان کے نفس میں قوّتِ ارادی اور خواہشات کے درمیان جنگ رہتی ہے۔ گویا انسان کا دل ایک "رزم گاہ خیر وشر" بنا ہوا ہے۔ شر بمعنی جبلت اور خیر بمعنی قوت ارادی یا ضمیر۔ اس خیال کے تحت بچہ بھی قدرتًا شر کی طرف راغب رہتا ہے۔ اور اس کی اصلاح کا طریقہ سوائے رکاوٹوں اور بندشوں اور سزا کے نہیں ہے۔ اور بچّوں کی نجات اسی میں ہے کہ بچوں وچرا تمام قواعد اور احکام کی پابندی کرتے رہیں چاہے وہ اُن کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں۔ چنانچہ (Jhon Lock) جان لاک اسی نظریہ پر عمل کرتا رہا۔

مگر صدیوں کے تجربہ نے بتلادیا کہ ضبط وتادیب کی بناء خارجی اثرات خوف اور بیرونی بندشوں پر رکھی جانے سے مُضر نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ طلباء میں جوش عمل اور جذبات غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسے فارغ التحصیل طلباء جان ڈیوی کے نزدیک چلتی پھرتی مورتیں ہیں۔ ڈیوی اس بات پر زور دیتا ہے کہ مدرسہ میں بچہ کو زندہ رکھنے کی کوشش کیجائے۔ اُس کا منشاء یہ ہے کہ بچہ کی انفرادیت کو تسلیم کیا جائے اور اُسکے جذبات کا احترام کیا جائے۔ غرض کہ اخلاقی تربیت کا دارومدار مدرسہ کی زندگی پر موقوف ہے۔ نصاب تعلیم

کتنا، اچھا کیوں نہ ہو جب تک مدرسہ میں عمل اور آزادانہ کام کے مواقع حاصل نہ ہونگے۔ مفید نہیں پڑسکتا۔ مدرسہ کے ضبط کا تعلق معلم کی شخصیت سے بہت زیادہ ہے۔ مدرسہ میں ضبط کے قائم رکھنے کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ اُسے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ نفسیات یہ بات بتلاتی ہے کہ نوجوانوں کو تحکم اور دباؤ بہت ناگوار ہوتا ہے۔ وہ فوراً اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ اس عمر میں شخصیت کے قدرتی اثر کو بہت جلد اور خوشی سے قبول کرتے ہیں بشرطیکہ اُنہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ کوئی شخص ان پر فوقیت رکھتا ہے اور اسے اِن کے ساتھ محبت اور ہمدردی ہے۔ ایسی صورت میں وہ عقیدت اور وفاداری کے ساتھ اس کی پیروی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے استادوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے ذاتی نمونے اور مثال کے ذریعہ آداب مجلس، تہذیب، شائستگی اور عمدہ اخلاقی خوبیوں کی تعلیم دیں۔ مدرس کے نزدیک نصاب کی تحریر کردہ عبارت کو اہمیت حاصل نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اہمیت نصاب کے اصل مقصد کی ہے۔ بچے چین کے بادشاہوں کی کہانیاں جانیں یا نہ جانیں اگر انہوں نے اخلاقی تربیت کا نصاب پورا کیا ہے تو وہ ہر لحاظ سے قابلِ مبارکباد ہیں۔ جس قوم اور جس ملک میں اخلاقی تربیت پر زور دیا جاتا ہے، ترقی کی راہیں اُن کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

باری وار طریقۂ تعلیم[1]

از

مولوی عبداللہ بن علی صاحب صدر مدرسہ پٹنچرو

مدرسہ تحتانیہ پٹنچرو کے چند اساتذہ پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل اس غرض سے عمل میں لائی گئی تھی کہ باری وار تعلیم کے موضوع پر غور و خوض کرکے ایک رپورٹ پیش کرے۔ یہ امر میرے لئے باعثِ مسرت ہے کہ میں بحیثیت صدر کمیٹی باری وار طریقۂ تعلیم پر رپورٹ پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں۔

ہندوستان میں یہ ایک جدید تجربہ ہے جو ہمارے موجودہ ناظم صاحب تعلیمات کے تعلیمی شغف اور دیرینہ تجربہ کا نتیجہ ہے جو سنہ ۱۳۴۷ف سے رائج کیا گیا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اولاً اس طریقۂ تعلیم کی ترویج کے اسباب کو واضح کیا جائے۔

عالیجناب مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری خدمتِ نظامت کا جائزہ حاصل فرمانے کے بعد سے تعلیم کو موثر بنانے اور کم سے کم مدت میں ملک کی جہالت کو دور کرنے کی سخت جد و جہد فرما رہے ہیں۔ دیہات کے مدارسِ تحتانیہ کی عمارتیں تنگ مع فرنیچر ناکافی۔ مدارس میں مدرسین کی تعدادِ طلباء اور جماعتوں کی تعداد کی مناسبت سے کم تھی۔ ایک ایک مدرس کو دو دو تین تین جماعتوں کو بوقتِ واحد تعلیم دینا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے تعلیم ناقص رہتی تھی اور طلباء کی عمر و وقت ضائع ہو رہا تھا۔ سررشتہ کے مالیہ کے لحاظ کرتے یہ ناممکن تھا کہ مدارس کی تعداد میں بھی اضافہ کیا جاتا اور مدارس کو جماعتوں کے لحاظ سے پورا اسٹاف بھی دیا جاتا، اس طرح کہ فی جماعت ایک مدرس مامور ہو۔ ان مشکلات کو رفع کرنے کے لئے مناسب سمجھا گیا کہ ملک سرکار عالی کے مواضعات کے مدارس میں یہ جدید طریقۂ تعلیم رائج کیا جائے۔ اولاً اس طریقہ کا نام "شفٹ سسٹم" رکھا گیا۔ اس کے

---

[1] یہ رپورٹ انجمن اساتذہ ضلع میدک کی سالانہ کانفرنس سنہ ف میں پڑھی گئی۔

کئی ترجمہ کئے گئے ۔ مگر اِن سب میں باری وار طریقۂ تعلیم زیادہ موزوں و پسندیدہ ثابت ہوا ۔ چنانچہ آج یہ اسی نام سے زبان زد خاص و عام ہے ۔

باری وار طریقۂ تعلیم کی ترویج کا مقصد یہ ہے کہ ایک ہی ساعت تعلیمی میں ایک مدرس کے ذمہ دو دو تین تین جماعتوں کی تعلیم نہ رہے بلکہ بوقتِ واحد ایک مدرس صرف ایک ہی جماعت کو تعلیم دے اس مقصد کے حصول کے لئے مدرسہ کے اوقات کو صبح اور دوپہر میں تقسیم کر کے اس طرح کا انتظام کیا جاتا ہے کہ جو جماعتیں صبح تعلیم پاتی ہیں وہ دوپہر کے اوقات میں تعلیم نہیں پاتیں بلکہ جدید جماعتیں دوپہر میں آتی ہیں ۔ ہر دو اوقات میں ہر ایک جماعت کے مکمل مضامین کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے ۔ گویا بوقتِ واحد دو یا زاید جماعتوں کو چھ گھنٹے مشترکہ طور پر تعلیم دینے کے بجائے ایک ہی جماعت کو پورے اِنہماک کے ساتھ تین گھنٹے تعلیم دیجاتی ہے جس کی وجہ سے ایک ہی وقت میں کئی کئی جماعتوں کو ملا کر تعلیم دینے سے جو اِنتشار پیدا ہوتا تھا اس کا انسداد ہوگیا اور اُس کے علاوہ مدرس کی توجہ مختلف جماعتوں پر بٹ جانے سے کسی ایک جماعت کی بھی خاطر خواہ تعلیم نہ ہوتی تھی ، اس سے نجات مل گئی ۔

ممالکِ محروسہ میں "باری وار طریقۂ تعلیم" کی ترویج کے ساتھ ہی تقریبًا تمام دیہات میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا ۔ مدرسین پر آوازے کسے جانے لگے ۔ اخبارات میں اس طریقۂ تعلیم کی مخالفت میں مضامین آئے چونکہ تین گھنٹے کی تعلیم کے بعد طلبار کسی مناسب کام میں مصروف نہ ہونے کی وجہ اپنے سرپرستوں کے لئے باعثِ تکلیف ہونے لگے تھے جس کی وجہ سے اولیائے طلبار نے یہ خیال کر لیا کہ مدرسین اپنے فرائض کو بخوبی انجام نہیں دیرہے ہیں ۔ حالانکہ سررشتہ نے اس طریقہ تعلیم کو جاری کرتے وقت ہی احکام دید ئے تھے کہ "اگر طلبار کے سرپرست اس پر اصرار کریں کہ اُن کے لڑکے دوسرے جلسے میں بھی حاضر مدرسہ رکھے جائیں تو اُنہیں اس کی اجازت دیجاسکتی ہے ۔ مدرس صاحب متعلقہ ایسے طلبار کو اپنے زیر نگرانی تعلیمی مشاغل میں مصروف رکھیں وغیرہ" جب ہم نے کام شروع کیا تو اُن ہی ہدایات پر عمل کیا ۔ چنانچہ آج تک کئی لڑکے ہر دو جلسوں میں حاضر مدرسہ رہتے اور

اِنہیں تعلیمی مشاغل میں مصروف رکھا جاتا ہے۔ پھر بھی عوام کے خیالات میں جیسا کہ چاہیئے تبدیلی نہیں ہوئی بہت ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ یہ کیفیت باقی نہ رہے۔

(۲) اِس طریقۂ تعلیم کی ترویج سے تعداد طلبار کے کم ہونے کا امکان تھا۔ چنانچہ اطلاعات سے واضح ہے کہ بعض مدارس میں اس طریقۂ تعلیم کو رائج کرنے کے بعد اُن مواضعات میں خانگی مدرسہ کے قیام کے اندیشہ سے یہ طریقۂ تعلیم مسدود کر دیا گیا۔ مگر عہدہ داران سررشتہ کی ہدایات و رہنمائی سے اکثر مقامات کی رعایا اس کے فوائد سے واقف ہوگئی۔ اب بھی بعض مقامات پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ لڑکے جنکو اپنے سرپرستوں کے کام میں مدد دینے کی ضرورت نہیں ہوتی (جن میں اکثر ملازم پیشہ حضرات کے لڑکے داخل ہیں) تین گھنٹے کی تعلیم کے بعد بیکار ہو جاتے ہیں۔ اُن کو صبح سے شام تک مصروف رکھنے کے خیال سے اُن کے سرپرست مدرسہ کے باہر خانگی طور پر تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔ اس طرح چند لڑکے ایک جگہ جمع ہوکر ایک خانگی مدرسہ کی ابتدا کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ایسے طلبار سرکاری مدرسہ آنا بھی ترک کر دیتے ہیں۔ آخرکار یہی چیز مدرسہ کی بربادی کا باعث ہوتی ہے۔

اِس کے سدِ باب کے لئے ہم یہ کرسکتے ہیں کہ ایسے طلبار کو دو وقت مدرسہ کی حاضری کا پابند بنایا جائے اور دارالمطالعہ دستی مشاغل۔ باغبانی یا اسباق گذشتہ کے اعادہ یا ہوم ورک یا کھیلوں میں مصروف رکھا جائے۔ بعض مدارس میں ایک تو طلبار کی نگرانی اور دوسرے جگہ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تقریبًا مدرسہ کے نصف طلبار کی نگرانی کون کرے۔ اور اُنہیں کہاں بٹھایا جائے۔ نگرانی کے لئے مانیٹرا اور بعض ادنیٰ جماعتوں کیلئے خوامدہ چپراسی بھی مفید ہو سکتے ہیں۔ لیکن جگہ کا سوال ٹیڑھا ہے۔ ایسی صورت میں کچھ تو اندرونِ مدرسہ اور کچھ بیرونِ مدرسہ انتظام کرنا ضروری ہوگا۔

(۳) دیہات میں ایسے خیال کے افراد کی کمی نہیں ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ تعلیم صبح سے شام تک ہوتی رہے۔ دیہات کے خانگی مدارس میں بچے صبح کے چھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک رہتے ہیں۔ عام طور پر اِن مدارس کے مدرسین کو مخصوص طلبہ کو چھوڑ کر یہ اختیار حاصل رہے کہ عام طور پر طلبار کو سخت سے سخت سزا دیں۔ مثلاً بچے کو مدرسہ

میں پکڑ جکڑ کر لانا، جماعت میں گھٹنوں کھڑا کرنا، پاؤں کے انگوٹھے پکڑ کر کھڑا کرنا، گردن پر کنکریاں رکھ کر کاپی لکھوانا، چھڑی رول سلیٹ جو کچھ آئے پھینک مارنا وغیرہ۔ یہ ہیں وہ چند سزائیں جو قیدی شاگردوں کو بھگتنی پڑتی ہیں۔ تعلیم کا حال بھی سن لیجئے جو کچھ پڑھایا جائے اُس کو سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بچے جو مجہول حالت میں رہتے ہیں اُن کی مجال نہیں کہ اپنے سبق کو سمجھنے کے لئے مدرس سے کسی قسم کا سوال کریں۔ کیونکہ تعلیم کا طریقہ ہی ایسا ہے کہ بچے میں سوال کرنے کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوتی اور جو فطری میلان تجسس ہوتا ہے، اُس کا خاتمہ ممکنہ عجلت کے ساتھ کر دیا جاتا ہے۔ مدرس سے سوال کرنا ایک بے ادبی خیال کیجاتی ہے۔ بس سبق کو رٹا دینا کافی ہے۔ طریقۂ تعلیم یہ ہے کہ مدرس ایک دفعہ آواز سے سبق پڑھتا ہے اور بچے اجتماعی طور سے اس کی نقل کرتے ہیں۔ اس میں چھوٹے بڑے نئے پُرانے طالب علموں کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ بچوں کے اس اجتماعی طور پر پڑھنے کی آواز تقریباً گاؤں کے ہر گھر تک پہنچتی ہے جو جاہل اولیائے طلبار کے لئے باعث طمانیت ہے۔ معمولی طور پر نام لکھنا اور اُلٹا سیدھا سود در سود کا حساب جان لینا ان کے نصاب کی تکمیل ہے۔ یہ نتیجہ ہے رعایا کی جہالت کا۔ ان کی ناجائز خواہش کی تکمیل کہ مدرسہ کے اوقات ان کی مرضی کے مطابق ہوں ناممکن ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اُن کو سمجھائیں۔ ان کو غیر صحیح راستہ سے ہٹا کر صحیح راستہ پر لگائیں۔ ملک میں تعلیم کی کمی کے باعث ہمارا کام درس و تدریس کے علاوہ عوام کے خیالات کی اصلاح بھی ہے، ورنہ ہمارا اصلی کام خاطر خواہ طریقہ پر انجام نہ پا سکے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہماری تعلیم میں نقص ہے تو ان کے اعتراضات باقی رہیں گے۔ اگر ہم اپنے فرائض کو اچھی طرح انجام دیرہے ہیں اور لڑکوں کو آئندہ زندگی کے لئے تیار کر رہے ہیں تو رعایا خود بخود ہماری طرف مائل اور ہماری ہم خیال ہو جائے گی۔ ہمدردانہ طریق پر اخلاق و محبت سے ان کو سمجھایا جائے اور عمدہ تفہیم اور اچھی تعلیم دیجائے تو اعتراضات خود بخود رفع ہو جائیں گے۔

(۴) اِس طریق تعلیم کی ترویج سے اوقات تعلیم میں کمی ہو گئی۔ اساتذہ بھی اپنی پُرانی عادت کے تحت پریشان تھے کہ پانچ گھنٹے کا کام تین گھنٹے میں کس طرح انجام پائے گا۔

بظاہر (۴۵) منٹ کے پیریڈ کا کام (۳۰) منٹ کے پیریڈ میں انجام پانا مشکل معلوم ہوتا تھا، مگر تجربہ شاہد ہے کہ اگر تھوڑے وقت میں ایک مدرس ایک جماعت کو عمدگی سے تعلیم دے تو وہ اس سے بدرجہا سودمند ہے کہ زیادہ وقت میں ایک مدرس دو یا تین جماعتوں کو تعلیم دے۔ اب ہم ایک ہی جماعت کو (۳۰) منٹ تک یکسوی کیساتھ تعلیم دے سکتے ہیں۔ اس لئے اب طلباء کی تعلیم تشفی بخش ہورہی ہے۔

(۵) بعض اساتذہ صاحبان کا خیال ہے کہ آسمان سے جو بلا نازل ہوتی ہے وہ مدرس کا پتہ دریافت کرتی ہوئی آتی ہے۔ چنانچہ پہلے ہی پانچ گھنٹوں کا کام کیا کم تھا جو اب اس طریقہ کو رواج دیکر مزید ایک گھنٹہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ نیز مدرسین وسطانیہ اور فوقانیہ کے مقابلہ میں مدرسین مدارس تحتانیہ کو تعطیلات کم اور تقریباً دگنا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ علاوہ ازیں طلباء کی فراہمی، خانگی مدارس کا مقابلہ، فصل کی کٹائی کے زمانہ میں طلباء کی غیر حاضری کی وجہ تعلیمی کمزوری کی تلافی وغیرہ بیسیوں ایسی ذمہ داریاں ہیں جو ہمارے لئے بارِ گراں ہیں۔

یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ سابقہ پانچ گھنٹے میں دو دو تین تین جماعتوں کو پڑھانے میں جو تکلیف ہوتی تھی وہ ظاہر ہے۔ ضبط کے قیام کی دردسری الگ، باوجود محنت کے کام خاطر خواہ نہونے کا صدمہ علحدہ۔ غرض سابقہ پانچ گھنٹہ کا کام موجودہ چھ گھنٹوں کے کام سے زیادہ تھکا دینے والا تھا۔ اگرچیکہ ایک گھنٹہ زیادہ کام کرنا پڑتا ہے مگر مدرس اپنے کام سے مطمئن گھر جاتا ہے۔ مدرس کے جذبۂ ایثار کا لحاظ کرتے ہیں ایک گھنٹہ کے زائد کام اور دوسری ذمہ داریوں کو زیادہ تکلیف دہ خیال نہ کرنا چاہئے۔

(۶) بچوں کی جسمانی صحت کا خیال رکھنا ہمارے لئے ازبس ضروری ہے۔ اگر جسمانی صحت اچھی نہ ہو تو باقی تمام چیزیں بیکار ہیں۔ سررشتہ نے اِسی سے جسمانی تعلیم کو اہمیت دی ہے۔ جسمانی تعلیم میں محض زمانۂ قدیم کی ورزشیں مثلاً ڈنڈ۔ بیٹھک وغیرہ ہی کارآمد نہیں ہوسکتیں بلکہ روزانہ بچوں کو مردانہ کھیل بازیگاہ مدرسہ پر کھلانا سررشتہ نے نصاب میں داخل فرمایا ہے۔ جبکہ مدارس تحتانیہ پانچ گھنٹے کے ہوتے تھے، شام میں ایک گھنٹہ تمام جماعتوں کو ڈرل و دیسی کھیل کھلائے جاتے تھے۔ اب ہم کو باری وار

طریقۂ تعلیم کی ترویج کی وجہ شام میں صبح کی جماعتوں کو کھیل کے میدان میں جمع کرنے میں دشواریاں ہوتی ہیں۔ اس لئے جس قدر وقت مل سکے صبح کی جماعتوں سے صبح میں ہی کھیل وڈرل لے لینی چاہیئے اور شام کی جماعتوں کو حسب سابق دیر تک کھلا سکتے ہیں۔

(۷) اولاً سررشتہ کی ہدایات کی بموجب اردو کی جماعتیں جلسۂ اول میں اور تلنگی کی جماعتیں جلسہ دوم میں رکھی گئی تھیں۔ اس میں یہ مصلحت تھی کہ شاخ تلنگی میں عموماً ہندو طلباء ہوتے ہیں جو صبح ناشتہ کے عادی نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں ان کو تعلیم دینا ان کی صحت کو خراب کرنا تھا۔ اس طریق عمل سے مدرسہ کے جملہ اساتذہ کے لئے تلنگی و اردو دونوں زبانوں میں مہارت رکھنا ضروری تھا۔ بعض اساتذہ اردو میں اور بعض تلنگی میں مہارت نہ رکھنے کیوجہ سے کام میں دشواریاں پیدا ہوئیں۔ اس لئے تلنگی و اُردو کی جماعتیں مدرسین کی سہولت کے مدنظر ہر دو جلسوں میں برابر برابر تقسیم کر دی گئیں۔ چنانچہ اس طرح کام سہولت سے چل رہا ہے۔

(۸) بعض جماعتوں کے طلباء اپنے کاروبار کے لحاظ سے جلسۂ اول میں تعلیم پانا چاہتے ہیں اور بعض لڑکوں کو جن کی جماعتیں جلسۂ اول میں رکھی گئی ہیں، جلسۂ دوم میں حاضر رہ کر تعلیم پانے میں سہولت ہے۔ صدر مدرس کو اپنے مدرسہ کے حالات کے لحاظ سے وقت نامہ میں جماعتوں کی تبدیلی کرتے رہنا ضروری ہے۔ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم ازکم ہر سہ ماہ میں جماعتیں بدل دی جایا کریں۔ مثلاً اس سہ ماہی میں جو جماعتیں جلسۂ اول میں آ رہی ہیں وہ آیندہ سہ ماہی میں جلسہ دوم میں رکھی جائیں۔ اس طریق عمل سے ہر دو جلسوں کے طلباء یکساں تعلیم سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۹) جس مدرسہ میں صرف دو اساتذہ مامور ہوں وہاں سوم تک کی متقابل جماعتوں کو مشترک کیا جائے تو صرف چار جماعتیں ہوتی ہیں۔ دو جماعتیں صبح اور دو جماعتیں شام میں بلائی جائیں تو ایک مدرس کے پاس صرف ایک ہی جماعت رہے گی۔ چونکہ جملہ مضامین کی تعلیم مشترک ہوتی ہے، صرف زبانِ اوّل و زبانِ دوم اور مذہب کی تعلیم کیلئے نظام الاوقات میں رعایت رکھی جائے۔

اگر کسی مدرسہ میں تین مدرسین اور چہارم تک کی دولسانی متقابل جماعتیں ہوں تو جن

جماعتوں میں تعداد طلبا، کم ہو انہیں متقابل جماعت میں ضم کرکے مشترک کریں اور مدرسین کی تعداد کے لحاظ سے مدرسہ میں جماعتیں قائم رکھی جائیں یعنی تین مدرسین کے لئے چھ جماعتیں نصف صبح اور نصف شام میں آئیں گی ۔اس طرح ایک مدرس کیلئے صرف ایک جماعت ہوگی۔ مشترک جماعتوں کی زبانِ اول اور مذہب وزبانِ دوم کے لئے نظام الاوقات میں رعایت رکھی جانا ضروری ہے ۔

اگر کسی مدرسہ میں جماعتوں کی تعداد طاق ہو تو تقسیم کار کی یکسانیت کے مدنظر کمزور یا کمسن طلبا، کی جماعت کو دونوں جلسوں میں تعلیم دیجاسکتی ہے ۔ یا جلسۂ دوم میں ایک جماعت کم رکھ کر ہر مدرسہ کیلئے ایک ساعت ایسا نکالا جائے کہ جس میں وہ جلسۂ اول کے طلبار کو اپنی نگرانی میں علمی مشاغل میں مصروف رکھ سکے ۔

باری وارطریقۂ تعلیم کے فوائد

(۱) ملک سرکار عالی کے تقریبًا جملہ مواضعات کے تحتانیہ مدارس میں اساتذہ کی تعداد جماعتوں کی مناسبت سے کم ہے۔ وقتِ واحد میں ایک مدرس کو دو دو تین تین جماعتوں کو تعلیم دینا پڑتا تھا۔جسکی وجہ سے کسی جماعت پر بھی کماحقہ توجہ نہیں کی جاسکتی تھی ۔اس لئے تعلیم ناقص رہتی تھی۔ اب باری وارطریقہ تعلیم کی ترویج سے ایک مدرس کے ذمہ صرف ایک ہی جماعت رہتی ہے ۔ اب ایک ہی وقت میں دو دو تین تین جماعتوں کو پڑھانے کی شکایت باقی نہیں رہی ۔اس طرح کارکردگی میں اضافہ ہوا ۔

(۲) اکثر مدارس تحتانیہ کرایہ کے مکانوں میں ہیں ۔جو غیر موزوں تاریک غیر ہوادار اور جگہ کے اعتبار سے بہت ہی تنگ ہیں ۔جگہ کی قلت اور طلبا، کی کثرت کی وجہ قیام ضبط میں بڑی دقتیں ہوتی تھیں ۔ مدرس کا زیادہ وقت قیام ضبط میں صرف ہوتا اور تعلیم کا موقع کم ملتا تھا۔ اب باری وارطریقہ کے رواج سے یہ شکایت باقی نہیں رہی ۔

(۳) جبکہ پورے طلبا، دونوں وقت مدرسہ آیا کرتے تھے تو فرنیچر کی کمی کی وجہ بعض لڑکوں کو بنچ پر جگہ ملتی اور بعض کو نیچے بیٹھنا پڑتا تھا۔ مدارس تحتانیہ کی خام عمارتوں میں لڑکوں کے کپڑے میلے ہوجایا کرتے تھے اور یہ منظر بدنما بھی تھا۔اب نصف طلبار کے

آنے کی وجہ سے یہ شکایت اور بدنمائی خود بخود رفع ہوگئی۔

(۴) حیدرآباد ایک زراعتی ملک ہے۔ ہمارے مواضعات کی اکثریت زراعت پیشہ اور مزدور پیشہ افراد پر مشتمل ہے۔ بچے تمام دن مدرسہ میں گھٹے رہنے کی وجہ اپنے اولیاء کو کاروبار میں ضروری امداد نہیں دے سکتے تھے جس کی وجہ سے نہ صرف اولیاء طلباء کو اس کی شکایت رہا کرتی تھی بلکہ طلباء میں اپنے آبائی پیشے سے نفرت پیدا ہونے لگی تھی ایک دلچسپ اور نتیجہ خیز روایت اس موقع پر ناموزوں نہ ہوگی۔

"ایک کسان کہنے لگا کہ باپ دادا کی وصیت ہے کہ تعلیم کے نزدیک ہرگز نہ جانا ورنہ بھوکے مرجاؤگے۔ اِدھر سے بیوی سن کر بول اٹھیں کہ اگر تم نے بیٹے کو مدرسہ بھیجا تو میں گھر میں نہ رہوں گی۔" غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایک حد تک کسان کا کہنا بھی درست ہے۔ کیونکہ موجودہ حالت میں تعلیم پاکر بچہ اپنا موروثی پیشہ اختیار کرکے روزی کمانے کو عار سمجھتا ہے۔ فی الحقیقت ایسی تعلیم کس کام کی جو اپنے آبائی پیشہ سے نفرت پیدا کرے اور دفتر کی نوکری کی ترغیب دے۔ ایسی تعلیم سے لڑکے کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا تھا۔ اس کے سدباب کیلئے باری وار طریقۂ تعلیم بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ بچہ تین گھنٹے مدرسہ میں تعلیم پانے کے بعد بقیہ اوقات میں اپنے آبائی پیشہ یعنی زراعتی کاروبار یا مزدوری وغیرہ بھا نہ صرف اپنے والدین کی مدد کرتا ہے بلکہ اپنے آبائی پیشہ میں عملی تجربہ حاصل کرتا ہے۔

(۵) ابتدائی تعلیم کو جبری بنانے کے لئے ایک مسودۂ قانون ہماری گورنمنٹ کے پیش نظر ہے۔ باری وار طریقۂ تعلیم کی مدد سے اس کا جاری کرنا بہت آسان ہوجائے گا اور توقع ہے کہ اس وقت تک یہ طریقۂ تعلیم بہت ہی کامیاب ثابت ہوگا۔

تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ ہر تعلیمی نظام کی کامیابی کا انحصار بالکلیہ مدرسین پر ہے۔ محض کسی اسکیم کا نفاذ جب تک کہ کارپردازوں کو اس کے روبہ عمل لانے کے لئے تیار نہ کیا جائے مفید نتائج پیدا کرنے کے بجائے انتشار کا موجب ہوتا ہے۔ بالخصوص ہمارے ملک میں جہاں کے باشندوں کے طبائع میں کسی نئی چیز کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں، عہدہ داران سررشتہ نے ضروری خیال کیا کہ اپنے دوروں میں اساتذہ صاحبان اور

رعایا کو اس طریقہ تعلیم کے فوائد سے آگاہ کیا جائے چنانچہ عہدہ داران معائنہ کنندہ کے علاوہ عالیجناب ناظم صاحب تعلیمات نے بھی متعدد مقامات پر دورہ فرماکر کانفرنسوں اور انجمن اساتذہ کے جلسوں میں مدرسین کو جمع کرکے اس طریقۂ تعلیم کی ترویج کے اسباب اور اسکے فوائد اور اس پر کاربند ہونے کے بعد ایسی مشکلات کا حل جن سے ہم کو دوچار ہونا پڑتا تھا بتایا ۔ چنانچہ صاحب ممدوح کی فاضلانہ رہنمائی کی بدولت آج یہ طریقہ ہمارے مدارس میں بڑی حد تک کامیابی کے ساتھ جاری ہے

سفارشات پیش کردہ

(۱) باری وار طریقہ تعلیم کے رواج کی وجہ اشارات نویسی کا کام دوگنا ہوگیا ہے ۔ اسلئے اگر کوئی مدرس کسی مضمون کے گذشتہ کے لکھے ہوئے تفصیلی اشارات کو کام میں لائے تو اُسے جدید طور پر اشارات تیار کرنے کے لئے مجبور نہ کیا جائے تو مناسب ہے ۔

(۲) اس طریقہ کے نفاذ کے بعد بھی جن مدارس میں ایک مدرس کو بوقت واحد ایک سے زائد مشترک جماعت کو پڑھانا پڑتا ہے ، وہاں جماعتوں کے لحاظ سے اسٹاف کا اضافہ فرمایا جائے تاکہ ایک مدرس کے پاس صرف ایک ہی جماعت رہئے جیساکہ اس سسٹم کا منشا رہے ۔

(۳) ہر مدرسہ میں چھوٹا سا باغ ۔ دارالمطالعہ ۔ نمائش گاہ تعلیمی کا انتظام سررشتہ کی مالی امداد سے کیا جائے تاکہ ایسے لڑکوں کو جو کسی ایک جلسہ میں باقاعدہ طور پر درس میں شریک نہیں رہتے ان مشاغل میں مصروف رکھا جائے ۔

(۴) مدارسِ خانگی میں جہاں عموماً ایک ہی مدرس کام کرتا ہے اس طریقہ کو سختی سے رائج کیا جائے قیام مدرسہ کی اجازت لینے کے وقت بانیٔ مدرسہ سے اس طریقہ پر کاربند رہنے کا ایک اقرارنامہ حاصل کیا جانا ضروری ہے تاکہ مدارس سرکاری و خانگی میں عمل کی یکسانیت رہے ۔

رپورٹ ذیلی کمیٹی[1]

آرٹ اینڈ کریفٹ

اکثر ماہرین تعلیم نے مدرسوں میں آرٹ کے پڑھائے جانے کی اہمیت کو اب محسوس کرلیا ہے لیکن دستی کام کی تمدنی قدر و قیمت خصوصاً مدارس کے نصابی مضمون کی حیثیت سے اب تک عام طور پر تسلیم نہیں کی گئی ہے اور اب بھی اس مضمون کی افادیت اور اہمیت کی بابت شکوک ہیں۔

اس رپورٹ کے پیش کرنے کا پہلا مقصد تو یہ ہے کہ عام مدارس میں دستی کام کو نصاب میں شامل کرنے کے نظریہ کو واضح کیا جائے اور دوسرے یہ کہ چند تعمیری مجوزات کی سفارش کی جائے تاکہ ایسی سہولتیں فراہم ہوسکیں کہ مدارس میں عملی کام میں سہولت پیدا ہو۔

اس مضمون کی افادیت اظہرمن الشمس ہے اور یہی افادیت اس مضمون کے خلاف یہ عام غلط فہمی پھیلانے کا باعث ہوئی۔ اس لئے کہ اس کو عام تعلیم کے نظام میں اس نقطہ نظر سے شریک کیا گیا ہے کہ بچہ کو ایسی پیشہ ورانہ تعلیم دی جائے کہ وہ اپنا کسب معاش کسی نہ کسی پیشہ کے ذریعہ اپنی ذاتی محنت سے کرسکے مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ہر کس و ناکس کو سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ بریں ہم عوام کی یہ توقعات ہیں کہ اُن کے سارے بچے کسی نہ کسی سرکاری محکمہ میں ضرور کوئی اچھے خدمات حاصل کرلیں گے اور اسی لئے ایسی ہی تعلیم کا مطالبہ ہوتا ہے جو اس ضرورت کو پورا کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ سرپرست اپنے بچوں کو مدارس میں صنعتی تعلیم حاصل کرتے دیکھ کر بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں چونکہ ان کا یہ خیال ہے کہ مطالعہ کتب کے سوائے کسی بھی اور

---

[1] یہ رپورٹ انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی سالانہ کانفرنس میں بتاریخ ۲ جنوری ۱۹۲۸ء بمقام ورنگل پڑھی گئی۔

کام میں مدارس میں اگر وقت صرف کیا جائے تو تضیع اوقات کے مترادف ہے۔ برخلاف اس کے ارباب تعلیم پیش بینی سے کام لیتے ہوئے ماہرین نفسیات کے تازہ ترین معلومات کے عین مطابق اپنی پالیسی کو ڈھالتے رہتے ہیں۔

جہاں کہیں بھی آرٹ اور دستی کام عام مدارس کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے وہاں اصولی مضمرات یکساں ہیں تاہم ہر ایک ملک نے اپنے خصوصی حالات اور مقامی ضروریات کے مدنظر مناسب ترمیم کے ساتھ کسی نہ کسی طریقہ تعلیم کو اختیار کر لیا ہے۔ اس طرح اب اس مضمون کی تمدنی قدر وقیمت ہر جگہ تسلیم کی جا رہی ہے اور یہ بھی تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ مضمون ذہین اور کند ذہن ہر دو قسم کے طلبا کے لئے یکساں مفید ہے۔

ہمارے محکمۂ تعلیمات نے آرٹ اور دستی کام مدارس میں سکھائے جانے کے مفید اثرات سے اچھی طرح واقف ہونے کے سبب سے ان مضامین پر خاص توجہ مبذول کی ہے اور نہایت چھان بین کے بعد ان کو نئے نصاب میں ایک ایسی اسکیم کے تحت شامل کیا ہے جو ان مضامین کی تمدنی خصوصیتوں کی حامل ہے۔ آرٹ اور کرافٹ اصل میں دو مختلف مضامین نہیں ہیں بلکہ ایک ہی لائحہ عمل ہے اور حقیقت میں مختلف طریقوں سے خود اظہاری کا ایک ذریعہ ہے۔ بچہ جیسا کہ چاہیئے اب محور قرار دیا گیا ہے جس کے چاروں طرف نصاب اور تعلیم گھومنا چاہیئے۔ اس اسکیم میں ہر قدم پر بچہ کی بہترین صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور صحیح تخیل کی عادات ڈالنے۔ اور صفائی کار۔ احتیاط صحیح اندازہ اور سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز اس کا مقصد یہ ہے کہ صحیح مذاق خود اعتمادی۔ اور اشکال اور رنگ کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اس طرح واضح ہے کہ مطمح نظر یہ ہے کہ بچہ کو حتی الامکان مواقع دئے جائیں تاکہ وہ خود اظہاری کے ذریعہ ہر لحاظ سے اور ہر جہتی نشو ونما پائے۔ اور یہ بات صرف آرٹ اور دستی کام کی عملی مشق سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ آرٹ اور کرافٹ دونوں میں قریبی تعلق کی واحد کڑی ڈزائین ہے جس طرح کہ کسی کام میں صرف چابکدستی ہی کاری گری کا مقصد

نہیں ہوتا اسی طرح جو کچھ دیکھیں اس کی ہو بہو نقل اتارنا صحیح معنوں میں آرٹ نہیں ہوسکتا۔ آرٹ اور دستی کام میں رنگ رنگ میں اور شکل شکل میں امتیاز ہر موقع پر ضروری ہے اور اسی صلاحیت کو ڈزائین کہتے ہیں۔ لہذا ڈزائین کا سکھایا جانا آرٹ اور کرافٹ کی تعلیم کا اہم ترین جزو ہے۔ اس بات کی یہاں وضاحت ضروری ہے کہ ڈزائین اصل معنی میں کسی آرائشی کام کو اوپر سے تھوپ دینا نہیں ہے بلکہ کسی شئے کے مکمل ہونے تک کے تمام مراحل پر مشتمل ہے جس میں کہ چیز کا تخیل۔ کام کی اسکیم۔ اوزاروں کا صحیح استعمال۔ اچھی کاری گری اور سب سے زیادہ یہ کہ جس کام کے لئے یہ چیز بنائی گئی ہے اس کے لئے وہ موزوں ہو۔ اوپر سے تھوپی ہوئی آرائش اکثر بجائے حسن میں اضافہ کرنے کے بدنمائی کا باعث ہوتی ہے اور وہ اتنی کار آمد بھی نہیں رہتی۔ اشیاء کی خوبصورتی اصل میں افادیت صحیح تناسب اور صفائی کار میں مضمر ہے۔

مدارس میں آرٹ اور دستی کام طلباء کو سکھلانے کے لئے محکمۂ تعلیمات ان کو کسی خاص فن کے لئے تیار نہیں کرنا چاہتا بلکہ توقع کرتا ہے کہ اس مضمون کی تمدنی اور مصلح اثرات کی وجہ سے بچہ ہمدرد بنے۔ اس کی تعمیر سیرت ہو اور وہ اپنی آیندہ زندگی میں جو کچھ بھی کام کریں اس کے وہ اہل ثابت ہوں۔ آج کا بچہ کل کا ڈاکٹر۔ وکیل۔ صناع۔ جو کچھ بھی وہ بننا چاہے یا بن سکے آرٹ اور دستی کام کی اس خاص نظام کے تحت تربیت اس کے کام کے لئے بدرجہا مفید تر ثابت ہوگی بہ نسبت اس محنت اور مصیبت کے جو اس کو اپنی کتابی نصاب کی تکمیل میں جو اس کو دوران تعلیم میں اٹھانی پڑتی ہے۔

کمیٹی مندرجہ ذیل سفارشات اس مضمون کے علمی پہلو اور اکثر مدارس کے موجودہ حالات کے مدنظر پیش کرتی ہے:۔

۱۔ ورک شاپ۔

(الف) صدر مدرسین صاحبان ذمہ دار ہیں کہ وہ ایک علحدہ اور وسیع کمرہ آرٹ اور دستی کام کے لئے مختص کردیں کیونکہ علحدہ کمرہ نہ ہو تو مدرسین کے لئے ناممکن ہے کہ حسب نصاب خاطر خواہ کام کرا سکیں۔

(ب) جہاں علٰحدہ کمرہ نہ دیا جاسکے وہاں کم از کم ایک شیڈ بنوایا جائے۔

(۲) آلات تعلیم۔

(الف) کم از کم دو الماریاں آرٹ کے سامان و آلات کے محفوظ کرنے کے لئے اور تین الماریاں دستی کام (جس میں کہ لکڑی کا کام اور صحافی شامل ہیں) کے آلات و سامان کے لئے ہوں اور لکڑی کے کام کے لئے بیس بنچیں سمت متعلقہ کے فرنیچر کے موازنہ سے مہیا کئے جائیں۔

(ب) جہاں کہیں ممکن ہوسکے ایک علٰحدہ کمرہ خام اشیاء کی حفاظت کے لئے دیا جائے۔

(ج) آرٹ اور کرافٹ کے مدارس کے سالانہ موازنے صرف انھیں مضامین کے آلات و خام اشیاء کے خریدنے کے لئے مختص کردئے جائیں اور مدرسہ کی کسی دوسری ضروریات پر اس رقم میں سے کچھ خرچ نہ کیا جائے۔

(۳)۔ استاد فن۔

(الف) مدارس میں آرٹ اور کرافٹ رائج کئے گئے ہیں اس کے مدنظر یہ سفارش کی جاتی ہے کہ مندرجہ ذیل نام ان کے موزوں ہونگے:۔

آرٹ ماسٹر	بجائے	ڈرائنگ ماسٹر۔
کرافٹ ماسٹر	بجائے	مینول انسٹرکٹر۔

(۷) چونکہ چالیس طلباء سے وقت واحد میں خاطر خواہ عملی کام لینا اصل میں دو ماسٹروں کا کام ہے لہٰذا کم از کم ایک مددگار یا ایک چپراسی ہر آرٹ اور ہر کرافٹ کی جماعت کے لئے دینا چاہئے تاکہ کلاس کی صفائی۔ اوزاروں کا تیز کرنا اور سامان کا سجانا ایک کے بعد دوسری جماعت کے آنے سے پہلے ممکن ہوسکے۔

(۸) کم از کم دو گھنٹے روزانہ آرٹ اور کرافٹ کے ماسٹروں کو جماعتوں کے کام کی تیاری کے لئے دئے جانا ضروری ہے اور ان کا اندراج تعلیمی گھنٹوں کی طرح نظام الاوقات میں ہونا چاہئے۔

(ت) آرٹ اور کرافٹ کے ماسٹروں کو عام تعلیمی کام نہیں دیا جائے ایسا کرنے سے خواہ مخواہ ان کے کام میں ہرج ہوتا ہے۔

(ج) مدرسہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ان ماسٹروں کو پیشہ ور کاری گر نہیں بنانا چاہیئے۔ نئے سامان کی تیاری اور پرانے سامان کی ترمیم اصل میں فرنیچر کے موازنہ سے ہونا چاہیئے اور اس کے لئے ایک بڑھائی یا رنگ ساز کی خدمات حاصل کی جانی چاہیئے نہ کہ ان ماسٹروں کو مارے ہانکے اور چار ناچار اس کام کو کرنا پڑے۔ ماسٹر اور مدرسہ ہر دو کے لئے یہ نہایت بے وقعتی کا باعث ہے کہ مدرسین کو مزدور پیشہ ور کی حیثیت دی جائے۔ استاد کا کام تربیت دینا ہے اور اس خصوص میں بھی آرٹ اور کرافٹ ماسٹر کوئی فن یا پیشہ سکھلانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کا فرض یہ ہے کہ طلباء میں آرٹ اور کرافٹ کے ذریعہ سے سیرت سازی اور ان میں اخلاقی احساسات پیدا ہوں۔

(د) اس بلند مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ مناسب ہے کہ آرٹ اور کرافٹ کے مدرسین کی قابلیت کا معیار عام تعلیم میں بھی اچھا خاصا ہو۔ لہذا یہ سفارش کی جاتی ہے کہ تمام آرٹ اور کرافٹ کے ماسٹروں کو عام اجازت دی جانا چاہیئے کہ اگر وہ چاہیں تو میٹرک اور جملہ ڈرائینگ کے امتحانوں میں بغیر کسی مزید اجازت کے بیٹھ سکیں۔

(۴) نمونے۔

(الف) طلبا اگر اپنا بنایا ہوا سامان لیجانے کے خواہاں ہوں تو اجازت دی جانی چاہیئے کہ وہ خود ذاتی خام اشیا لاکر سامان بناسکیں اور ان کا یہ بھی دل بڑھانا چاہیئے کہ وہ بطور مشق کے مدرسہ یا گھر کا سامان درست کریں۔

(ب) جو سامان کہ سرکاری خام اشیائے سے مدرسہ میں تیار ہو مدرسہ میں اور مدرسہ کے باہر اصل لاگت سے بیچا جاسکے، اس کی بھی اجازت دی جانی چاہیئے۔

(ت) اس ذریعہ سے جو رقم جمع ہو اس کو خزانہ شاہی میں داخل کرنے کی بجائے کرافٹ سے متعلق نئے نئے آلات اور اوزار خرید نے کے مد میں خرچ کرنا چاہیئے تاکہ کرافٹ کی جماعت کی حالت بہتر سے بہتر ہو سکے۔ اس سے ایک فائدہ یہہ بھی

ہوگا کہ بچے اپنے کام پر فخر کریں گے اور ان کو اپنے مدرسہ سے خاص دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہوگی۔
(ٹ) اس غرض کے لئے ایک خاص رجسٹر رکھا جائے۔

(۵) فیس۔

چونکہ منظورہ موازنہ بہت کم ہے خصوصاً آرٹ کے کام کے لئے اس لئے یہ سفارش کی جاتی ہے کہ ایک خاص فیس مثل سنما فیس، گیمس فیس وغیرہ کے طلبا پر عائد کی جائے، جس سے آرٹ اور کرافٹ کا سامان مثل کاغذ وغیرہ کے خریدا جاسکے۔ حسب ذیل فیس کی سفارش کی جاتی ہے۔

۲ ر	فوقانیہ جماعتوں کے لئے
۱½ ر	وسطانیہ جماعتوں کے لئے
۱ ر	تحتانیہ جماعتوں کے لئے

اس طرح حاصل شدہ فیس صرف آرٹ اور کرافٹ کے کام پر صرف کی جائے۔

(۶)۔ دستی کام۔

مختلف کرافٹ مختلف مدارس میں سکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً پارچہ بافی، خیاطی، بیدری کام، لکڑی کا کام اور صحافی ایک حد تک یہ جائز ہے اور مناسب بھی۔ لیکن چونکہ کسی فن یا پیشہ کی باضابطہ تعلیم اصل میں پیشہ ورانہ مدارس کا کام ہے اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ جہاں تک ممکن ہوسکے عام تعلیمی مدارس میں یکسانیت ہو۔

(۷) گریڈ۔

چونکہ ان تمام مختلف کرافٹ کے پڑھانے والے ایک ہی قسم کے عملی کام پر مامور ہیں لہذا اگر وہ یکساں معیار قابلیت رکھتے ہوں تو اُن کے گریڈز میں بھی یکسانیت ہونی چاہیئے۔ لیکن موجودہ صورت میں پارچہ بافی، خیاطی اور صحافی کے ماسٹروں کے کم گریڈ ہیں بہ نسبت دوسرے مینول انسٹرکٹرز کے۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ مینول انسٹرکٹر بنا دئے جائیں۔ یہ صورت حال واقعتاً ہمدردانہ لحاظ مناسب کی محتاج ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ان میں سے اکثر کو انتظامی ضروریات

کے مدنظر مینول انسٹرکٹری کی جائدادوں پر زیادہ گریڈ پر متبدل کیا جا چکا ہے۔

(۸) نمائش۔

نمائش میں بجائے چند مخصوص طلباء کے کام کے اور جن کو کہ ماسٹروں نے مدد دی ہو پورے مدرسہ میں دوران سال میں جو کام ہوا اپنے نمونے پیش کرنیکا موقع دیا جائے

(۹) کتب۔

سب سے آخر میں یہ بہت ضروری ہے کہ آرٹ اور کرافٹ پر اردو میں نئی نئی کتابیں لکھی جانے اور ترجمہ کئے جانے کا خاص انتظام کیا جائے۔

اراکین کمیٹی:۔

مولوی سید محمد جعفر صاحب انسپکٹر ڈرائنگ و مینول ٹریننگ۔		صدر نشین
مولوی عبدالجبار صاحب	مددگار سٹی کالج۔	معتمد
" شیخ سمیع اللہ صاحب	مددگار ٹریننگ کالج	رکن
" مرزا قادر بیگ صاحب		"
" احمد علی خاں صاحب	مددگار مدرسہ فوقانیہ چادرگھاٹ	"
" امجد علی صاحب	" " دارالشفاء	"

ہزاکسلنسی امیر جامعہ

کا

طلبہ سے خطاب

[1] یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایک خاص حیثیت سے یہاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اس سے پہلے بھی آیا ضرور تھا لیکن ایک وزیٹر کی حیثیت سے، ایک غیر کی حیثیت سے آیا تھا اور آج آپ کا ہو کر حاضر ہوا ہوں۔

حضرت اقدس و اعلیٰ کا بہترین تحفہ میرے عزیز بھائیو! آپ لوگوں سے دو دو باتیں کرنے سے قبل میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہاں کی ایک سرسری آمد کے اور سرسری طور پر آپ کی جامعہ کو، اس کی عمارت کو دیکھنے کے بعد میرے تاثرات کیا ہیں۔ آپ کی جامعہ میں آنے کے بعد جو چیز سب سے پہلے میں نے دیکھی، وہ یہ تھی کہ اس جامعہ کی عمارت کے ارکیٹکٹ نے یہ خیال رکھا ہے کہ ہندو اور مسلم کلچر کے اتحاد کا نظارہ پیش کرے اور بتا دے کہ ہندو اور مسلم کلچر مل کر کیسا حسین نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اس جامعہ کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک پتھر ہر دیکھنے والے کو یہ سبق دے رہا ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کا وجود صرف اتحاد و یگانگت میں ہے نہ کہ افتراق میں۔

میں سب سے پہلے اعلیٰحضرت اقدس و اعلیٰ کا شکریہ ادا کروںگا کہ آپ نے ملک و قوم کو وہ بہترین تحفہ عطا فرمایا جو ایک بادشاہ، ایک آقا، ایک فرمانروا اپنے ملک، اپنی قوم کو دے سکتا ہے یعنی ایک عظیم الشان تعلیمی ادارہ۔

---

[1] لفٹننٹ کرنل نواب سر احمد سعید خاں نواب صاحب چھتاری صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی و امیر جامعہ عثمانیہ نے بتاریخ ۱۲ آبان ۵۵ف طلبا جامعہ عثمانیہ کو مخاطب فرمایا۔

آج آپ حضرات سے مل کر جو مسرت ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں بھی مادرِ علمی کی آغوش میں آپ کی طرح ہی بے فکری کے دن گزار رہا تھا۔ آج اس کو ایک زمانہ ہوگیا ہے لیکن اب بھی میرے احساسات اور جذبات ویسے ہی ہیں اور اپنے محترم اساتذہ مبین سے میرے تعلقات ویسے ہی برقرار ہیں۔

آج آپ سے ملنے کے بعد پھر میرے دل میں اس کی یاد پیدا ہو رہی ہے۔ دل نے چاہا کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ اور میں مل کر اپنی زندگی کے گزشتہ ادوار پر ایک نظر باز گشت ڈالیں۔ آپ میں سے بعض نو عمر ہیں اور بعض مجھ سے معمّر لیکن آپ کے اور میرے ادوار زندگی کے کچھ نہ کچھ حصے مشترک ضرور ہیں۔

ہماری زندگی کا پہلا دور بچپن کا دور ہوتا ہے جب ہم ایک کھلونے پر ایک ایک لڈو پر لڑتے ہیں۔ ہماری زندگی کے نشیب و فراز اسی کھلونے کے حاصل کرنے یا نہ کرنے پر منحصر ہوتے ہیں۔ اگر ہم ناکام رہتے ہیں تو ہمیں بڑی تکلیف رہتی ہے۔ اس کے ساتھ جب ہمارے بزرگ ہمیں روکتے ہیں تو ہم خیال کرتے ہیں کہ وہ سب غلطی پر ہیں۔

اس کے بعد ہماری زندگی کا ایک اور دور آتا ہے۔ اس میں ہمارے بچپن کے خیالات ہمیں غلط، لغو اور بیکار معلوم ہوتے ہیں۔ میری تقریر سے آپ کہیں یہ مطلب نہ نکالیں کہ میں آپ کو نصیحتیں کرنے آیا ہوں۔ اگر ایسا ہو تو میرے جانے کے بعد آپ کہنے لگیں گے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح   کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

میں تو صرف اپنی زندگی کے دور یاد کرنا چاہتا ہوں۔ اسکول کے دور میں اگرچہ ہمارے سابقہ خیالات غلط معلوم ہوتے ہیں لیکن نئے جذبات اُن کی جگہ لیتے ہیں اور ان کے متعلق بھی وہی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ اگر ہمارے جذبات کی تکمیل نہ ہوئی تو ہم ساری دنیا کو نا اہل سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لئے اگر آپ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ غلطی اور صحت محض اضافی چیزیں ہیں اور ان کا دارومدار صرف آپ کے نقطۂ نظر پر ہوتا ہے اس لئے یہ خیال کر لینا کہ ہماری رائے ہی صحیح تھی غلط ہے اور یہ کہ وہ جو ہم سے زیادہ غلطیاں کر چکے ہوں اور

زیادہ تجربہ حاصل کیا ہو۔ کیونکہ آپ سے جو معمّر ہیں انھوں نے لازماً زیادہ عرصہ تک غلطیاں کی ہوں گی اور ان سے زیادہ فائدہ بھی اٹھایا ہوگا۔ ان کی رائے کو غلط سمجھنا درست نہیں۔

تعلیم کا مقصد تہذیب نفس، تہذیب نفس کا مقصد، آزادی کا صحیح استعمال ؛

اب آپ کی زندگی کا جامعی دور گزر رہا ہے۔ آپ ایک نئے خاندان کے رکن ہیں۔ یہاں آپ کے والدین کی جگہ آپ کے اساتذہ نے لی ہے اور جو ہمدردانہ تعلق آپ کے والدین کو آپ سے ہوتا ہے وہ اساتذہ میں موجود نہیں ہے تو جامعہ کامیاب نہیں ہوسکتی۔ نہ اس کا مقصد پورا ہوسکتا ہے۔ تعلیم کا مقصد آپ کو قابل علماء کے مقولے یاد دلا دینا نہیں۔ اس کا مقصد چند الفاظ میں تہذیب نفس پیدا کرنا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو تعلیم بیکار ہے۔ اس تہذیب کا مقصد یہ ہے کہ آپ آزادی کے صحیح استعمال کے قابل ہوں اور وہی سب سے زیادہ آزاد ہوتا ہے جو اپنے آپ پر سب سے زیادہ قیود عائد کرلے۔ جس نے اپنے آپ پر رضاکارانہ طور پر جتنے قیود عائد کرلئے اتنا ہی وہ زیادہ آزاد ہے، اتنی ہی اس کی تہذیب نفس بڑھی ہوئی ہے۔

اب میں جامعہ کے طلباء سے پھر ملنے کی عزت حاصل کروں گا۔ اب ایک اجنبی ہوں اور یہ آپ کا کام ہے کہ اجنبیت اور علحدگی کے احساسات کو آپ اُخوت اور محبت کے احساسات سے بدل کر مجھے اپنا بنا لیں۔"

سالانہ کانفرنس

کُل ہند وفاق انجمن ہائے اساتذہ

پروفیسر امرناتھ جھا کے خطبۂ صدارت کا خلاصہ[۱]

"یہ ضروری ہے کہ ہم انسانی قسمت کا واضح تصور رکھیں اور یقین حاصل کریں کہ آیا ہم روئے زمین پر کمانے اور لطف اٹھانے آئے ہیں یا ایک بڑے گوریلے سے زیادہ شریفانہ اور اعلیٰ زندگی بسر کرنے۔" پروفیسر امرناتھ جھا نے کل ہند تعلیمی کانفرنس سری نگر کے خطبۂ صدارت میں کہا۔

تعلیم کے نصب العین کی نسبت انھوں نے کہا کہ تعلیم کی تجویز سازی تازہ بتازہ ہونی چاہئے تاکہ اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو جس کو آج ٹھکرایا جا رہا ہے۔ انھوں نے ہمہ گیر ممالک کا ذکر کیا جہاں مقاصد تعلیم کی تعریف وتحدید صاف الفاظ میں مملکت کے حکم سے ہوتی ہے۔

خالص دماغی ترقی تباہی کے نئے آلات کی تیاری پر منتج ہوتی ہے۔ "طاقت بہترین اور دانشمند ترین افراد کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ اس کا استعمال انسانی حقوق کے حصول کے لئے نہیں بلکہ انسان کے دینی حقوق کے حصول کے لئے ہونا چاہئے۔ تعلیم انسان کو اس طرح آراستہ کرے کہ اس کا جسم، دماغ اور روح مخلوق خدا کی حیثیت سے انسان کی شان وترقی کے لئے ہم آہنگی سے کام کریں۔ انھیں تعلیم ہم آہنگی کے لئے دینی چاہئے نہ کہ لڑائی کے لئے۔

انھوں نے ہمارے موجودہ صنعتی نظام میں بعض رخنوں کی طرف اشارہ کیا جن کو پُر کرنا چاہئے اور خیال ظاہر کیا کہ بہت کم توجہ اطفال اور نرسری اسکولوں اور فنی تعلیم اور تعلیم بالغان کی طرف کی جا رہی ہے۔

---

[۱] یہ خطبہ بمقام سری نگر (کشمیر) ۲۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کو دیا گیا۔

مذہبی تعلیم:۔ مذہبی اور فرقہ دارانہ تعلیم کا ذکر کرتے ہوے انھوں نے کہا کہ اگر عیسائیت، ہندومت، اسلام، بدھ مت، مذہب زرتشت اور دوسرے مذاہب کے خاص خاص اصول ایک جگہ جمع کئے جائیں تو نہ صرف بہت ساری مذہبی تلخی اور غلط فہمی دور ہو جائے گی بلکہ ہر شخص فراخ دلانہ اور روادارانہ زاویۂ نگاہ اختیار کرنا سیکھ جائے گا۔ جو بنی نوع انسان کے مستقبل کے لئے شگون نیک ہوگا۔

لیکن انھوں نے مذہبی تعلیم کی وکالت کرتے ہوئے رائے ظاہر کی کہ فرقہ واری مدارس اور کالج برخاست کردینے چاہئیں۔ ماہرین تعلیم کو اس اثر بد کی بیخ کنی کی فکر کرنی چاہیئے جو ہندوستانی قوم کے استحکام کی تباہی کے درپے ہے۔ خود اساتذہ کو تنگ نظر فرقہ واریت کے خراب اثر سے آزاد رہنا چاہیئے۔

شذرات

خلاصہ تقریر[1] میر احمد علی خاں صاحب "ہندوستان کی ابتدائی تعلیم میں چند رکاوٹیں" میرا آج کا موضوع ہے۔

یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ دورِ حاضر میں بمقابلہ انگلستان کے ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کی ترویج پہلے ہوئی ہے ۱۸۷۰ء میں انگلستان میں ابتدائی تعلیم کا قانون نافذ ہوا اور اس کے برخلاف ہندوستان میں ۱۸۱۳ء سے قبل ہی اس طرف کمپنی کی حکومت متوجہ ہو چکی تھی اس بارے میں ہندوستان یورپ کے دیگر ممالک سے بھی پیش پیش رہا ہے۔ پھر بھی ہندوستان ہی تعلیمی ترقی میں بہ نسبت اور ممالک کے پیچھے ہے۔

ممالک یورپ اور امریکی ریاستوں کی تعلیم میں بچوں کی ضروریات کا اندازہ اُن کی خصوصیات اور حالات کے مدنظر نہیں بلکہ والدین۔ سرپرستوں اور معلّمین وغیرہ کے تجربات اور توقعات کے تحت کیا جاتا تھا۔ اب بچوں کی نہ صرف ابتدائی تعلیم بلکہ ان کی عام نشو ونما یعنی ان کی جسمانی اخلاقی اور مذہبی تربیت کی طرف توجہ کی جارہی ہے دوسرے ممالک میں ہندوستان کی طرح خواندگی تعلیم کا مقصد نہیں ہے۔ جس میں بچوں کو دلچسپی ہو یا نہ ہو مجبوراً رٹایا نہیں جاتا بلکہ زندگی کے مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ ترکوں کی تعلیمی ترقی کا بڑا راز یہی تھا کہ ترکی میں صحیح مقصد تعلیم کو پیش نظر رکھ کر عمل ہوا اسی وجہ سے کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ ترقی وہاں ممکن ہو سکی۔

دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ ہندوستان میں ابتدائی مدارس میں تعلیم پانے اور تعلیم دینے والے پست خیال شریک ہوتے ہیں۔ متمول اور مالدار طلباء اس میں شریک ہونا کسرِ شان سمجھتے ہیں ان کے لئے ثانوی مدارس کے تحتانی درجے مخصوص ہیں۔ جرمنی کی مثال اس سلسلہ میں کارآمد ہو سکتی ہے۔ وہاں ۱۹۱۹ء میں ایک جدید (۴) سالہ نصاب تعلیم مرتب کیا گیا اور اس کو فونڈیشن اسکول کے نام سے موسوم کیا گیا۔

---

[1] یہ تقریر کانفرنس انجمن اساتذہ ، میدک ۱۳۴۵ف میں کی گئی۔

اس میں ہر ایک تعلیم پاتا ہے۔ فرقے یا امارت یا غربت سے کوئی تعلق نہیں۔

ہندوستان میں عام طور پر ابتدائی تعلیم کا نصاب ۴ سالہ ہے لیکن حاضری کی عدم پابندی کی وجہ اس پوری مدت میں بہت کم لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔

چوتھا نقص والدین اور سرپرستوں سے متعلق ہے۔ ان میں اشتراک عمل تقریباً معدوم ہے۔ اولیاً وغیرہ کی دلچسپی اور توجہ حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ اولاً ابتدائی تعلیم میں اصلاح کی جائے اور ابتدائی تعلیم کا نصاب اور مصروفیات حقیقی زندگی سے وابستہ ہوں۔

پانچویں نقص کا تعلق مدرسین سے ہے۔ ان کی عام تعلیمی قابلیت اور پیشہ ورانہ تربیت و معلومات عموماً ناکافی اور غیر اطمینان بخش ہیں۔ اس کا اثر طریقہ ہائے تعلیم اور تعلیمی فضا پر بُرا پڑ رہا ہے۔

مختصر یہ کہ ہماری ابتدائی تعلیم ایک بڑی حد تک کامیاب اس وقت ہوسکتی ہے جبکہ مشکلات ورکاوٹیں جنہیں مدرسین نے نہیں پیدا کیں ان کا ازالہ کیا جائے جس کے لئے ممکنہ کوشش کرنی چاہیئے۔

جلسہ سالانہ انجمن اساتذہ ضلع بیڑ۔ بہمن ۱۳۵۰ف انجمن اساتذہ ضلع بیڑ کے سالانہ جلسہ کا پہلا اجلاس زیر صدارت مولوی غیاث الدین احمد صاحب مہتمم تعلیمات ضلع بیڑ مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ بیڑ کی عمارت میں منعقد ہوا۔ مدرسہ کا احاطہ آراستہ کیا گیا تھا۔ خواتین و معلمات کے لئے ایک حصہ مختص کر دیا گیا تھا۔

کارروائی کا آغاز قراءت سے ہوا۔ مدرسہ تحتانیہ دھونڈاپورہ کے دو بچوں نے پرارتھنا کہی۔ محمد عبدالستار صاحب معتمد انجمن اساتذہ نے رپورٹ سال گزشتہ پڑھ کر سنائی۔ پھر مولوی اسرار احمد صاحب انصاری مددگار مدرسہ فوقانیہ بیڑ نے دلکش پیرایہ میں "اخلاق مدرسہ" پر مبسوط تقریر فرمائی۔ مقرر نے مختلف مثالوں و تجربوں و نظائر سے ثابت کر دکھایا کہ ملک یا مذہب یا مدرسہ اس وقت تک راہ ترقی میں ہرگز گامزن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی اخلاقی ترقی نہ ہو۔ اس کے بعد مسٹر وینکٹیش راؤ مددگار مدرسہ تحتانیہ عزیز پورہ نے دستکاری پر جماعت اول کو نمونہ کا سبق دیا۔

اجلاس دوم

دوسرے اجلاس میں مولوی غلام طاہر صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ گیورائی نے "تعلیم اوب پڑ" ایک مبسوط تقریر فرمائی۔ ازاں بعد مسٹر سکھا رام مددگار مدرسہ تحتانیہ مرکزی دھونڈاپورہ نے جماعت چہارم کو قواعد موٹی پر نمونہ کا سبق دیا۔ مولوی سید علی صاحب مددگار مدرسہ فوقانیہ بیڑ نے "بنیک انگریزی" پر ایک برجستہ تقریر فرمائی اور پنڈت جواہر لعل نہرو، بوس وغیرہ کے خیالات کی ترجمانی کی۔ نیز عالی جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر کے خطبۂ صدارت کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ مدارس کے موجودہ تعلیم کے پیش نظر

انگریزی سکھانے کے لئے ابتدا ؤ بیک انگریزی پر زور دیا جائے اس کے جراثیم بہت جلد دیگر مدارس میں بھی پہونچ جائیں گے۔

تیسرے اجلاس میں مولوی عثمان صاحب مددگار مدرسہ تحتانیہ مرکزی دھونڈا پورہ نے مضمون حساب پر جماعت چہارم مرہٹی کو نمونہ کا سبق پڑھایا۔ مسٹر سداشیوراؤ ناظر تعلیمات ضلع بیڑ نے منصوبی طریقہ پر تقریر فرمائی۔ مولوی بشیر الدین صاحب مددگار مدرسہ فوقانیہ بیڑ نے جماعت ششم کو مضمون فارسی میں نمونہ کا سبق دیا۔

چوتھے اجلاس میں مسٹر چندشیکھر مددگار فوقانیہ بیڑ نے ورزش جسمانی پر تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ آج کل بچوں میں حسب ذیل نقائص پائے جاتے ہیں۔ چپکا ہوا سینا۔ پھولا ہوا پیٹ وغیرہ ان کے لئے اصلاحی ورزشیں ضرور کروائی جائیں۔ دیسی و بدیسی کھیلوں کے ذریعہ انھیں صحت مند بنایا جائے۔ مسٹر پنڈت شنکر راؤ صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ جول بن نے جماعت چہارم کو مرہٹی نظم پر نمونہ کا سبق دیا۔

پانچواں اجلاس زیر صدارت عالی جناب مولوی غیاث الدین احمد صاحب مہتمم تعلیمات ضلع بیڑ منعقد ہوا۔ ابتداءً کئی تحریکات پیش ہوئیں۔ پھر عہدہ داران انجمن کے انتخابات عمل میں آئے۔

صدر جلسہ نے تقاریر و اسباق پر مؤثر تبصرہ فرمایا۔ تقریر جامع مدلل و دلچسپ تھی جس کا حاضرین پر خاص اثر ہوا۔ اس کے بعد صدر کانفرنس نے اراکین انجمن کی ان تھک کوششوں اور محنت کی ستائش فرمائی اور خوانین پردہ دار و معلمات اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا فرمایا۔

جلسہ کا اختتام دعائے درازی عمر و اقبال حضور پرنور و شہزادگان بلند اقبال و شہزادیان فرخندہ فال پر عمل میں آیا۔

جلسہ انجمن اساتذہ مدرسہ بیدر۔ انجمن کا ماہانہ جلسہ بابت ۲۹ خورداد ۱۳۵۰ ف بصدارت صدر مدرس صاحب منعقد ہوا۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے اردو نظم پر نمونہ کا سبق جماعت ہفتم کو دیا۔ سبق مقررہ وقت میں مکمل نہ ہو سکا۔ اس کے بعد مسٹر کھنڈے راؤ نے ہوم ورک مدرسین کی نگرانی میں کرانے پر تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ مدرسہ میں برخاست کے بعد یا تعلیم شروع ہونے سے پیشتر کرانا بہت ہی مشکل ہے۔ البتہ تعطیلات میں اور تفریح کے لئے جب مدرسین جائیں تو طلباء ان کے ساتھ جا کر ہوم ورک کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ ورنہ ہوم ورک اور کلاس ورک میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ عبدالحمید صاحب شوق نے کہا کہ ہوم ورک وہ کام ہے جو طلباء کو گھر پہ آزادی سے کرنے کو دیا جائے۔ مگر عموماً طلباء لے پروائی سے یہ کام کرتے ہیں کہ مدرسین کا بہت سا وقت اس کی تصحیح میں گذرتا ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ

جو کام تحریری مدرسہ میں ہو اس کو طلبا گھر سے صاف کر کے لائیں۔ تو ان کو اعادہ کا بھی فائدہ ہوگا۔ وہ کام بھی مدرسین کی زیر نگرانی انجام پایا ہوا ہوگا۔ اور اس کی صحت میں بھی مدرسین کا زیادہ وقت صرف نہ ہوگا۔ مولوی عبد الولی صاحب نے بھی زور دیا کہ ہوم ورک مدرسین کی نگرانی میں ہونا چاہئے۔ پھر مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے تقریر فرمائی اور فرمایا کہ ہوم ورک دینے والے مدرسین طلبا کو درسی کتابوں کی طرف توجہ کرنے سے گویا روکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کل کے طلبا کو اپنی کتابوں کی خبر نہیں کہ ان میں کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ قدیم طریقہ تعطیلات میں کچھ تحریری و مشقی کام دینے کا زیادہ مفید تھا۔

صدر جلسہ نے فرمایا کہ ہوم ورک نہ سہی اس کا کچھ ہی نام رکھ لو مگر کچھ نہ کچھ مشقی کام جو کلاس ورک سے الگ ہو مدرسین کی نگرانی میں کرانا بہت ضروری ہے۔ اور سال حال جو تجربہ ہائی کلاسس میں انگریزی کے متعلق کیا گیا ہے وہ کافی مفید ثابت ہوا ہے۔ یقیناً تفریح و تعطیلات میں یا ہر روز گھر پر جو وقت ہوم ورک کی صحت میں صرف ہوتا ہے اس سے کم وقت میں زیادہ بہتر خدمت طلباء کی مدرسین کر سکتے ہیں۔ جلسہ تقریباً ۱½ بجے ختم ہوا۔

ماہانہ جلسہ انجمن اساتذہ فوقانیہ نام پلی:۔ بصدارت جناب مولوی مرزا محمود علی بیگ صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی انجمن اساتذہ کا جلسہ بابتہ امرداد ۱۳۴۵ ف منعقد ہوا۔ مولوی غلام دستگیر صاحب مددگار مدرسہ فوقانیہ نامپلی نے Dramatization "تمثیل" پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ تمثیل ایک قصہ اور افسانہ ہوتا ہے جس میں انسان کی حقیقی زندگی کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ عام طور پر ڈرامہ کو معیوب سمجھا جاتا ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ہر چیز میں اچھائی اور برائی ہوتی ہے ہم کو اچھائی سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور برائی کو چھوڑ دینا چاہئے۔

طلباء کے سامنے کسی مضمون یا سبق کو جہاں تک ہو سکے "تمثیل" کی صورت میں پیش کرنا چاہئے۔ جدید تحریکات تعلیم میں بچوں کی فطری جبلتوں اور رجحانوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بچوں کی ایک جبلت تمثیلی بھی ہے۔ جب بچہ اپنے بزرگوں کو کوئی کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو خود بھی اس کی تقلید کرتا ہے۔ چھوٹی سی چھوٹی اور بڑی سی بڑی جماعت میں تمثیل کے ذریعہ سبق پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں بچوں کی عمر اور استعداد کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔ تمثیلی طریقے کو چھوٹی جماعتوں سے شروع کیا جائے تو مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ پہلے بچے کے تخیل کو اکسایا جائے اس کے بعد ڈرامہ کے ذریعہ سبق کو پیش کیا جائے شکسپیر کا کوئی ڈرامہ پڑھانا ہو تو مدرس خود اس قصے کو پڑھ کر سنائے اور بچوں کے تخیل کو اکسائے اس کے بعد چند بچوں کو افرادِ قصہ کے طور پر منتخب کیا جائے۔ سوالات کے ذریعہ قصہ کا مضمون بچوں کے ذہن نشین

کرایا جائے۔ تمثیل کے ذریعہ سبق دینے کے لئے کسی سالانہ جلسہ کی ضرورت نہیں بلکہ جب ضرورت محسوس ہو تمثیل کے ذریعہ سبق دیا جائے۔

ایسے ڈراموں کا انتخاب کیا جائے جو اخلاقی ہوں اور ان کی تیاری میں کم سے کم وقت صرف ہو سکے۔ تمثیل کے ذریعہ تعلیم دینے کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے بچوں کی تعلیم کتابی نہ ہو بلکہ مشاہدہ اور عمل سے ہو۔

صدرنشین صاحب نے اس تقریر پر اظہار خوشنودی فرماتے ہوئے یہ رائے ظاہر فرمائی کہ اگر مدارس میں ان اصول پر عمل کیا جائے تو مفید نتائج برآمد ہوں گے۔

جلسہ سالگرہ مبارک مدرسہ تحتانیہ پالم :- ۲۰؍شہریور ۵۰ ف کو سالگرہ ہمایونی کا جلسہ منجانب اسٹاف مدرسہ منایا گیا۔ طلباء مدرسہ نے ہاتھوں میں جھنڈیاں لئے ہوئے ترانہ دکن پڑھتے ہوئے موضع نوازی کے آبادی میں گشت لگایا۔ طلبہ مدرسہ نے حمد و باری تعالیٰ و ترانۂ دکن پڑھا۔ اور پرچم آصفی کی سلامی کے بعد جلسہ کا آغاز ہوا۔ پنڈت سومیشور راؤ صاحب وطن دار پٹواری نے صدارت کی۔ قرأت اور پرآرتھنا کے بعد فریدالدین و عبدالحمید۔ کاسی رام۔ نارائن ریڈی و شیخ علی و نرسیا متعلمین مدرسہ نے عہد عثمانی کے جدید ترقیات و سالگرہ سے متعلق تقریریں کیں۔

مولوی محمد عبدالغنی صاحب و مسٹر بی بھوم راج مددگار مدرسہ نے بزبان تلگو سالگرہ و جدید ترقیات سے متعلق تقریریں کیں۔ طلباء مدرسہ نے مکالمہ کیا۔ مولوی محمد عبدالقادر صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا نے عہد عثمانی کے برکات اور ترقیات و سالگرہ کی اہمیت کو ظاہر فرمایا۔ اور عوام کی توجہ مدرسہ کے جانب مبذول فرمائی۔ آخر میں صدر جلسہ نے سالگرہ سے متعلق تقریر کرتے ہوئے مدرسہ کی ترقی پر اظہار خوشنودی فرمایا۔ صدر مدرس مدرسہ نے صدرنشین صاحب و مسٹر گنگا ریڈی اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور دعائے سلامتی اعلیٰ حضرت بندگان عالی و شاہزادگان بلند اقبال و شاہزادیان فرخندہ فال پر جلسہ برخاست کیا گیا۔

جلسۂ سالانہ مدرسہ وسطانیہ مغل گدہ :- ۱۶؍شہریور ۱۳۵۰ف کو مدرسہ کا سالانہ جلسہ تقسیم انعامات زیر صدارت راجہ وینکٹ اننت ریڈی صاحب وسیکھہ منایا گیا۔ اولیائے طلباء و معززین مقامی کثیر تعداد میں شریک جلسہ رہے۔ مدرسہ کو خوبی کے ساتھ آراستہ کیا گیا تھا۔ حالات حاضرہ سے متعلق جنگی تصاویر و نقشہ جات پبلک کے لئے جاذب توجہ بنے ہوئے تھے۔ سہ پہر میں طلباء کے اسپورٹس شروع ہوئے۔ جس میں سگنلنگ اور فزیکل ڈسپلے دلچسپ تھے۔ اسپورٹس کے ختم پر پرتکلف عصرانہ کا

منجانب مدرسہ انتظام کیا گیا تھا تقریباً سو مہمان بلا امتیاز مذہب و ملت ایک ہی میز پر لطف اندوز ہو رہے تھے اور یہ باہمی اتحاد و یگانگت کا بے نظیر نظارہ تھا۔ قرأۃ اور پر ارتھنا سے جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ مولوی سید ریاض الدین علی صاحب نے ایک برجستہ اور دلچسپ تقریر کے ساتھ مدرسہ کی سالانہ رپورٹ سنائی اور پنج سالہ ترقیات مدرسہ کا بھی ذکر فرمایا۔ ان واقعات کا دل خوش کن اظہار فرمانے کے بعد جب صدر مدرسہ کے تبادلہ کی خبر سُنائی تو مجمع پر ایک رنج و افسوس کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے بعد ضیاء الدین محمد صدیق اور محمود علی نے اقبال کا ترانہ "ہندوستان ہمارا" سنا کر مجمع کو محظوظ کیا بعد ازاں مختلف طلبائے نے اُردو تلنگی اور انگریزی میں دلچسپ تقریریں اور مکالمے کئے۔ جن میں خاص کر رحمت اللہ شریف اور عطاء اللہ شریف، شیشگر راؤ اور سرینواس راؤ کی تقریریں بہت پسند کی گئیں۔ جلسہ کا سب سے آخری اور دلچسپ حصہ کمسن بچوں کا ایک ڈرامہ "ہیضہ خاں کی موت" تھا۔ جو مولوی احمد شریف صاحب مددگار مدرسہ ہذا کی زیر نگرانی اسٹیج کیا گیا تھا۔ اس میں نہایت مفید معلومات اس مرض کے انسداد کے متعلق پیش کئے گئے تھے جو وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت کو پورا کر رہے تھے۔ اس کے بعد صدر جلسہ نے منجانب مدرسہ کثیر تعداد میں طلباء کو انعامات تقسیم فرمائے۔ اور اپنی صدارتی تقریر میں مدرسہ کی کارگزاریوں اور طلباء کی تقاریر پر اظہار خوشنودی فرمایا۔ جلسہ اعلیٰ حضرت بندگان عالی و خانوادۂ آصفی کی صحت و سلامتی کی دعا پر کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ نٹرگل:۔ مدرسہ کا سالانہ جلسہ بابتہ ۱۳۴۵ف بصدارت مسٹر وینکٹ ڈیشویڈی صاحب مقدم مالی منعقد ہوا۔ حمد و ثنا اور ترانۂ دکن پڑھنے کے بعد صدر مدرس و مددگار صاحبان و طلبائے مدرسہ نے علمی فوائد و ادب وغیرہ کے متعلق تقاریر کیں ان بعد ماس ڈرل کا مظاہرہ رسہ کشی و دیگر کھیل کھلائے گئے۔ اسپورٹس کے ختم پر جناب صدر نشین صاحب نے تقریر کرتے ہوئے رعایا مقامی کو توجہ دلائی کہ اپنے اپنے بچوں کو مدرسہ بھیج کر علم سے مستفید کریں۔ موصوف نے اپنی ذات سے طلبائے مدرسہ کو انعامات تقسیم کئے آخیر میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی خانوادۂ آصفی کی عمر و اقبال میں دعائے سلامتی مانگی گئی۔ بعد ضیافت جلسہ برخاست کیا گیا۔

تعلیمی سفر طلباء گلبرگہ کالج:۔ کالج کے ہاکی فرسٹ الیون کے ارکان اور طلبائے کالج کی ایک جماعت جناب پرنسپل صاحب گلبرگہ کالج کی قیادت میں راہی پونہ ہوئی۔ جناب صدر مدرس صاحب اینگلو اردو ہائی اسکول پونا نے نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ طلباء کا خیر مقدم فرمایا اور اپنے

مدرسہ کے موزوں حصہ میں طلباء کے قیام کا بہت اچھا انتظام کیا اور طلباء کی ضیافت بھی کی جس کے لئے ہم کالج کی جانب سے اُن کے متشکر ہیں۔ پونا کا موسم نہایت خوش گوار اور فضاء فرحت بخش تھی۔ تمام طلباء نے متعدد تعلیمی اداروں اور تاریخی مقامات کا معائنہ کیا اور کالج کی ہاکی ٹیم نے "لاکالج پونا" اور فرگسن کالج سے ہاکی کے میچ کھیلے اور علی الترتیب تین اور دو گولوں سے کامیابی حاصل کی۔ نیز واڈیا کالج سے دو مرتبہ ہاکی میچ ہوا مگر دونوں مرتبہ مقابلہ مساوی رہا اور ایک والی بال میچ بھی کامیابی سے کھیلا گیا۔ اس طرح پانچ یوم کے تعلیمی سفر اور تفریح کے بعد یہ مختصر قافلہ گلبرگہ واپس آیا۔

جلسہ انجمن اساتذہ مدرسہ تحتانیہ یلدرتی :۔ مولوی محمد امام صاحب صدر مدرس نے طلباء جماعت چہارم وسوم اُردو کو امرداد ۵ۦ ف کے ماہانہ جلسہ میں ابری رنگنے کے کام کا طریقہ بتلایا طلباء کو عملی طور پر کام کرنے کا موقع دیا گیا۔ طریقہ تفہیم مؤثر اور مفید ہونے سے عملی کام دلچسپ اور کامیاب رہا۔

اس کے بعد صاحب موصوف نے مدرسین کو عملی طور پر جماعت صغیر سے متعلق ریت کا کام و نیز دیگر جماعتوں سے متعلق گنگا جمنی کا کام اور ٹھپہ کا کام بتلایا۔

ماہ شہریور ۵ۦ ف کے جلسہ میں مسٹر کشٹیا مددگار مدرسہ ہذا نے چہارم اُردو کو تاریخ میں حسن گنگو پر سبق پڑھایا۔ اختتام سبق پر ضروری نکتہ چینی کے بعد طے پایا کہ سبق بہ حیثیت مجموعی کامیاب رہا۔

جناب صدر نے فرمایا کہ آیندہ سے آغاز سبق سے قبل ون منٹ ڈرل کرائی جائے تاکہ طلباء سبق کے لئے مستعد ہو جائیں۔

ماہ مہر ۱۳۵۰ف میں محمد عثمان صاحب مددگار مدرسہ ہذا نے جماعت سوم اُردو کو جغرافیہ (ضلع اطراف بلدہ) پر نمونہ کا سبق پڑھایا اور آغاز سبق سے قبل ون منٹ ڈرل کرائی گئی۔ طریقہ تعلیم اصولی تھا اور طریقہ تفہیم موثر و مفید جس کی وجہ سبق کامیاب رہا۔

اس کے بعد تدریس جغرافیہ سے متعلق بحث و مباحثہ ہوا۔ جناب صدر نے فرمایا کہ جغرافیہ کی تعلیم کے لئے توضیحات کا تیار کرنا ضروری ہے۔ ورنہ تدریس نامکمل رہے گی۔

تعلیمی سفر :۔ طلباء مدرسۂ وسطانیہ سلطان بازار کی دو جماعتیں بتاریخ ۱۴ ارمہر ۱۳۵۰ف ذریعہ موٹر لاری و ڈیزل کار اساتذہ صاحبان و صدر مدرس کے ہمراہ تعلیمی سفر کے لئے بیدر روانہ ہوئیں۔ مدرسہ، مقبرہ محمود گاواں، قلعہ، گنبدان سلاطین بریدشاہیہ و بہمنیہ، فرح باغ، پاپناس و درگاہوں کی

زیارت اور صنعت گاہوں کے معائنہ کے بعد تیسرے دن واپسی عمل میں آئی۔

تدریس مطالعہ قدرت و اسباق الاشیاء۔ مولوی بہاء الدین صاحب حال مددگار مدرسۂ فوقانیہ گوشہ محل نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ "قدرت بچے کے نفس کے لئے بہت دلکش ہوتی ہے۔ اس کے جذبات تجسس اور استعجاب کو اکساتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچہ قدرت کے مشاہدہ میں مسرت و انبساط محسوس کرتا ہے جس سے اُس کی زندگی خوشگوار بن جاتی ہے۔ بچہ کو واقعات قدرت اور جانوروں اور پودوں کے کاروبار کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے جس کے سبب وہ اُن کے ساتھ ہمدردانہ خیال رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے ذہنی قوی تیز ہوتی جاتی ہیں۔ بچہ کی تعلیم کی ابتداء اس کے ماحول سے ہوتی ہے اور اس کے ماحول کا جوابی عمل اس کے ادراک کے ساتھ راست تعلق رکھتا ہے۔ لہذا بچہ کا ادراک تصورات سے مملو ہو جاتا ہے اور نفسی بالیدگی کا قدرتی عمل مشاہدہ کی رہبری کرتا ہے۔ مشاہدہ کی عادت ذہنی نشوونما کی بنیاد تیار کرتی ہے جو تفکر کے بلند تر اعمال کے لئے از حد ضروری ہے جو چیزیں بچوں کی جبلت راز جوئی کو بدوران مشاہدہ ابھارتی ہیں وہ ان میں دلچسپی بڑھانے اور ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر استدلال کی قوت کو ترقی دینے میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔ ان فوائد کو حاصل کرنے کے لئے مطالعہ قدرت کی صحیح طریقہ تدریس اور طریقہ تعلیم کے جو طریقے رائج ہیں اُن کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

استادی اور تحقیقاتی طریقہ:۔ مطالعہ قدرت کی تعلیم کے دو طریقے ہیں ایک بذریعہ تقریر جس میں مدرس خود تمام معلومات بچوں کو بہم پہنچاتا ہے دوسرے بچے خود تحقیق کرتے ہیں اور مدرس ان کی رہبری کرتا ہے۔ پہلا طریقہ غیر موزوں و غیر مفید ہے۔ برخلاف اس کے دوسرا طریقہ نہایت مفید ہے لیکن وقت کی کمی کے باعث اس سے پورا پورا استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس میں کچھ ترمیم کر کے مدرس خود بھی بچوں کو تھوڑے معلومات بہم پہنچائے اور ان کو خود بھی معلومات حاصل کرنے کا موقعہ دے تو یہ طریقہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔

جو چیزیں دوران سبق میں بطور خاص مدرس کو ملحوظ رکھنی چاہئیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

تقسیم نمونہ:۔ بچوں کی تعداد کے لحاظ سے نمونوں کو اکٹھا کر کے مقررہ کے ڈبوں میں رکھا جائے لاپروائی سے نمونوں کو تقسیم کیا جائے گا تو ان کی وقعت بچوں کی نظروں میں نہ رہے گی۔

تمہید:۔ تمہید میں ایسے سوالات کئے جائیں جن سے گذشتہ سبق کی ایسی باتیں طلباء کے ذہن میں ابھر آئیں جن سے کہ وہ نئے سبق کو سمجھ سکیں۔

وقت:۔ نمونوں کے مشاہدہ کے لئے طلباء کو کافی وقت دیا جائے تاکہ ان کو اظہار مسرت و استعجاب کے لئے موقع مل سکے۔

جانچ:۔ مشاہدہ کے بعد مدرس سوالات سے جانچ کرے کہ طلباء نے کیا مشاہدہ کیا ہے اس کے بعد ان کی توجہ ان چیزوں کی طرف

مبذول کرائے جن کو انھوں نے غور سے نہیں دیکھا ہے۔

مقابلہ:۔ مقابلہ کرتے وقت مدرس عقل سلیم سے کام لے راست تجربے اور حقیقی مشاہدے مضحکہ خیز اور ضرر رساں ہوتے ہیں مثلاً کتے اور بلی کا مقابلہ بچھو کے زہر کا تجربہ وغیرہ۔

بچوں کے سوالات:۔ دوران سبق میں بچوں کو سوالات کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ سبق کے اختتام پر بچوں کو اس کی اجازت دی جائے۔

خاکے:۔ بچوں کو چاہیئے کہ اپنے مشاہدہ کو بذریعہ خاکہ ظاہر کریں۔ زبانی اور تحریری طریقہ پر بھی اظہار کیا جا سکتا ہے۔

مدرس:۔ مدرس کا برتاؤ ہمدردانہ ہو۔ اس کی زبان سادہ اور سلیس ہونی چاہیئے، آواز بلند تاکہ تمام طلبا سن سکیں۔ مدرس کو اس مضمون سے حقیقی دلچسپی اور ذاتی مشاہدہ کی خواہش ہو۔

سوالات:۔ مختصر واضح اور جماعت پر منقسم ہونا چاہیئے۔

جوابات:۔ مدرس کو چاہیئے کہ بچوں کے جوابات کو نہ دہرائے، جوابات مکمل اور اس طرح ادا ہوں کہ پوری جماعت کے طلبا سن سکیں۔ غیر محدود اور لاپروائی کے جوابات قبول نہ کئے جائیں۔

خلاصہ:۔ ہر چیز کے مشاہدہ کے بعد اس کا خلاصہ بچوں ہی کی مدد سے اخذ کرکے تختہ سیاہ پر لکھا جائے۔ یہ عمل جماعت سوم وچہارم کی حد تک محدود ہے۔ جماعت ہائے اول ودوم میں بچوں سے خاکے بنوا لینا کافی ہے۔

تصاویر:۔ اسباق میں عام طور پر اشیا پیش کئے جائیں اگر کوئی دشواری ہو تو اس کا مصنوعی نمونہ یا تصویر پیش کی جائے جب اصل شئے میں کوئی عضو نمایاں نہ ہو تو اس کی تصویر یا خاکہ بڑے پیمانہ پر پیش کیا جائے۔ جو مدرس خاکہ جلد اور اچھے نہیں بنا سکتے ان کے لئے مناسب ہوگا کہ ایسے خاکہ جات پہلے ہی تیار کرلیں۔

اعادہ:۔ صرف ایسے حصوں کو دہرایا جائے جس میں بچوں کو معلومات بہم پہنچائے گئے ہیں۔

اسکیم مرتب کرنے کے اصول:۔ (۱) اسباق کا انتخاب استعداد جماعت اور میقات کا لحاظ کرتے ہوے بتدریج ہو۔ (۲) جہاں تک ممکن ہو اشیا حقیقی مہیا کئے جائیں۔ (۳) سامان اور اشیاء کا انتخاب موسم واری ہو تاکہ اشیاء کا راست مشاہدہ کیا جاسکے۔ (۴) ہر شئے کا اس کے ماحول ہی میں مشاہدہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ (۵) قدرت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے سبق کا انتخاب کیا جائے۔ (۶) مقامی نوعیت کے تحت اشیاء کا انتخاب ہو۔ (۷) مشاہدہ کے لئے مخصوص مواقع کا استعمال ہو۔ مثلاً سورج گرہن کا وقت اور پرندوں کا نقل مقام وغیرہ کا زمانہ۔

اسباق الاشیا:۔ اسباق الاشیا کا مقصد بچوں کو طریقۂ مشاہدہ کی تعلیم دینا اور ان کی قوت اظہار میں اضافہ کرنا ہے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے بچوں کو کوئی چیز دی جاتی ہے اور وہ اس کے متعلق اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ اس کی تعلیم کے چند نقائص (۱) مشاہدہ کے لئے جو اشیا پیش کی جاتی ہیں اُن میں یہ لازمی نہیں کہ جانوروں، پودوں، اور مناظر قدرت کا مشاہدہ کیا جائے بلکہ بے جان اشیا اور مصنوعات کا بھی مشاہدہ کرایا جاتا ہے مثلاً تختی، چاقو، سکے وغیرہ۔ ۲۔ اسباق بے ترتیب ہوا کرتے ہیں مثلاً ایک سبق گائے پر دوسرا سکہ پر تیسرا ببر پر وغیرہ۔

تنقید و تبصرہ

(۱) ہندوستان میں مادری زبان کی تعلیم :۔ مصنفہ ڈبلیو۔ ایم رائبرن ایم اے و عبدالمجید خاں بی اے منشی فاضل اکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ قیمت ۱۲؍ کلدار۔

یہ کتاب دراصل اسی نام کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ انگریزی کتاب پادری رائبرن صاحب نے لکھی ہے اور اس کا ترجمہ عبدالمجید صاحب نے اُردو میں کیا ہے اُردو کتاب دونوں کے نام سے شائع کی گئی ہے انگریزی کتاب کی طرح اس کا ترجمہ بھی مبتدیوں کے لئے چنداں مفید نہیں البتہ جن لوگوں نے اردو زبان کی تعلیم پر ابتدائی کتابیں (ایسی کتابیں جو صرف پرائمری مدرسین کے لئے لکھی گئی ہیں) پڑھی ہیں اُن کے لئے اس میں غور و خوض کے لئے کافی مواد موجود ہے۔ لکھنا سکھانا ہجے سکھانا اور نظم سکھانا کے ابواب خاص طور سے دلچسپ اور مفید بنائے گئے ہیں۔ ان میں جو طریقے بتائے گئے ہیں وہ جدید نفسیات اطفال کے مطابق اور حد درجہ مفید ہیں۔ جدید رجحانات تعلیم مثلاً کھیل اور منصوبہ کے ذریعہ اُردو سکھانے میں جو کام لیا جاتا ہے وہ دلنشیں طرز میں واضح کیا گیا ہے۔ البتہ ہمیں شاعری سکھانے پر اعتراض ہے۔ شاعری سکھانے کے متعلق لاک نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اس زمانہ میں بھی درست ہے۔ چنانچہ جس طالب علم میں قدرت نے شاعری کا ملکہ ودیعت نہیں کیا اس کو شاعری کی تعلیم دینا سعی لاحاصل ہے اور جو طبع موزوں رکھتے ہیں اُن کو شاعری کی تحصیل سے کچھ حاصل نہیں۔ کیونکہ نہ تو شاعری ذریعہ معیشت ہے اور نہ ذریعہ عزت۔

ترجمہ سلیس اور سادہ ہے اور کتاب دلچسپ اور مفید ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب مدرسین اُردو کے لئے عموماً اور نارمل اسکولوں کے لئے خصوصاً بے حد کارآمد ثابت ہوگی۔

(۲) نفسیات اور اُصول تعلیم حصہ اول :۔ از ڈبلیو ایم رائبرن ایم اے و عبدالحمید خاں بی اے منشی فاضل اکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ قیمت عہ؍ کلدار

یہ کتاب بھی رائبرن صاحب کی انگریزی کتاب Theory and Practice of Christian Education کا اُردو ترجمہ ہے جس کو لکھتے وقت بقول مصنفین "اُن مدرسین کی ضروریات مدنظر رہی ہیں جو ورنیکلر پڑھاتے ہیں یا ورنیکلر مدرسین بننے کے لئے زیر تربیت ہیں۔" اسی لئے ترجمہ کو بعض مقامات پر حد سے زیادہ مختصر کر دیا گیا ہے اور بعض مقامات پر اہم مسائل وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ مدرسین سادہ نفسیات سے واقفیت پیدا کریں اور اس واقفیت سے طلبا کو پڑھانے کے طریقوں اور مدرسہ کے کام میں عموماً مدد حاصل کریں۔ ہر باب کے اختتام پر سوالات دے گئے ہیں تاکہ کتاب مباحثہ یا اسائنمنٹوں کے لئے کارآمد ہو سکے۔

ترجمہ بڑی حد تک لفظی ہے مگر صاف ہے اور انگریزی جاننے والے عبارت کی ساخت اور لفظی ترجمہ کا خاص لطف

اُٹھا سکتے ہیں۔ البتہ صرف اُردو داں جن کے واسطے کتاب لکھی گئی ہے عبارتوں کی انگریزی ساخت کے باعث کسی قدر بے لطفی محسوس کریں گے۔

بعض اصطلاحیں من مانے طور پر استعمال کی گئی ہیں اور اُن سے وہ مفہوم واضح نہیں ہوتا جن کے لئے وہ وضع کی گئی ہیں۔ مثلاً

خود تاثری Self-Suggestion ادراک منظبط Apperception

خود تاثری قطعاً انفعالی کیفیت ہے اس کے مقابلہ میں Self-Suggestion بعض انفعالی کیفیت نہیں بلکہ اس میں فعلی عنصر موجود ہے گو فعل و انفعال دونوں شخص واحد سے متعلق ہیں اس لئے خود تاثری کے بجائے خود ترغیبی بہتر اصطلاح ہے اور یہی عام طور سے مروج بھی ہے۔ اسی طرح ادراک منضبط کے بجائے محض ادّراک بہ تشدید دال زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ ادّراک باب افتعال سے ہے اور مشارکت کے معنی دیتا ہے اور حقیقت میں ادّراک کا عمل اس وقت وقوع میں آتا ہے جبکہ ادّراکی مواد اور مدّرکہ مواد میں سابقہ واقفیت اور جدید معلومات کو پیوست کر دیا جائے۔

فی الجملہ یہ کتاب شوق پرور اور مفید ہے اور ہماری رائے میں ہر کتب خانہ کی الماری کی زینت ہونی چاہیے۔

(۳) مفتاح العربیہ الجزو الاول۔ تصنیف مولانا احمد بن ناصر العیسری استاذ اللغتہ العربیہ عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد دکن

یہ عربی کی پہلی کتاب مولانا احمد بن ناصر العیسری کی تصنیف ہے۔ جو ہندوستان کے عربی پڑھنے والے طلبا کے لئے خاص طور پر لکھی گئی ہے۔ اس پر مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج بلدہ نے فاضلانہ پیش لفظ لکھا ہے۔

یوں تو عربی کی بیسیوں بلکہ سینکڑوں ریڈریں لکھی گئی ہیں مگر یہ سب دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ ان لڑکوں کے لئے لکھی گئی ہیں جن کی مادری زبان عربی ہے یا یہ سمجھکر لکھی گئی ہیں کہ عربی زبان مثل سنسکرت اور لاطینی اور قدیم یونانی کے مردہ زبان ہے۔ مگر حقیقت ہے کہ عربی نہ تو ہندوستانی عربی خوانوں کی مادری زبان ہے نہ مُردہ ہے۔ اس حقیقت سے چشم پوشی کرنے کے باعث غیر موزوں کتابیں نصاب عربی میں داخل ہو گئی ہیں اور بچوں کے لئے وبال جان ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ عربی زبان کو زندہ زبان سمجھکر ان لڑکوں کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے جن کی مادری زبان عربی نہیں۔ مگر جدید طریقۂ تعلیم کو شروع سے آخر تک پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ابتداءً اُن لفظوں سے کام لیا گیا ہے جو ہندوستانی اور عربی میں مشترک ہیں۔ اس وجہ سے عربی زبان غیر مانوس نہیں رہی۔ سوال و جواب کے ذریعہ مشق زبان میں بے حد سہولت پیدا کی گئی ہے۔ اور قواعد عربی جس کی تعلیم نے "بہت سے عربی خوانوں کو عربی زبان و ادب کی تحصیل سے بے زار کر دیا ہے"۔ اب مالا بُد نہیں رہی۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب موجودہ کتب درسیہ عربی کے مقابلہ میں افضل ہے اور اگر عربی کی تعلیم تحتانیہ سے شروع کی جائے تو عدیم المثال ہے۔

اداریہ

حیدرآباد ٹیچر کی اسی اشاعت میں ہم ہز اکسلنسی کرنل نواب حافظ سر احمد سعید خاں بہادر کے ۔سی۔آئی۔ای؛ کے سی۔ایس۔آئی حال صدر اعظم ممالک محروسہ سرکار عالی کی وہ تقریر شائع کرتے ہیں، جس کے ذریعہ ممدوح الشان نے بتاریخ ۱۲ آبان ۱۳۵۰ف طلبا، جامعہ کو مخاطب فرمایا۔ ادھر سال دو سال سے جامعہ کے طلبہ اور ان کے ضبط و تادیب کی اصلاح کے بارے میں مختلف تقریریں ہم مختلف پلیٹ فارم سے سن چکے ہیں اور مختلف مکاتیب خیال کی آرا بھی دیکھ چکے ہیں۔ اعمانی اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی علی العموم اظہار خیال کیا جاچکا ہے۔ مگر ہز اکسلنسی امیر جامعہ کا خطاب انداز بیان، ندرت اور جامعیت کے لحاظ سے اور ہی چیز ہے۔ اس تقریر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شروع سے آخر تک یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ایک بڑا بھائی نہایت شفقت اور مودّت کے ساتھ اس عظیم الشان برادری کو مخاطب کر رہا ہے اور بہ لطایف الحیل ان کے فلاح و بہبود کی تدبیریں سوچ رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"میری تقریر سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں آپ کو نصیحتیں کرنے آیا ہوں میں تو صرف اپنی زندگی کے دور یاد کرنا چاہتا ہوں۔"

گو سر صدر اعظم بہادر کا ایک ایک لفظ شفقت، محنت، ہمدردی اور نصیحت کا حامل ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اگر اساتذہ اور طلبائے ہند ان نصیحتوں پر عمل کریں تو ان کو فلاح دارین حاصل ہوگی۔

آگے چل کر نفسیات شباب کے بارے میں ہز اکسلنسی ارشاد فرماتے ہیں۔

"اگر ہمارے جذبات کی تکمیل نہ ہوئی تو ہم ساری دنیا کو نااہل سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لئے

اگر آپ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ غلطی اور صحت محض اضافی چیزیں ہیں اوران کا دار و مدار
صرف آپ کے نقطۂ نظر پر ہوتا ہے اس لئے یہ خیال کر لینا کہ ہماری رائے ہی صحیح تھی غلط ہے۔"
ہمیں یقین ہے کہ ہز اکسلنسی صدر اعظم بہادر کی یہ شفقت بھری تقریر جو جامع، مدلل، اور نفسیات پر مبنی تھی اپنا اثر دکھائے گی ع

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ فی زمانناتعلیم پر جس قدر زور دیا جا رہا ہے اتنا سنین ماضیہ میں کبھی بھی نہیں دیا گیا۔ قدیم نظرئے مسترد ہو چکے اور ہر قسم کی جدید تحریکات منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اور اب پہلے سے کہیں زیادہ تعلیم کو اہمیت حاصل ہے مگر تربیت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے تعلیم کا لفظ جب کبھی زبان پر آتا ہے تو خود بخود تربیت کا خیال بھی آجاتا ہے۔ ان دونوں کا گہرا تعلق آپس کا ہے۔ کوئی تعلیم بغیر تربیت کے قدر و منزلت نہیں رکھتی۔ ایسی تعلیم جو صرف علم اور خواندگی کی حد تک محدود ہو اور اعلیٰ کردار کے انسان پیدا نہ کرے کسی قوم اور ملک کی ترقی کا باعث نہیں ہوسکتی۔ ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ کم سے کم ہندوستان میں تعلیم کے اس اہم اور لاینفک جز یعنی تربیت کا فقدان ہے اور نہ مدرسین ہی اعلیٰ شخصیتوں کے حامل ہیں۔ مدرس کا وہ روایتی مرتبہ جب کہ ہر چھوٹا بڑا اس کے آگے زانوئے ادب تہ کرتا تھا کبھی کا رخصت ہو چکا۔ اس بارے میں ہز اکسلنسی امیر جامعہ کا صرف ایک اور نہایت ہی بلیغ جملہ اس قابل ہے کہ طلبہ اور اساتذہ اسے حرز جاں بنائیں۔

"تعلیم کا مقصد تہذیب نفس اور تہذیب نفس کا مقصد آزادی کا صحیح استعمال ہے۔

یہ ہے ہماری تعلیم کا مقصد اور یہی ہے زندگی کا مآل کار جس کے لئے ہم کو ساعی رہنا چاہئے۔ خدا کرے کہ ہمارے امیر جامعہ کے نمونہ نیک پر جامعہ کے طیلسانین چلیں اور ان کے ارشادات عالیہ کو مشعل ہدایت بنائیں۔

جلد ۱۶ شمارہ ۲

زیر سرپرستی جناب سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔ اے (کنٹب) ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

صدر انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

کا

سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت

سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسئول۔ عبد النور صدیقی بی۔ اے بی۔ ٹی (علیگ)

سعید الدین خاں بی۔ اے ڈپ ایڈ (عثمانیہ)۔ ملا فخر الحسن۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ آذر لغایۃ بہمن ۱۳۵۱ف

فہرست مضامین

جلد (۱۶) شمارہ (۲)

منصوبی طریقۂ تعلیم

از

جناب مولوی عبدالرزاق صاحب ٹی۔ڈی اول مددگار مدرسہ
وسطانیہ سلطان بازار حیدرآباد دکن

سب سے پہلے ہم کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ منصوبی طریقہ تعلیم کیا ہے ؟ اور اس کا موجد کون ہے : پروفیسر ڈیوی نے اس طریقہ کو دریافت کیا ہے ۔ اس کی ایک سیدھی سادھی تعریف یہ ہے کہ چند طلبا ، باہم ملکر کسی ایسے کام کے کرنے کی از خود خواہش ظاہر کریں جو ان کے ماحول وضروریات مقامی کے لحاظ سے باعث دلچسپی ہو۔ تاکہ بالآخر وہ اپنے ارادہ اور کام سے اچھے نتائج اخذ کرسکیں ۔ اگر کوئی مدرس اپنی خواہش ظاہر کرتے ہوئے طلباء کو اس کام کے لئے مجبور کرے تو اس کا مطلب فوت ہو جاتا ہے ۔ بچوں کا مقصد خود پیدا ہو وہ تدبیر کریں اور عمل کریں اور تصفیہ کریں اور مدرس کبھی بحیثیت ایک عقلمند دوست اور رہنما کے اُن کی رہبری کرے ۔

سب سے پہلے یہ پروجکٹ امریکہ میں جاری ہوا اُس کے شاندار نتائج اور عام دلچسپیوں کے باعث یورپ میں بھی اور جہاں جہاں انگریزی بول چال کا رواج تھا اس نے اپنا گھر کرلیا۔ ہندوستان میں بھی بلحاظ حالات مقامی اس میں حسب ضرورت ترمیمات کرکے عمل پیرا ہونے کی کوششیں کی گئیں ۔ پروفیسر کلپیٹرک (Kill Patrick) نے اپنی کتاب (How to learn) کے سولھویں باب میں اس طریقہ تعلیم کے ہر پہلو پہ نظر ڈالی ہے ۔ منصوبی طریقۂ تعلیم زیادہ تر طبقۂ تحتانیہ کے لئے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے ۔ طبقۂ وسطانیہ وفوقانیہ میں بہ لحاظ استعداد طلباء اس کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے ۔ نیز مضامین نصاب کی بہتات سے اس کا چلانا دشوار بھی ہو جاتا ہے ۔

پروجکٹس کی تقسیم مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔ ہم اپنے مقصد کے لحاظ سے ان کو بڑے اور چھوٹے پروجکٹس میں تقسیم کرتے ہیں۔ بڑے پروجکٹس ایک جماعت کو ایک میقات یا ایک سال مشغول رکھتے ہیں اور وہ مدرسہ کی تمام تدریس کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اس کے لئے ایک پروگرام مرتب کرلیا جاتا ہے۔ چھوٹے پروجکٹس اس کے برعکس ہیں یعنی وہ ایک دن یا ایک ہفتہ یا ایک مہینہ میں ختم کئے جاسکتے ہیں اور ان کو مدرسہ کے تمام کام کا مرکز نہیں بنایا جاتا۔

منصوبی طریقہ تعلیم کے لئے ہم کو زیادہ اخراجات برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ خود ہم کو غیر ملکی کھلونے و دیگر آلات تعلیمی کے خریدنے سے احتراز اس لئے بھی کرنا چاہیئے کہ وہ ہمارے ضروریات مقامی کے تحت نہیں ہوتے۔ دیہاتی مدرسہ کے لئے مٹی و پتھر روئی یا سَن اور تخم ہر قسم کے گھونگے کنکر جھاڑو کی تیلیاں۔ خالی دیا سلائی وغیرہ سے مطلوبہ سامان بنالیا جاسکتا ہے۔ مدارس شہری کے لئے کئی چھوٹے پروجکٹس کے تحت مختصر سامان فراہم کرنا ہوگا جیسے ردّی کی ٹوکری کے لئے موٹا استعمال شدہ کاغذ و مقوہ اور خالی ریل وغیرہ سے کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی قسم کے دیگر مفید کارآمد چیزیں حسب خواہش بنائی جاسکتی ہیں جس کا طلبائے منصوبہ کیا ہو۔

نصاب تعلیمی کے لحاظ سے بھی مختلف پروجکٹس تجویز کئے جاسکتے ہیں۔ جیسے تاریخی وجغرافیائی پروجکٹس۔ حسابی پروجکٹس۔ ادبی پروجکٹس۔ باغبانی پروجکٹس و دیگر تفریحات جیسے سیر و تفریح کے چشم دید حالات کا قلمبند کرنا۔ دوکانداری پروجکٹ۔ جلسہ سالانہ مدرسہ و والدین و سرپرستوں کی دعوت۔ نمائش کا انعقاد۔ وغیرہ۔

تاریخی منصوبی طریقہ تعلیم میں طلباء تدریجاً ہر زمانہ ماسبق سے بحث کرتے ہوئے ہر ایک عہد کے خصوصیات و ترقیات پر غور کریں گے۔ ان میں ان کا واحد منشا یہی ہوگا کہ متقدّمین سے متاخّرین نے کس حد تک تمدّن و معاشرت میں ترقی کی ہے اور دنیا ان کے برکات سے کہاں تک فیض یاب ہورہی ہے۔ وہ کونسے امور ہیں جن سے متاخّرین نے متقدّمین سے سبق حاصل کیا۔ تاریخی واقعہ کے ساتھ جغرافیائی معلومات بھی بہم پہونچائے جاتے ہیں جیسا کہ کسی جنگ کی حالت بیان کرنے کے لئے اس کا محل وقوع اچھی طرح ذہن نشین ہونے کے لئے جغرافیہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ ادب کی درسی کتب میں تاریخ کا کوئی سبق ہو تو اس سے بھی ارتباط

پیدا کیا جاسکتا ہے۔

منصوبی طریقہ میں کسی بادشاہ کے ذکر سے اس کے بہادری وشجاعت وفیاضی وسخاوت وعام رواداری وہمدردی یا اس کے ظلم وتعدی وعیش پرستی کی وجہ ملک سے غفلت وتباہی کا حال معلوم کرکے اس کے نتائج پر طلبا کو غور کرنے کا موقع ملتا ہے مثلاً حضرت آصف جاہ اول کے عہد میمنت میں کیا کیا اہم واقعات رونما ہوئے اس کا نموتاً ایک خاص مقصد قرار دے کر طلبا کو جوابات تلاش کرنے کے لئے کہا جائے اور مدرس رہنمائی بھی حسب ضرورت کرے تو طلبا کو اس قسم کے مسائل کے جواب کا مقصد محسوس کرانے میں یہ فائدہ ہے کہ جس معیار پر طلبا اس مقصد کا احساس کرتے ہیں اس حیثیت سے وہ زیادہ محنت سے کام کریں گے اور ان سوالات کے جواب دینے میں وہ زیادہ کامیابی کا ثبوت دیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مقصد قرار دے کر وہ کچھ حاصل کریں گے۔ جس کے ذریعہ اپنی جستجو اور تجسس کو وہ اور زیادہ تیز کرسکیں گے اور عقدہ کشائی کی بہترین تنظیم پیدا ہوگی اور نتائج بھی اچھے برآمد ہوں گے۔ طلبا غور وفکر سے کسی مسئلہ کے ایک جزو کو دوسرے متعلقہ اجزا سے ربط دینے کے عادی ہوجائیں گے۔ اس طرح میدان تحقیق میں وہ بہت ہی مفید نقشہ تیار کرسکیں گے۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ ان کی ایسی کوششوں میں دلچسپی کا احساس اور محصلہ علم کو بہتر طریقہ پر یاد کرنے اور سمجھنے کا موقع ملے گا۔

حسابی پروجکٹس میں ہم کو اقلیدس وجبر ومقابلہ کا باہمی ارتباط ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ علم حساب اور جبر ومقابلہ واقلیدس میں طلبا ان کو مربوط نہ رکھنے میں غلطی کریں گے جبر ومقابلہ واقلیدس کو تو جماعت مڈل کے طلبا ایک قسم کا بار سمجھتے ہیں۔ اس لئے مدرس صاحب متعلقہ کو ایک ایسا پروگرام قبل از قبل مرتب کرلینا چاہیئے جس سے کہ ارتباط نظر انداز نہ ہو۔ حساب سے روزمرہ کی زندگی کا کہاں تک تعلق ہے اس کو مقصد اولین قرار دے کر منصوبی طریقہ کا آغاز کیا جائے تو بڑی حد تک کامیابی ہوسکتی ہے۔ اور حساب کو طلبا جو ایک خشک مضمون تصور کرتے ہیں بڑی حد تک وہ اپنے ان ارتسامات کو دور کریں گے اور ان کے ضروریات زندگی اور دنیاوی کاروبار میں حساب ایک جزو لاینفک ثابت ہوگا۔ زمین کے پیمائشی

کام و بلند مقامات اور بلند عمارات کی پیمائش کے طریقوں سے وہ واقف ہو جائیں گے تو اس سے وہ ریاضی کی قدر و قیمت کے دل سے مُقر ہوں گے اس لئے ضروری ہے کہ طلبا کو عملی تعلیم جو مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر ہو حتی الوسع دی جائے۔ جس سے منصوبی طریقۂ تعلیم کی تکمیل ہوتی ہے۔

جماعت صغیر و اول کے طلبا کو حساب کی تعلیم پروجکٹ کے تحت آسانی سے دی جاسکتی ہے۔ جیسے جماعت میں کل کتنے لڑکے ہیں؟ ان میں سے کتنے حاضر اور کتنے غیر حاضر اور کتنے بیمار ہیں؟ کھیل میں اعداد شمار کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً صف اول میں کتنے لڑکے ہیں اور دوسری صف میں کتنے گن کر بتاؤ، کہا جاسکتا ہے۔ قصہ گوئی میں قصہ کے متعلقہ اشخاص کی تعداد معلوم کرنے کی صلاحیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ دستی مشاغل کے گھنٹہ میں کتنے لڑکوں نے اچھے نمونے بنائے اور کس کے نمونے خراب ہیں علحدہ کر کے شمار کرایا جاسکتا ہے۔ اس طرح آسان جمع و تفریق طلبا کھیل کھیل میں سیکھ لیتے ہیں۔ سوالات کی نوعیت بدلتے رہنے سے طلبا کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔

دوسری جماعت سے چہارم جماعت تک دوکان داری کا پروجکٹ تیار کیا جاسکتا ہے ذیل میں جماعت دوم کے لئے ایک نمونہ دیا جاتا ہے۔ مثلاً حساب کے مدرس صاحب نے اگر طلبا سے کہہ دیا کہ کل تم ایک دوکان کو جو مدرسہ کے راستہ میں ہے مدرسہ سے جاتے ہوئے دیکھ کر گھر جاؤ اور اپنی یاد سے جو کچھ تم کو اچھا یاد ہو لکھ ڈالو اور کاپیاں مدرسہ لے آؤ۔ اس سے بچّوں کے مختلف دلچسپیوں کا علم ہو سکے گا۔ بچوں کو اس سے قبل جن سکہ جات سے واقفیت تھی اس میں مزید بڑے سکّوں سے واقفیت پیدا کی جائے گی۔ بچوں کو روپیہ کے چلّر وغیرہ حاصل کرنے کا علم کرایا جائے گا۔ مقوہ پر سفید پنی لگا کر دوانّی کے برابر کاٹ لیا جائے اور اس پر ۲ر لکھ دئے جائیں۔ دوانّی کے معاوضہ میں ایک انّی اور چھ پیسے دئے جائیں تاکہ خریدی میں سہولت ہو۔ اب طلبا سے ان کے خرید کردہ مرغوب چیزوں کے متعلق پوچھا جائے کہ ایک گیند کی قیمت ۹ پیسہ ہو تو ۱۲ گیند کی کیا قیمت ہوگی؟ اسی طرح سوالات کا معیار بڑھا کر دوسری جماعت میں ضرب اور تقسیم کی مشق کرائی جائے۔ آسان جمع سکھانے کے لئے ایک مقام جو نزدیک ہو اس کا فاصلہ بچوں کو چلتے وقت اپنے قدم گن کر یاد رکھنے کی تاکید کی جائے تو ہو سکتا ہے۔ جب لڑکے کچھ بڑی جمع کرنے کے عادی

ہوجائیں تو بازار سے متعلق بھی جمع کے عبارتی سوالات دے کر مشق کرائی جائے۔ جیسے سلطان بازار کے چوراہے کے پاس سے ۱۵۰ ہندو اور ۲۴ مسلمان اور ۷۵ عیسائی کسی جلسہ کی تقریب میں جارہے تھے تو بتاؤ کل کتنے لوگ جا رہے تھے؟ اسی طرح اس بازار کے دوکانات میں مختلف مذاہب کے لوگ تجارت کرتے ہیں جن میں ۹۹ مسلمان اور ۷۵ ہندو اور (۶۰) پارسی ہوں تو بتاؤ کتنے لوگ دوسرے مذاہب کے ہوں گے؟ اسی طرح ایک پولیس کانسٹبل اوسطاً فی گھنٹہ سڑک پر (۵۰) موٹر اور (۱۵۰) سیکل کو سائڈ بتاتا ہے تو (۳) گھنٹوں میں سڑک پر سے اوسطاً کتنی موٹر اور سیکل گذریں گی؟ وغیرہ۔ اس سے بچے خوشی خوشی جوابات کے حل کرنے میں حصہ لیں گے اور ہمارا مقصد حاصل ہوگا۔

مٹھائی کی دوکان سے بھی طلباء اپنے حسابی معلومات میں جمع و ضرب کے اصول سے اچھی طرح واقفیت پیدا کرسکتے ہیں۔ مدرسہ میں نوشت و خواند کے اشیاء کی دوکان یا کھلونے کی دوکان کھولی جاسکتی ہے۔ جماعت میں ۲/۴ر کے شیرز (حصص) مقرر کرکے سیونگ بنک کھولا جاسکتا ہے۔ مدرس صاحب خزانچی ہوں اور بچے خود اپنی جمع و خرچ کا حساب ایک رجسٹر میں کیا کریں۔ اس کے لئے انھیں اب رقمی ہندسوں کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ ہر ایک لڑکے کی جمع شدہ رقم کے لئے ایک ایک صفحہ مختص کرنا چاہیئے جس میں وقتاً فوقتاً آمدنی کا اندراج ہوگا۔ اس طرح روپیہ جمع ہونے کے بعد مقامی دوکان دار سے سامان کے خریدی کے متعلق طلباء واقفیت حاصل کریں۔ دوکان دار تاجروں کے لڑکے اگر کوئی ہوں تو اس کے لئے منتخب کئے جائیں چونکہ وہ تجارتی ماحول میں رہتے بستے ہیں۔

لڑکے کسی دوکان سے سامان فراہم کرنے کا کھیل کھیلیں۔ کسی تھوک فروش سے چیزیں منگانے کا آرڈر بچے تیار کریں اور حساب لگائیں کہ ان اشیاء کے منگانے میں کس قدر روپیہ دینا پڑے گا۔ اپنی کاپیوں میں وہ اشیاء کا آرڈر لکھ لیں۔ اس آرڈر کے ذریعہ سے بہت سے سوالات حسابی بنا کر طلباء سے حل کرائے جائیں۔ اس سے منصوبی تعلیم کا منشاء پورا ہوسکتا ہے۔ طلباء اشیاء کی ایک فہرست بھی بنالیں اور ان کی قیمتیں دریافت کرکے ہر چیز کے محاذی اس کی قیمت کا اندازہ درج کریں تاکہ آرڈر کی روانگی کے وقت ان کو حسب گنجائش

سامان کے انتخاب میں سہولت کا باعث ہو۔

اس کے بعد طلبا کو لکھنے، روپیہ جمع کرنے اور تفریق کرنے کے جانب زیادہ توجہ کی جائے۔ لین دین میں اصلی سکّے استعمال کئے جاسکتے ہیں لیکن بنظر سہولت مقوہ کے سکے بھی مناسب رنگ وجسامت وشکل کے بنالئے جاسکتے ہیں۔ طلبا کی اس کام میں رہبری بھی کی جائے۔ اس کام سے دستی مشاغل کی بھی ضمنی طور سے تعلیم ہوجائے گی۔ ڈرائنگ کے ذریعہ طلبا دوکان داری کا نمونہ بنائیں اور کلے ماڈلنگ سے بھی اس کو واضح کریں تو دلچسپی کا باعث ہوگا۔ باقاعدہ دوکان کے چالو کرنے سے قبل طلبا کو تولنا اور ناپنا سکھایا جائے۔ مدرس صاحب کو پیمانہ و اوزان وترازو فراہم کرنا ہوگا۔ بچے ریت، کنکر اور پتھر باری باری سے تول لیں اور اس کی مشق کریں۔ اس سلسلہ میں روپیہ کے آنوں سے متعلق طلبا کو گر بتائے جاسکتے ہیں۔ جیسا کہ ایک روپیہ کو ایک سیر گھی ملتا ہو تو ایک آنہ میں ایک چھٹانک آئے گا۔ اس طرح چلتر فروشی میں جلد حساب لگانے کی مشق انہیں ہوجائے گی۔ جو بچے اس کام میں اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کریں مدرس صاحب متعلقہ کو چاہئے کہ خریدی اشیاء کے وقت ان کو اپنے ہمراہ لے لیں بشرطیکہ مقامی دوکان دار سے سامان خریدا جائے۔ اگر بہ ذریعہ ڈاک سامان منگوانا ہو تو انہی طلبا سے آرڈر کے لکھنے اور پتہ میں خط ڈالنے کا کام لیا جائے۔ خرید کردہ سامان جماعت کے حوالہ کرکے ہر نوٹ بک میں قیمتیں لکھی جائیں۔ دوکان پر بیٹھنے والوں کا انتخاب ان کے استعداد کے لحاظ سے کیا جائے۔ ہر ایک کے پاس فروخت کرنے کی ایک کاپی ہونی چاہئے جس کا نمونہ حسب ذیل قرار دیا جاسکتا ہے۔

نمونہ بیاض دوکان داری

مجموعی سامان	پوری قیمت	قیمت فی	مقدار فروخت شدہ	قیمت وصول شدہ	باقی سامان
پنسل ۶۰ درجن	عـــہ/	۲ر فی درجن	۳۶	۲/ ـــہ	۳ درجن
کاغذ ۵ دستہ	ہ/	ہر فی دستہ	۳ دستہ	۱۲ر	۲ دستہ
اس قسم سے اندراجات ہونگے۔					

جب دوکان کے کاروبار عمدگی سے چلنے لگیں تو کوئی تاریخ و مہینہ مقرر کر کے والدین اور احباب کو بلایا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے طلبا کو مہینوں کے نام ہفتوں کے دن سے واقف کرایا جائے گا۔ دو ہفتہ یا ہر ہفتہ میں دوکان داری کے لئے بعد از اوقات مدرسہ ایک گھنٹہ مقرر کر کے کاروبار کئے جاسکتے ہیں۔ فروخت کے بعد حسابات احتیاط سے رکھے جائیں۔ اور اس کی جانچ پڑتال طلبا ہی کریں۔ سامان کا شمار کر لیا جائے اور فروخت شدہ اشیاء کا فہرست سے مقابلہ کر لیا جائے۔ مجموعی میزان کو نئے سامان میں دوبارہ درج کر لیا جائے۔ اور نئے اور باقیماندہ سامان کو نئے صفحہ پر لکھا جائے۔ اور اُن کی قیمتیں بھی درج کی جائیں۔ جب یہ کاروبار اطمینان کے ساتھ چل نکلیں اور دوکان بند کرنا مقصود ہو تو مجموعی منافع جمع کر کے طلبا میں اصل رقم حصص کی واپسی کے ساتھ منافع کو بھی تقسیم کیا جائے۔ بغیر منافع کے بھی کاروبار کئے جاسکتے ہیں۔ اس مقصدی طریقہ سے طلبا میں حساب کا روزمرّہ کی زندگی سے کتنا گہرا تعلق۔ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گا۔ اور آئندہ زندگی میں ان کے لئے ایک خاص دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اس کے علاوہ طلبا میں اس خرید و فروخت سے چند آسان اعمال کی صلاحیت پیدا ہوگی اور وہ ایسی چیزوں سے مانوس ہوں گے جن کو وہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً پنسل گرا لفائٹ سے تیار ہوتا ہے۔ کاغذ کے بنانے کے متعلق طلبا کی درسی کتاب اردو میں جو مضمون ہے اس سے مدرس صاحب متعلقہ روشناس کرائینگے۔ طلبا اپنے شہر کی پیداوار کا مقابلہ دوسرے شہروں سے کرنا بھی سیکھیں گے۔ اور تجارتی ممالک سے بھی واقفیت ہوگی۔ جس سے جغرافیہ کی ضمنی طور پر تعلیم ہو جائے گی۔ بازاری لین دین کے حساب کی خاص مشق ہو جائے گی۔ بول چال کی بھی عادت ہوگی۔ نیز اشتراک عمل مطلوبہ خاص نتائج کے متعلق تدابیر کرنے کا تجربہ اور اس کے لئے لامتناہی کوشش کرنا دیانت اور امانت داری سے کاروبار چلانا طلبا سیکھیں گے جس سے ان کی اخلاقی تربیت کا ایک ذریعہ نکل آتا ہے۔

اسی طرح مدرسہ میں باغبانی پر وجکٹ آغاز کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے مدرسہ میں جب کہ سال گزشتہ مدرسہ یہاں منتقل ہوا۔ اور مدرسہ کے شایان شان کوئی باغ نہیں تھا اور اتنی بڑی عمارت سنسان نظر آنے لگی تو مولوی رونق علی صاحب مدرس جنہیں اس کام سے انتہائی

شغف ہے حسب ایما جناب صدر مدرس صاحب طلبا مدرسہ سے باغبانی پروجکٹ کے شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تمام طلبا متفقہ طور پر ہم آہنگ ہو کر مولوی صاحب موصوف کے ہاتھ بٹانے کے لئے تیار ہو گئے۔ بس اس کا ایک پروگرام تین ماہ کا مرتب کیا گیا۔ مٹی کے گملوں کا طلبائے آرڈر مرتب کیا۔ گملے مہیا کئے گئے اور طلبا خوشی خوشی سے مختلف قسم کے پودے اور درخت کے قلمیں و تخم جمع کرنے لگے۔ اوقات مدرسہ کے بعد درختوں کے لگانے اور پانی دینے میں مشغول رہتے۔ چونکہ طلبا کو کھاد وغیرہ کے طریقوں سے ناواقفیت تھی اس سے انہیں واقف کرایا گیا۔ بعض طلبا دوپہر کے وقت پودوں کو پانی دیتے تھے انہیں رہبری کی گئی کہ دھوپ کے وقت پانی دینے سے پودوں کو بجائے نفع کے نقصان پہنچتا ہے اس طرح انہیں نباتات کے متعلق صحیح طریقہ پر سینچنے کا علم ہو گیا۔ طلبا نے یہ بھی سیکھا کہ جڑوں اور پتیوں کا کیا عمل ہوتا ہے اور یہ کہ پودوں کو غذا اور روشنی اور ہوا کی ضرورت ہے۔ پودوں کی نشو و نما کے لئے جس غذا کی ضرورت ہوتی ہے وہ عموماً مٹی میں موجود رہتی ہے۔ اسے رقیق بنانے کے واسطے پانی کی ضرورت ہے۔

باغ کے ایک مالی کے ساتھ جو باغبانی سے واقف نہ تھا طلبا نے اپنی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مدرس صاحب متعلقہ کی رہبری میں کام کیا اور اپنے درختوں اور پودوں کو رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ اور ان کے تدریجی نشو و نما کو اپنی نوٹ بک میں قلمبند کرتے گئے۔ ہر ایک جماعت کو مسابقت کا خیال پیش نظر رہا اور اس طرح تمام مدرسہ کو انہوں نے گلزار بنا دیا۔ مدرسہ کا شمال رویہ گوشہ بالکل ناگفتہ بہ حالت میں تھا۔ ایک فضائی جماعت کے قیام کا مسئلہ ان کے پیش نظر ہوا۔ سب سے پہلے انھوں نے ڈرائنگ سے ایک خاکہ بنا لیا۔ اور مدرس صاحب کے زیر نگرانی پیمائش کی۔ اور کیاریوں کو مناسب طریقہ پر تقسیم کر لیا۔ اس کام میں اقلیدس کی تعلیم کو طلبا عملاً مفید تصور کرنے لگے۔ اس کے بعد ہری گھاس جمانے کا قصد ہوا۔ طلبا نے رود موسیٰ کے کنارہ بہت سی ہراول دیکھی بالآخر کچھ دنوں کے لئے مزدور اس کے کھدوائی کے لئے مقرر کئے گئے۔ طلبا نے روزانہ اجرت کا تصفیہ کیا۔ اور رسائد لکھ کر ان کے ابہام حاصل کئے۔ اس ضمن میں اکائی کے قاعدہ کا تصور طلبا کو دلوایا گیا۔

اور حساب سے ایک ربط پیدا کرایا گیا۔ پھر چند بنڈیاں فی چکر بہ قرار داد کرایہ مقرر کی گئیں اور گھانس کے تپتے لائے گئے۔ طلبا ہی نے کرایہ کا حساب کر کے تقسیم کیا۔ تپہ جمانے میں بڑی محنت لگی۔ بعض لڑکوں نے ناتجربہ کاری سے اپنے مفوضہ تپتے پر اچھی طرح دھمس نہیں کی تھی اس لئے ہراول خوب سرسبز نہ ہوئی۔ پھر مدرس صاحب متعلقہ نے اس کمی کو پورا کرنے کی جانب رہبری کی اور طلبا نے اپنے کام کے نقص کو محسوس کر کے پھر کام شروع کیا اور ان کی محنت جلد ٹھکانے لگی۔ اس سے چمن آرائی کا انہیں خاصہ ملکہ پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد طلبا نے چمن کے حدود بندی کی فکر کی۔ تھوڑے سے اخراجات میں جنگلہ کی تیاری ہوئی۔ اگرچہ کہ ایک نجار سے بھی کام لیا گیا۔ لیکن مینول ٹریننگ سے بھی طلبا چونکہ واقف تھے اس لئے انہوں نے بھی نجار کا ہاتھ بٹایا اور کام تکمیل کو پہنچایا۔ عملی طور سے مینول ٹریننگ کے افادہ کو طلبا نے محسوس کیا۔ جنگلہ کی طلبا نے رنگ آمیزی بھی کر لی اور درختوں کے گملوں کو بھی گیرو سے رنگ کر خوشنما بنایا۔

اس تمام آرائش و زیبائش کے بعد طلبا نے اس بات کو محسوس کیا کہ اپنے سرپرستوں اور والدین کو اپنے اس باغبانی منصوبہ کی جو بہ طریقہ احسن انجام پایا معائنہ کرائیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے سالانہ کام کی نمائش کریں۔ چنانچہ جب انھوں نے اپنا مصمم ارادہ کر لیا تو جناب صدر مدرس صاحب نے ان کے اس پروجکٹ سے اتفاق رائے فرمایا! اور جلسہ سالانہ و نمائش کے انتظامات شروع ہو گئے۔ ہر جماعت سے مختلف مشاغل و کام کے لئے حسب خواہش طلبا منتخب ہوے۔ بیانڈ نوازی کی ایک جماعت روزمرہ مشق کرتی رہی۔ لیزم کے لئے کم عمر طلبا نے اپنے آپ کو پیش کیا اور موسیقی کے ساتھ کام کرنے لگے۔ یہی طلبا نے شغل کے کام میں بھی حصہ لیا۔ اپنے لئے موزوں ڈریس علحدہ تیار کر لیا۔ پرا مڈ بنانے کے کام میں بھی طلبا نے جرات اور دلیری دکھائی۔ یہ سب کچھ کھیل ہی کھیل میں انھوں نے ورزشی مشقیں سیکھ لیں۔ نمائش کے کام میں اپنے اپنے ڈرائنگ و پنٹنگ سے ہال کو آراستہ کیا۔ مینول ٹریننگ میں خاصی دلچسپی لی۔ اور مدرس صاحب متعلقہ کی نگرانی میں فریم کا بنانا اور دیگر کار آمد اشیا تیار کرنے کی مشق کی۔ جلد سازی و پیپر کٹنگ میں خاصی مہارت پیدا کی

مدرسہ کے لئے جھنڈیاں اور "خوش آمدید" طلبا ہی نے تیار کیا۔ غرض کہ نمائش کی کامیابی میں ہر طرح کی دلچسپی و محنت کا ثبوت دیا۔

طلبا نے ایک سوشیل ڈرامہ بھی اسٹیج کیا جس کی رہنمائی مدرسہ ہی کے چند اساتذہ صاحبان ہی نے کی تھی۔ اسٹیج کی تیاری کے لئے طلبائے نے اپنے اپنے مکانات سے تخت مہیا کئے۔ اور بڑی خوبی سے اسٹیج کی آرائش و زیبائش میں اپنے اتحادِ عمل کا ثبوت دیا۔

یہ سب کچھ طلبا ہی نے کیا جن کی بروقت اعانت و رہبری ہوتی رہی۔ یکم جنوری ۱۹۴۱ء جلسہ سالانہ کی تاریخ زیرِ صدارت عالی جناب ناظم صاحب تعلیمات ملک سرکار عالی مقرر ہوئی اور طلبا اس تاریخ و روز کا بڑی شدّت سے انتظار کرتے رہے۔ بالآخر جب جلسہ تاریخ و روز مقررہ پر منعقد ہوا، طلبا و مدرسین صاحبان نے ایک ہی بلو یونیفارم میں جلسہ میں شرکت کی۔ طلبا نے اپنے ورزشی مظاہروں سے حاضرین کو بہت محظوظ کیا۔ شعبہ واری انعامات مستحق طلبا کو تقسیم کئے گئے اور جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ اس طرح طلبا نے اپنا دلچسپ پروجکٹ کامیابی سے ختم کیا۔

ڈاکٹر ڈیوی کا قول ہے کہ جب ایک طالب علم عمل کرکے سیکھتا ہے تو وہ دماغی اور جسمانی طور پر بعض تجربات کو زندہ کرتا ہے جو ان کے لئے اہم ثابت ہوتے ہیں۔ وہ وہی دماغی اعمال کرتا ہے جو ابتداءً ان چیزوں کے کرتے وقت پہلے پہل انسان نے کئے تھے کیونکہ اس نے خود کیا ہے وہ ان کے نتائج کی اہمیت جانتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کسی واقعہ کا ذکر اس کی اہمیت کو نہیں ظاہر کرتا نہ اس کے اصلیت کے مفہوم کو نہ اس امر کو کہ یہ ایک یہ حقیقت ہے جب تک کہ وہ ذاتی طور پر تجربہ نہ کرلیں بچے جب کتابی واقفیت حاصل کرتے ہیں ہر واقعہ اپنی جگہ مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے پاس تصفیہ یا امتیاز کرنے کا کوئی معیار نہیں ہوتا۔ اس منصوبی طریقۂ تعلیم سے یہ مقصد ہے کہ طالب علم محدود واقفیت کو جس کی انھیں ضرورت ہوتی ہے زندگی کے مشاغل سے تعلق پیدا کرنے کی عادت ڈالیں اور انسانی کام کے محدود دائرہ کا باقاعدہ اصولوں سے جن پر کامیابی کا انحصار ہے ربط پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کریں اور بس۔

حیدرآباد* کے ثانوی مدارس میں تعلیم سائنس پر ذیلی کمیٹی کی رپورٹ

از

جناب مولوی حبیب خاں صاحب بی ایس سی۔ ڈپ۔ ایڈ
مددگار مدرسہ فوقانیہ دارالشفا

کمیٹی کے مقاصد :- ہمارے ثانوی مدارس میں سائنس کی تعلیم پر رپورٹ پیش کرنے کے لئے سائنس کے سینیر اور تجربہ کار اساتذہ کی ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ کمیٹی ہذا نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کیا اور خاص طور پر حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھا۔

(۱) ہمارے ثانوی مدارس میں اس وقت سائنس کی تعلیم در اصل کس طرح دی جارہی ہے۔

(۲) کیا موجودہ نصاب سائنس سے اِس سائنٹفک زمانہ کی ضروریات پُوری ہوتی ہیں۔

(۳) سائنس کی تعلیم کے نظام میں اور موجودہ طرز تعلیم میں کیا کیا خامیاں ہیں اور ان کو مقامی حالات کے لحاظ سے کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔

تمہید :- ہمارے مدارس میں سائنس کا مضمون دیگر مضامین کی طرح اپنے افادی پہلو کو مدنظر رکھ کر شامل کیا گیا ہے۔ ہمارے بچے سائنٹفک کارناموں کے دَور میں زندگی بسر کررہے ہیں۔ وہ روزانہ برقی، زرعی اور صنعتی ترقی کا حال معلوم کرتے ہیں۔ طب، جراحی اور سائنس کی نت نئی کامیابیوں اور کرشموں کا حال سُنتے ہیں اگر انھیں اپنے گرد وپیش کے حالات سے بخوبی واقف نہ کیا گیا تو وہ کارآمد شہری نہیں بن سکتے، جو تعلیم کا صحیح نصب العین ہے۔

---

* یہ رپورٹ انجمن اساتذہ بلدہ کی تیرھویں سالانہ کانفرنس منعقدہ میں پڑھی گئی۔

سائنس کا ادنیٰ ثانوی نصاب:۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ ادنیٰ ثانوی مدارس میں سائنس کی تعلیم کے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے متعلقہ عہدہ داروں کو کس حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ یہ امر ہمارے لئے موجب طمانیت ہے کہ سررشتہ تعلیم نے سائنس کی موجودہ ضروریات کی روشنی میں سابقہ نصاب کو بالکل بدل دینے کی کوشش کی ہے اور ایسے سائینٹفک مضامین شامل کئے ہیں جو دلچسپی اور افادیت کے نقطہ نظر سے نہایت اہم ہیں۔ مہتمم صاحب سائنس نے یہ کام انتہائی سرگرمی کے ساتھ شروع کر دیا ہے۔ البتہ سائنس کے آلات موزوں درسی کتب اور ٹرینڈ اساتذہ کی کمی محسوس کی جارہی ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو عہدہ داران کی فوری توجہ کا محتاج ہے۔

ذیل میں ہم اعلیٰ ثانوی نصاب کے عنوان کے تحت موجودہ نقائص کو دور کرنے کے لئے چند عملی تجاویز پیش کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں جن کا اطلاق ادنیٰ و اعلیٰ ثانوی ہر دو نصاب سائنس پر ہوتا ہے۔

سائنس کا اعلیٰ ثانوی نصاب اور اس کی خامیاں سائنس کے اعلیٰ ثانوی نصاب کی نسبت ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ وہی خشک و غیر دلچسپ نصاب ہے جو آج سے تیس سال قبل پڑھایا جاتا تھا۔ البتہ اس قدر ترمیم کی گئی ہے کہ طبعیات و کیمیا کو لازمی قرار دیکر حیاتیات و نباتیات کو بحیثیت اختیاری مضامین گردانا گیا ہے۔

کمیٹی کی رائے میں سائنس کا موجودہ نصاب نہایت کس مپرسی کی حالت میں ہے جس کے اصلاح کی فوری ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ ہمارے موجودہ نصاب پر دو عملی کارفرما ہے۔ جامعہ نصاب تجویز کرتی ہے اور سررشتہ تعلیمات حسبہٗ اس کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اس چیز کو ختم کر دیں۔ اگر ہم واقعی نوجوانوں کا بھلا چاہتے ہیں اور اعلیٰ ثانوی مدارس میں سائنس کی تعلیم کو قابل اطمینان بنانے کے خواہشمند ہیں تو ہم کو لازم ہے کہ موجودہ پالیسی میں تبدیلی کی اہم ضرورت پر عہدہ داران متعلقہ کی فوری توجہ مبذول کرائیں۔ جامعہ کی جانب سے سائنس کا نصاب محض اس مقصد کے تحت تیار کیا جاتا ہے کہ اس سے طلبا کی اعلیٰ تعلیم کے لئے موزونیت وصلاحیت واضح ہو سکے لیکن طلبا کے رجحانات و میلانات اور آیندہ زندگی کی ضروریات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ نصاب میں اُن نوجوانوں کی بڑی تعداد کا کوئی لحاظ نہیں

کیا جاتا جو میٹرک کے بعد تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیتے ہیں۔ ایسے طلبا کے لئے ہم ایک ایسا نصاب چاہتے ہیں جو اس نصاب سے مختلف ہو جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے تجویز کیا جاتا ہے۔ ان کا نصاب ایسی چیزوں پر مشتمل ہونا چاہئے جو انھیں گرد و پیش کے حالات کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد دے۔ موجودہ نصاب سے انھیں ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ اس دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ بحالت موجودہ انھیں فلکیاتی، حیاتیاتی، اور عضویاتی سائنس کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ ان کی تعلیم طبعیات وکیمیا یا حیاتیات تک محدود ہوتی ہے۔ دوسرے مضامین جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے نہیں پڑھائے جاتے۔ اس طرح تعلیم سائنس کا پورا مطلب حاصل ہونا ممکن نہیں ظاہر ہے کہ جزو سے کل کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ پس سولہ سال کی عمر تک سائنس کی تعلیم وسیع تر اساس پر ہونی چاہئے تاکہ اس سے حسب ذیل مقاصد پورے ہوں۔

(۱) اُن فطری قوانین کا علم کرانا چاہئے جن کا اطلاق اس دنیا پر ہوتا ہے اور جو کائنات پر کارفرما ہیں۔ جس سے طلبا میں احساس تحیّر اور دلچسپی کا عنصر اور افادیت کا پہلو بیدار ہو گا۔

(۲) سائنس کا نصاب اس نہج کا ہو کہ اس سے اس کا انکشاف ہو جائے کہ موجودہ تہذیب وتمدن کے ارتقا میں سائنس کا کیا رتبہ ہے۔

(۳) اس سے بچوں کو سائنٹفک اصول فکر و نظر اور تحقیقات کے مبادیات معلوم کرائے جائیں اس سے ذہنی نشو و نما کی تخلیق ہو گی۔

اگر ہم اعلیٰ ثانوی مدارس کے نصاب کی جانچ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ان مقاصد میں مناسب توازن برقرار نہیں رکھا جاتا مذکورہ مقصد سوم پر غیر واجبی توجہ کی جاتی ہے اور پہلے دو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

سائنٹفک طریقوں اور اصولوں کی تربیت کا براہ راست انحصار کالج کے نصاب پر ہو سکتا ہے۔ جن میں اُن کی اہمیت زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن سائنٹفک طریقوں سے ان طلبا کو در اصل کوئی فائدہ نہیں ہوتا جو میٹرک کے بعد تعلیم ختم کر دیتے ہیں اور کوئی معمولی پیشہ اختیار کر لیتے ہیں پس ظاہر ہے کہ اتنی بڑی اکثریت کے لئے ہم ایک ایسا نصاب چاہتے ہیں جس کا استعمال زیادہ وسیع طور پر اور عام سے عام طریقہ پر کیا جائے۔ اس لئے ہم

جنرل سائنس کے شمول کا مشورہ دیتے ہیں یعنی یہ ایک ایسا نصاب ہوگا جس میں طبعیات، کیمیا، حیاتیات، فلکیات اور عضویات کے مبادیات شامل ہوں گے۔

اس مختصری رپورٹ میں اس تفصیلی نصاب کا ذکر ممکن نہیں جو مدارس ثانوی کے نصاب میں شامل کئے جاتے ہیں، یہ چیز ان لوگوں پر چھوڑ دی جانی چاہئے جو اس کے اہل ہیں۔ البتہ ہم مشورہ دے سکتے ہیں کہ سررشتہ تعلیم اور جامعہ کے تجربہ کار اساتذہ کی ایک کمیٹی اعلیٰ ثانوی مدارس کے لئے جنرل سائنس کا نصاب تجویز کرے۔ مدرسہ فوقانیہ کے لئے تجویز نصاب کے معاملہ میں مدارس فوقانیہ کے اساتذہ کو نظر انداز کرنے کا رجحان ارباب جامعہ میں پایا جاتا ہے اس کے وجوہ غیر معلوم اور مبہم ہیں ہمارے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے جب کہ دنیا جانتی ہے کہ مدرسہ فوقانیہ کا استاد وہی صورت حال سے عہدہ برآ ہوتا ہے اور اس کا مشورہ بڑا قیمتی ہوتا ہے کیونکہ وہ براہ راست مدرسہ کے ضروریات اور حقیقتوں سے ربط رکھتا ہے پس ہم پر زور مشورہ دیتے ہیں کہ نصاب کی کمیٹی میں مدارس فوقانیہ کے اساتذہ کو بھی شامل کیا جائے۔

درسی کتب:۔ درسی کتب کا مسئلہ ہمیشہ اس وقت تک پیچیدہ بنا رہے گا جب تک کہ اس پر سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ غور کر کے حل نہ کیا جائے۔ ادنیٰ ثانوی مدارس کے لئے سائنس کا نصاب تو موجود ہے لیکن اس کے لئے کوئی موزوں درسی کتب نہیں ہیں۔ اسی طرح اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے واسطے جنرل سائنس کی کوئی کتاب اردو میں موجود نہیں ہے۔ اس دشواری کا بہترین حل یہ ہوگا کہ تصنیف و تالیف کا ذوق رکھنے والے لایق و تجربہ کار اساتذہ کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو جنرل سائنس کے نصاب کے مطابق درسی کتب تیار کرے۔ ٹھیٹ منطقی اور فنی اصول پر لکھی ہوئی کتابیں عموماً طلبا کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتیں۔ ایسی کتابوں سے طلبا میں سائنس کا صحیح ذوق پیدا نہیں ہوتا۔ سائنس کی تعلیم کو مقبول عام کرنے کے لئے سلیس اور عام فہم طریقہ پر کتابیں لکھی جائیں۔ انگریزی زبان میں اس قسم کی کتابیں بہت پائی جاتی ہیں۔ جیسے "کرشمہ برق" "ہوا پر قابو" اور "تاروں کے احوال" وغیرہ یہ کتابیں فنی طریقہ پر لکھی ہوئی نہیں ہیں۔ نہایت دلچسپ اور عام فہم ہونے کے علاوہ پر از معلومات

ہیں۔ اُن کو پڑھتے وقت کسی کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کوئی فنی کتاب پڑھ رہا ہے پس ہمارے طلبا کے لئے ایسی ہی عام فہم کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ ایسی کتابیں سائینس کی میکانی، برقی اور صنعتی سرگرمیوں کی تعلیم کا ایک ذریعہ ثابت ہوسکتی ہیں ہمیں یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ ہمارا سررشتہ مذکورہ بالا بنیاد پر اونیٰ ثانوی مدارس کے لئے یہ کام شروع کرچکا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ اعلیٰ ثانوی مدارس کے لئے بھی یہی تدبیر جلد سے جلد اختیار کی جائے گی۔

مدرسین :۔ جنرل سائینس کی تعلیم کو کامیاب بنانے کے لئے ہمیں ایسے ٹرینڈ مدرسین کی ضرورت ہے جنہوں نے علاوہ طبعیات وکیمیا کے حیاتیات، نباتیات، عضویات، فلکیات، اور حفظ صحت کی تعلیم حاصل کی ہو۔ بہ حالت موجودہ ہمارے مدارس میں ایسے مدرسین کی سخت کمی محسوس کی جارہی ہے

آج کل سائینس کی تعلیم عام طور سے اونیٰ ثانوی مدارس میں میٹرک یا ایف۔ اے کامیاب مدرسین کے ذمہ کی جاتی ہے۔ ہم کس طرح توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ ان مضامین کو بخوبی پڑھا سکیں گے جب کہ وہ خود ان مضامین کی عملی تعلیم سے محروم رہے ہیں۔ اُن کے عام معلومات کا لحاظ کرتے ہوے یہ توقع کرنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ فصلوں سے متعلق مواد جمع کرکے دلچسپ اور صحیح پیرائے میں پیش کریں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ سائینس کے ایسے طیلسانین بھی جنہوں نے حیاتیات، نباتیات کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ جنرل سائنس کی تعلیم موثر و مفید طریقہ پر نہیں دے سکتے۔ ممکن ہے وہ یہ مضمون نظری اعتبار سے پڑھا بھی لیں لیکن اس کو عملی طور پر کامیاب بنانے کے لئے انھیں بڑی دقت ہوگی کیونکہ ان مضامین میں عملاً وہ خود کورے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں بھی دشواری درپیش ہے۔ اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں جنرل سائینس کے ٹرینڈ مدرسین کی کمی کے باعث کیمیا وطبعیات کے گریجویٹ نباتیات وحیاتیات پڑھاتے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ساری محنت کے باوجود نتیجہ اکثر قابل اطمینان نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ایسی تعلیم سے طلبا میں مضمون سائینس سے بیزارگی پیدا ہوجانے کا قوی اندیشہ ہے۔ اس دشواری کو دور کرنے کے لئے ہماری نگاہیں ٹریننگ اسکول اور کالج کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہ جنرل سائینس کی تعلیم کے لئے اساتذہ تیار کرے اس لئے ہمارا مشورہ ہے کہ۔

نمبر(۱) میٹرک وایف۔ اے کامیاب مدرسین کو جو ٹریننگ کالج میں داخل ہوں جنرل سائینس کی

تعلیم دی جائے تاکہ ادنیٰ ثانوی مدارس کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

نمبر (۲) طبعیات وکیمیا' کے گریجویٹ کے لئے بھی ٹریننگ کالج میں جنرل سائنس کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

نمبر (۳) بحالت موجودہ مدارس میں ایسے سائنس گریجویٹ کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ جن کے اختیاری مضامین صرف کیمیا اور طبعیات رہ چکے ہیں۔ ان کو سررشتہ تعلیمات کے لئے کارآمد بنانے کی خاطر تعطیلات میں جنرل سائنس کی تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔

نمبر (۴) اساتذہ کو سائنس کی جدید ایجادات و تحقیقات سے واقف رکھنے کے لئے ٹریننگ کالج میں (Holiday course) کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ طلباء کو سائنس کے تازہ کارناموں کے نسبت معلومات بہم پہنچانے کے قابل ہو سکیں۔

تعلیم سائنس کو مؤثر بنانے کے ذرائع :۔ ہم یہاں سائنس کے طریقہ تعلیم پر بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتے اس موضوع پر "حیدرآباد ٹیچر" اور فن تعلیم کی دیگر کتب میں کئی دفعہ تفصیلی بحث کی گئی ہے بلاحظہ ہو۔

نمبر (۱) حیدرآباد ٹیچر' مارچ ۱۳۱۹ء جلد ۵ نمبر ۳ بہ عنوان مدارس میں طریقہ تعلیم سائنس۔

نمبر (۲) مولوی سید علی اکبر صاحب کی کتاب موسومہ "جرمن نظام مدارس" میں بہ عنوان مطالعہ قدرت کی تعلیم کی اہم خصوصیات۔

دارالتجارب :۔ بہ حالت موجودہ اکثر مدارس میں عملی تجربہ دکھانے کے لئے ایک حد تک کافی سامان ہے لیکن بہت سارے مدارس ایسے ہیں جہاں پر انفرادی عملی کام کی سہولتیں نہیں ہیں۔ اگر موزوں فرنیچر مہیا کیا جا سکے تو ایسی صورت میں تدریسی اور عملی کام ایک ہی ہال میں ممکن ہو گا۔ جہاں تک ممکن ہو ہر مدرسہ میں فلم پردہ جگنرا اور مناظری قندیل ضرور مہیا کی جانی چاہیئے۔ مضمون سائنس کو دلچسپ اور مقبول بنانے کے لئے اس سے بڑی مدد ملے گی۔

کتب خانہ :۔ مدارس میں سائنس لائبریرز کا فقدان ہے حالانکہ موجودہ زمانہ میں یہ تعلیم سائنس کا ایک اہم جزو قرار دیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں اس قسم کی سائنس کی کتابیں ہر عمر و قابلیت کے لڑکوں کے لئے موجود ہیں۔ لیکن اردو زبان میں ایسی کتابیں بالکل مفقود ہیں۔ پس سررشتہ تعلیمات اور جامعہ کو چاہیئے کہ یہ کام اپنے ہاتھ میں لے اور اردو زبان میں اس قسم کی کتابیں تیار کر کے اس کمی کو

جلد سے جلد پورا کردے۔ اگر اس قسم کی کتب مہیا کی جائیں تو ہر استعداد کا طالب علم اُن سے مستفید ہو سکتا ہے اس طرح نوجوانوں کے احساس تحیّر اور تخلیق میں تحریک پیدا ہوگی۔

نمائش گاہ:۔ تعلیم سائنس کو مؤثر بنانے کے لئے مدرسہ میں نمائش گاہ کی سخت ضرورت ہے بہت کم مدارس ایسے ہیں جہاں اس کا انتظام اچھا کیا گیا ہے۔ مختلف صنعتی کارخانوں کے خاکے و تصاویر مہیا کئے جائیں۔ یہاں خود لڑکوں سے تیار کروا کر ایسی اشیائ کے نمونے رکھے جائیں جو ہماری روزمرّہ زندگی میں کام آتے ہیں۔ جیسے روشنائی، صابن، تیل، سینٹ، پالش وغیرہ۔ ان کے دیکھنے سے دوسرے طلبائ میں صنعتی شوق پیدا ہوگا اور ان میں رشک و مسابقت کے جذبہ کو تحریک ہوگی۔

صنعتی اداروں اور اہم مقامات کی سیر و تفریح:۔ طلبا کو صنعتی مقامات کا معائنہ کرانے سے سائنس کی تعلیم میں بڑی مدد ملے گی۔ روزمرّہ کمرہ کی اشیائ کو نظر کے سامنے بنتے ہوئے دیکھنے سے ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور سائنس سے اُن کی دلچسپی زیادہ گہری ہو جائے گی۔ اس لئے ہمیشہ کوشش یہ رہنی چاہئے کہ جہاں کہیں موقع ملے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ پس ہر مدرسہ میں حسب سہولت پروگرام تیار کرکے گرد و نواح کے کارخانہ جات اور دلچسپ مقامات کی سیر و تفریح کو لے جانے کا انتظام کیا جائے۔

انجمن مباحثہ:۔ عام فہم تصاویر کے ذریعہ طلبائ میں سائنٹفک معلومات موجودہ ایجادات پر بحث و مباحثہ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ لڑکوں میں سائنس کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لئے سائنس ٹیچر کو چاہئے کہ وقتاً فوقتاً ان کو جدید ایجادات اور تحقیقات سے واقف اور مانوس کراتے رہیں۔

مدارس میں باغبانی

از

جناب مرزا سرفراز علی صاحب بی۔اے عثمانیہ ایچ ڈپ ایڈ (ڈبلن)
ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول کپل

باغبانی متعلم کے جمالیاتی ذوق کی نشوونما اور تسکین ہی کے لئے نہیں بلکہ افادی نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے۔ جن حضرات نے اپنے چھوٹے سے صحن میں بھی انار، انجیر، آم اور جام کا ایک آدھ پودا لگا رکھا ہو اور تھوڑی سی دیکھ بھال کے ذریعے اس میں پھل آجائیں محسوس کرتے ہوں گے کہ گویا وہ اور ان کے مہمان ساون کی رت میں آم کی ڈالی پر جھولا ڈال کر مسرت کی ساعتوں کے مزے لے رہے ہیں۔ گھر کے ان پھلوں میں امرت سے زیادہ لطف اور من و سلویٰ سے بڑھ کر مزا ملتا ہے۔

آپ کے نونہالوں کو بچپن ہی سے باغبانی کی جانب متوجہ کیجئے۔ ان کا چھوٹا سا باغیچہ بڑھتے ہوئے ذوق اور ابھرتی ہوئی امنگوں کی آغوش میں کل کے دن سرسبز و شاداب باغ ہو جائے گا۔ شہروں اور دیہاتوں کا ہر گوشہ آراستہ روشوں، خوبصورت پودوں اور آنکھوں میں طراوت لانے والے پھولوں سے جنت نشاں بن جائے گا۔ ویران میدانوں کا گرد و غبار کلیوں کی مسکراہٹ میں تبدیل ہو جائے تو یہ کوئی پاپ نہیں عین ثواب ہے۔ پھر اس پر طرفہ یہ کہ باغبانی میں مصروف ہو کر آپ کے ہاتھ پیر درست، آپ کی صحت میں ہزار گونہ ترقی اور چہرے پر کنول جیسی شادابی نکھر آتی ہے۔

گھر کی چار دیواری، مدرسہ کا صحن اور دیس کی زمین پر مالی کی خدمت انجام دینا وضع داری اور ثقہ طرز بود و باش کے منافی نہیں۔ انگلستان میں بڑے عالی ظرف اور اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد اکثر و بیشتر اپنے خانہ باغ کو آپ ہی سنوارا کرتے ہیں۔ خصوصاً انگریز عورتیں تو

اس کی رسیا ہیں۔ اُن کی فراک میں لگے ہوئے تازہ پھول نیچر سے راست لگاؤ کا زندہ ثبوت دیتے ہیں۔

یورپ میں دوران قیام کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ انگریزی زبان کے مشہور شاعر (Yeats) سے آپ ناواقف نہ ہوں گے۔ آئرستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا اِن کی عظمت سے روشناس ہے۔ ان کا دیہاتی مکان ڈبلن سے چند میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ دو بار آئرستان میں جب کہ میں ان کا رفیق سفر تھا مجھے اتفاقیہ طور پر ان سے ملاقات کا موقع مل گیا۔ چھٹیوں کے زمانے میں کبھی کبھار میں ان سے ملنے جایا کرتا تھا گھر میں ان سے ملاقات کے دو ہی مقام تھے۔ خانہ باغ یا مطالعہ کی میز۔ مطالعے کی میز سے ہمیں یہاں کوئی تعلق نہیں۔ البتہ خانہ باغ کا ذکر سنئے۔ گھر کے تمام افراد دائیں بائیں موجود آستین چڑھی ہوئیں۔ ہاتھ میں تھاپی ستاری، پہلو میں آبیاری کے برتن، کبھی روشوں کو درست کرنے چلے، کبھی زرد پتوں کو سبز پودوں سے کھینچ پھینکا، پھولوں کی نزاکت اور بوقلمونی پر وجد کرنا، پھلوں کے جلد تیار ہو جانے کی آرزو، بہر حال یہی اس شہرہ آفاق ہستی کا مشغلہ تھا۔ زندگی اس کی آغوش میں کھیلتی تھی، خانہ باغ کی ٹہنیاں اُس کے سندر رُوپ اور پریمی آنکھوں سے چھیڑ کرتی تھیں اور وہ قدرت کی اس بیش بہا دولت کو ریاضت کے ذریعے اپنے دل میں سمیٹ کر بڑھاپے میں بھی جوانوں سے زیادہ تنومند اور چست و چالاک نظر آتا تھا۔

مشرق والے بحیرۂ روم سے اُس پار کے باشندوں سے کچھ کم باغبانی کا ذوق نہ رکھتے تھے۔ ہندوستان میں باغ نہ ہوتے تو یہاں کی البیلیاں اُموا کی ڈال پر جھولا ہی نہ ڈال سکتیں۔ کیکر کے سائے میں کڑھائیاں نہ چڑھ سکتیں۔ ملہار نہ گائے جاتے۔ کرشن کی بانسری کا لطف گلزار ہی میں دل لبھاتا ہوگا۔ باغوں کی رنگینی کے بغیر بانسری کا نغمہ صدا بہ صحرا ہو جاتا۔

باغ کی پیداوار بیماروں اور صحت مندوں سبھی کو مرغوب ہوتی ہے۔ جب آپ روزآنہ ایک سیب کھا کر ڈاکٹر کو بھگا سکتے ہیں تو اپنے گھر میں سیب کا درخت کیوں نہیں لگا لیتے۔ کہا جاتا ہے کہ موسمی جسم میں تازہ خون پیدا کرتی ہے اس کے دو ایک پودے آپ کے مختصر کنبہ کی رسد کے لئے کافی ہیں۔ انگور، لیمو، آم اور انار کے درخت بھی صحن کی

رونق کو دو بالا کر سکتے ہیں۔

غرض یہ کہ آپ چند ضروری درخت اپنے پاس لگا کر تھوڑی سی دیکھ بھال کرلیں تو معظم جاہی مارکٹ کا میوہ فروش آپ کی جیبیں نہ ٹٹول سکے گا۔

ہمارا سررشتہ تعلیمات دیہی اور شہری مدارس میں باغبانی کی جانب کامل توجہ صرف کر رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اکثر مقامات پر اس مقصد کی تکمیل عملی مشکلات سے دوچار ہوگی لیکن جہاں اس کے بالکل مواقع حاصل نہ ہوں خصوصاً صدر مدرسین کو امکانی کوشش سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔ قلت آب مدرسے سے ملحق مناسب احاطے کا نہ ہونا اور عام بے توجہی یہ چند مسائل ضرور اس کام میں حارج ہوتے ہیں۔ تاہم بڑی حد تک ان کا قریبی حل دریافت کیا جاسکتا ہے۔ دیہات میں اکثر مقامات پر پانی کی کمی ہے لیکن پانی گو ہر نایاب نہیں تھوڑا بہت میسر ہی آجائے گا۔ ایسی صورت میں آپ ایسے پودوں کی جستجو کریں جنہیں چند روز پانی پہنچانے پر وہ سنبھل سکتے ہیں۔ اور آئندہ اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سایہ دار درختوں میں اکثر ایسے ملیں گے کہ انھیں ایک آدھ سال سنبھال لیا جائے تو موسم باراں کی مدد سے ان کی جڑیں زمین میں استوار ہو کر زمین کی تہوں میں جذب شدہ ذخیرہ آب سے اپنی غذا حاصل کرنے کے لائق ہو جاتے ہیں۔

پھولوں کے پودے موسمی ہوتے ہیں۔ بارش کے تین چار مہینے تو کم و بیش بغیر آبیاری کی زحمت اٹھائے یہ شوق پورا کیا جاسکتا ہے۔ پھولوں میں بھی بعض پودے سدا بہار ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ تخم ریزی کر دی اور وہ ہمیشہ کے لئے کیاریوں کے ٹھیکہ دار ہو گئے۔ موسم خزاں میں یہ مرجھا جاتے ہیں لیکن اس کے بعد ان میں نئی نئی ٹہنیاں نکل آتی ہیں اور بے ہنگام بارش، ذرا سی آبیاری اور سرسری دیکھ بھال سے ان کا شباب عود کرتا ہے۔

باغ کو پودوں سے آراستہ کرتے ہوئے پرانی لکیر کو پیٹنا لازمی نہیں۔ خصوصاً دیہی مدارس میں تو جدت کے کثیر مواقع موجود ہیں۔ چشموں کے کنارے، پہاڑوں کے دامن اور سرسبز وادیوں میں آپ کو بہت سے خوبصورت پودے مل جائیں گے۔ انھیں جنگلی تصور کر کے صرفِ نظر نہ ہونے دیجئے۔ باغ کے ایک گوشے کو ان سے زینت دی جاسکتی ہے۔ تنوع اور نزاکت میں بھی ان پر کوئی حرف نہیں رکھ سکتا۔

جنگلی گلاب اور بندرگی کی باڑھ کا صحرائی حسن ہماری انگریزی باڑھ سے مات نہیں کھاتا
آپ چاہیں تو ان کے نام بدل لیں لیکن انھیں سلیقہ سے لگایا جائے تو باغ کی رونق دوبالا
ہو جائے گی۔

مدارس میں خصوصاً مذکورہ بالا دشواریوں کے پیش نظر میوے کے درختوں کی نشو ونما
مشکل سمجھی گئی ہے۔ تاہم پپائی، مولسری اور جامن وغیرہ کے درخت تو آسانی سے لگائے
جا سکتے ہیں۔ سایہ دار درختوں میں گل مہر، نیم، سلور اوک، برگد اور پیپل مناسب ہوں گے
ایسے درخت جن کی جڑیں نہایت مضبوط اور دور تک پھیلنے والی ہوتی ہیں، عمارت سے
قریب نہ لگائے جائیں کیونکہ آئندہ چل کر ان سے بنیاد کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

درخت لگانے میں ترتیب نہایت اہم ہے۔ اس سے صحیح مذاق کا پتہ چل سکتا ہے۔
خانہ باغ کا نقشہ عمارت اور صحن کی موزونیت کے مطابق تیار کیا جائے۔ درختوں کے رنگ
جسامت اور وضع کو بھی اس میں کافی دخل ہے۔ گملے بھی پودوں کے رنگوں کی مناسبت سے جمائے
جائیں۔ تاکہ نظر میں بھدا پن نہ پیدا ہو۔ نیلے اور زرد پھول ایک ساتھ رکھے ہوں تو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔

معلّمین نباتیات، سائنس اور ڈرائینگ ماسٹر باغیچہ کی ترتیب میں دلچسپی لیں تو یہ مسئلہ
آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ خصوصاً معلّمین سائنس سر رشتہ تعلیمات کی مرتبہ ہدایات منجانب انسپکٹر
صاحب سائنس کی مدد سے اس کام کا نہایت دلچسپ ریکارڈ تیار کر سکتے ہیں۔ اضلاع او تعلقات
میں افسران زراعت کا مشورہ اور تعاون بھی نہایت کارآمد اور نتیجہ خیز ہو گا۔

مدرسین اور صدر مدرسین

سے

خطاب

از

جناب مولوی عبد الستار سبحانی صاحب بی۔ اے، ال۔ ٹی پرنسپل دار العلوم بلدہ

یہ تقریر کانفرنس انجمن اساتذہ ضلع میدک منعقدہ ۵ر بہمن ۱۳۵۰ف میں کی گئی۔ اس کا دوسرا حصہ جو جغرافیہ کی تعلیم سے متعلق تھا، ہم پچھلے شمارہ میں چھاپ چکے ہیں۔ اس اشاعت میں پہلا حصہ شائع کیا جاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ فاضل خطیب کے دیرینہ تجربوں پر عمل کرکے۔ مدرسین اور صدر مدرسین مدرسہ کی کارکردگی کا معیار بلند کریں گے۔

میرا ارادہ تقریر کرنے کا نہیں تھا اور نہ میں اس ارادہ سے حاضر ہوا۔ صرف عالی جناب صدر مہتمم صاحب و جناب مہتمم صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں کھڑا ہوا ہوں۔

صدر محترم نے ارشاد فرمایا تھا کہ والدین کی دیگر شکایات کے ساتھ ساتھ یہ شکایات بھی اکثر سنی جاتی ہے کہ مدارس میں تعلیم نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں بعض ایسے امور ہیں کہ اگر ہم ان پر غور کریں تو اس شکایت کی ذمہ داری بالکلیہ ہم پر عائد ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی کچھ وضاحت آپ کے سامنے پیش کروں۔ یہ ہمارا اپنا جلسہ ہے۔ باہمی تبادلہ خیالات سے اگر کچھ نقائص دور ہوسکیں تو گویا اس کانفرنس کا ایک بڑا مقصد پورا ہوگا۔

اکثر مدارس میں یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ صدر مدرس صاحب اپنے اسٹاف میں سے کسی ایک مدرس کو اپنا مشیر منتخب کر لیتے ہیں اور دیگر رفقائے کار کے متعلقہ امور میں بھی انھیں کے مشورہ پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ اس زبردست غلطی کی وجہ سے مدرسہ میں باہمی نفاق کی صورتیں پیدا

ہوتی ہیں اور پارٹی بندی ہو جاتی ہے اور طلباء کی تعلیم پر برے اثرات مترتب ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح طلبہ کی خرابی تعلیم ہمارے اپنے طرز عمل کا نتیجہ ہو جاتی ہے۔

صدر مدرسہ کا طرز عمل یہ ہونا چاہیئے کہ مضائقہ نہیں کہ وہ اپنے اسٹاف کے کسی سمجھدار مدرس سے مدرسہ کے عام امور میں مشورہ کرے مگر جو امور دیگر رفقائے کار سے متعلق ہوں اُن کو اُنھیں سے متعلق رکھے ورنہ مدرسین کی دل شکنی اور اسٹاف میں عام بے چینی اور اس کے نتیجہ کے طور پر مدرسہ کی بدنظمی کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔

دوسری صورت جو تجربہ سے ثابت ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ اکثر معمولی اختلافات پر بھی صدر مدرسہ اور اسٹاف میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے بھی طلبا کی تعلیم کا متاثر ہونا ضروری ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ مدرسہ کا پورا اسٹاف اچھا ہو۔ لازماً کسی نہ کسی مدرس میں کچھ نہ کچھ خامی یا خرابی ضرور ہوگی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مدرسہ میں رہنے ہی نہ پائے۔ اس خصوص میں بعض صدر مدرسین کی یہ خواہش کہ کسی طرح ایسے اشخاص کا تبادلہ ہو جائے اور ان کی مرضی کے موافق مدرسین تبدیل ہو کر آئیں، میں نہیں سمجھتا کہ کسی وقت بھی پوری ہو سکتی ہے۔ کوئی صدر مدرس یہ گوارا نہیں کرے گا کہ اس کے اسٹاف سے اچھے مدرسین تبدیل ہوں۔ پس یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ کسی مدرسہ سے جو شخص تبدیل ہوگا اس کا معاوضہ اس سے بدتر ہی ملے گا۔ پس مدرسین کی تبدیلی کے خیالِ خام کو بالکل ترک ہی کر دینا مناسب ہے۔ وہی صدر مدرس کامیاب صدارت کر سکتا ہے جو اچھے اور بُرے دونوں قسم کے مدرسین سے کام لے سکے۔ اسٹاف میں کام کی تقسیم اگر مدرسین کے حسب حیثیت عمل میں آئے تو ہر مدرس مدرسہ کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ تقسیم کار کا ناقابل اطمینان ہونا اور اس کی وجہ سے مدرسہ کے انتظام میں خلل واقع ہونا صدر مدرسہ کی نا اہلی اور ناتجربہ کاری کی دلیل ہے۔ اس سے بھی تعلیم متاثر ہوتی ہے۔ صدر مدرس اور اسٹاف میں تاوقتیکہ باہمی اعتماد اور تعاون قائم نہ ہو اور ہر شخص کو اطمینان کلی حاصل نہ رہے مدرسہ کا کام کسی صورت بھی اطمینان بخش طریقہ پر انجام نہیں پا سکتا۔

اس کے علاوہ مدرسین صاحبان جب تک مدرسہ کے بچوں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز

نہ سمجھیں اور ان کے رجحانات وطبعی میلانات کے مطابق ان میں دلچسپی پیدا کر کے کام نہ کریں نہ ہماری تعلیم کارگر ہوسکتی ہے اور نہ منشا تعلیم پورا ہوسکتا ہے۔ اگر ہم میں یہ جذبات پیدا ہو گئے تو لازماً اولیا، طلبا کی تمام شکایات خود بخود رفع ہو جائیں گی۔

عام طور پر یہ شکایت بھی سنی جاتی ہے کہ تنخواہ کی کمی مدرسین کو دلجمی کے ساتھ کام نہیں کرنے دیتی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اِس خصوص میں ہم کو اپنا مقابلہ دوسرے سررشتوں کے اپنے مماثل ملازمین سے کرنا چاہیئے۔ اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جس عزت اور وقعت کا برتاؤ سررشتہ تعلیمات اپنے ملازمین کے ساتھ روا رکھتا ہے وہ دوسرے سررشتوں میں مفقود ہے۔ اس کے علاوہ جو مدرسین اپنے کارِ مفوضہ کو کما حقہ انجام دیتے ہیں اُن کی وقعت اور محبت جو ان کے طلبا اور اولیاء کے دلوں میں مستقلاً ودواماً جاگزیں ہوتی ہے وہ کسی دوسرے سررشتہ کے بڑے عہدہ دار کو بھی نصیب نہیں۔ کیا مدرس کی یہ حیثیت تنخواہ کی کمی کی پابجائی نہیں کرتی۔

مدرسی کا پیشہ اُسی شخص کو اختیار کرنا چاہیئے جس میں کچھ قناعت کا مادہ ہو اور جو اس پیشہ کی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسا ہی مدرس اپنے فرض کو فرض سمجھ کر ادا کرے گا اور اس کی سعی کامیاب اور اس کے زیر تعلیم بچوں کی محنت کارگر ثابت ہوگی اور یہی ہمارا مطمح نظر ہے۔

صدر محترم نے اپنی عالمانہ تقریر میں نہایت صحیح ارشاد فرمایا کہ جو مدرس اپنی صحت مالیت اور گھریلو حالت کے متعلق اطمینان بخش جوابات نہ دے وہ کامیاب مدرس نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلے میں اگر اخلاقی حالت کا بھی اضافہ فرما دیا جائے تو مناسب ہے۔

میں بعض ایسے مدرسین سے واقف ہوں جو اپنے متعلقین کی پریشاں حالی اور اپنے بزرگوں کی دل آزاری اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ کیا اِن سے یہ توقع ہوسکتی ہے کہ یہ اپنے گھر کو پریشان رکھ کر مدرسہ کے بچوں کے گھر کی آبادی کا ذریعہ بنیں گے۔ گھروں کی آبادی خاندانوں کی خوشحالی کا تو مفہوم بھی ان کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ جب مدرس خود ہی احسان مندی اور شکر گزاری کے احساس سے محروم ہو تو بچوں میں یہ جذبہ کس طرح پیدا کر سکتا ہے۔ ع

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

ہر اس شخص کو جو ہمیشہ مدرسی اختیار کرے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مدرس کے اخلاق اور اس کا عام طرزِ عمل اپنے لئے نہیں ہوا کرتا۔ اس کے ہر رفتار و کردار کا اثر اس کے طلبا پر پڑتا ہے۔ اُن کے ذریعہ اُن کے خاندان متاثر ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ تمام ملک تک پہونچتا ہے۔ تاوقتیکہ مدرسین کی اپنی حالت درست نہ ہو کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بچوں کی حالت کو درست کرسکیں گے اور ملک کی ترقی اور بہبودی کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔ بچے ہم سے سیکھتے ہیں، ہماری ہر اچھائی اور برائی ان کو اچھا اور برا بناتی ہے۔

ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ تعلیم کا بچوں کے حسب حیثیت نہ ہونا بھی ایک بڑی حد تک خرابی تعلیم کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے لئے طلبا کی شرکت اور سالانہ جماعتی ترقی کے وقت خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہماری ذراسی عدم توجہی بچوں کی عمر بھر کی پریشانی اور تباہی کا باعث ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر مریض کے متعلق صحیح مشورہ دے سکتا ہے۔ مریض کے تیمارداروں کی رائے اس خصوص میں صائب نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح کسی طالب علم کے متعلق مدرسین ہی کی رائے اور انھیں کا طرزِ عمل نفع بخش ہوسکتا ہے۔ اس کے سرپرست کی خواہش یا کوشش بعض وقت اس کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ پس طلبا کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُن کے سرپرستوں کی افہام و تفہیم بھی ہمارا سب سے بڑا فرض ہے۔

استقبال نامہ

از

جناب مولوی عبد الجبار سبحانی صاحب بی۔ اے، بی۔ ٹی، ناظر مدارس کھم

یہ خطبہ ضلع ورنگل کی تیسری سالانہ کانفرنس اساتذہ ۱۳۵۰ف میں بمقام کھم پڑھا گیا۔ جس بے باکی اور صاف گوئی سے مقرر نے اظہار خیال کیا ہے قابل قدر ہے۔ یقین ہے کہ قارئین رسالہ اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے

بہنو، بھائیو اور بزرگو! ہر قسم کے رسمی تکلفات کے بغیر میں آپ کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ جو خوشگوار فرض آج میرے تفویض ہوا ہے اس کے لئے زیادہ قابل اور زیادہ موزوں حضرات موجود تھے۔

اُستاد کو ہر زمانہ میں بڑی فضیلت اور بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ قوموں کے بنانے بگاڑنے اور سلطنتوں کے عروج و زوال میں ان کو ہمیشہ بڑا دخل رہا ہے۔ دُنیا کا کوئی انقلاب ایسا نہیں جس میں ان کا ہاتھ نہ ہو۔ ہندوستان میں گزشتہ زمانہ میں اُستاد کو جو عدیم المثال حیثیت حاصل تھی اُس کے راگ ہر جگہ الاپے جاتے ہیں۔ لیکن آج اُس کی کیا حیثیت ہے۔ کیا وہ قوم کا لیڈر ہے؟ جس کے ایک اِشارے پر اللہ اکبر کے نعروں سے ساری فضا گونج اُٹھے۔ کیا وہ مہاتما ہے جس کے چرنوں میں اُس کے معتقدین اپنا سر ٹیکنا ثواب دارین سمجھتے ہوں کیا وہ اپنے شاگردوں کا بادشاہ ہے کہ جہاں اُس کی نگاہ اُٹھے اُسے ہاتھ باندھے ہوئے حلقہ بگوش غلام نظر آئیں! کیا وہ ایسا مصلح ہے کہ دیہات سُدھار میں پٹیل پٹواری اور صیغۂ مال کے عہدہ دار اُس کے حکم کے منتظر ہوں۔ نہیں یہ سب تصورات حرف غلط کی طرح مِٹ چکے ہیں۔

اُستاد اب ایسا مزدور ہے جو اُجرت پاکر اپنا فرض ادا کرتا ہے اور ہر اُس آفت کا منتظر رہتا ہے جو مزدوروں کو جھیلنی پڑتی ہیں۔ عوام کی لاپروائی۔ حکّام کا تغافل اور شاگردوں کی

بغاوت آج کل ہندوستان کے ہر حصہ میں عام ہے جس سے مدرسین کو دوچار ہونا پڑتا ہے اس کی وجہ میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ مدرس اپنی بڑائی کے خیال میں مگن ہے اور ابھی تک خواب غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ زمانہ بدل گیا اور ہر آن بدل رہا ہے۔ فرسودہ تصوّرات کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں۔ وہ پھر بھی ہوش میں نہیں آتا۔ عوام کی لاپروائی اور حکّام کے تغافل سے قطع نظر کر کے میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ آپ کے شاگرد آپ کا کہنا آخر کیوں نہیں مانتے۔ یہ روز روز اسٹرائیک کیوں ہونے لگے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم سب مل کر اس پر غور کریں۔

قدیم زمانہ کے طالب علم کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ وہ فرمانبردار ہوتا تھا۔ استاد کے ہر حکم کی خاموش تعمیل ایک سعادت اور عبادت سمجھتا تھا۔ وہ شاگرد بھی تھا اور خدمت گار بھی اس کے برخلاف موجودہ زمانہ کے طالب علم کی بابت یہ شکوہ ہے کہ وہ پُرانا طالب علم نہیں رہا۔ اُس میں فرق مراتب اور احترام کے جذبات نہیں رہے نظم وضبط سے بھی وہ آزاد ہو چلا ہے۔

میں اِس کا ذمہ دار خود اِس زمانہ کے استاد کو سمجھتا ہوں جس میں قدیم زمانہ کے استاد کی پدرانہ محبت اور شفقت باقی نہیں رہی۔ آج کل ضبط کا تخیل کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ ہر وہ چیز جو طبع نازک پر گراں گزرتی ہے ضبط پر بھینٹ چڑھا دی جاتی ہے۔ یہ کہنے کا مقصد ضبط کی مخالفت کرنا نہیں ہے مگر ضبط کا غلط تصور اور غیر ہمدردانہ استعمال ضرور قابل ملامت ہے۔ ضبط قوت کا نام نہیں۔ ضبط کے معنی جبر و استبداد کے ہرگز نہیں۔ ہندوستان کی دنیا میں جو انقلاب آج نظر آ رہا ہے وہ اِسی بھیانک ہتھیار کے سراسر غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ ضبط کا جوہر دوسروں میں جب ہی پیدا ہو گا جب حاکم ہو یا اُستاد صحیح طور پر پہلے خود کو اُس کا پابند بنائے ورنہ محض اقتدار اور جبر سے ہمیشہ ردّ عمل ہو گا۔

اس لئے ضبط کی پابندی ہر شخص کو خود کرنی چاہیئے۔ تربیت اصل میں بڑی چیز ہے اگر شروع سے تربیت دی گئی تو آگے چل کر کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ غلطی کے ذمہ دار ہمیشہ شاگرد ہی کیوں قرار دیے جائیں۔ کیا اُستاد فرشتے ہیں یا اپنی غلطی کا اعتراف اور اس کی تلافی کرنا کوئی جرم ہے۔ یہ تخیّل بھی ظلم سے کم نہیں کہ افسر غلطی اور بدعنوانی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ غلطی ہمیشہ ماتحت سے ہوتی ہے۔ انسان جب تک انسان ہے غلطی کرے گا۔

یہ فطری بات ہے فرشتے آسمان پر رہتے ہیں۔ اِس دنیا میں انسان بستے ہیں اور غلطیاں کرکے جیتے ہیں۔ اس لئے استاد ہو یا شاگرد افسر ہو یا ماتحت غلطی کا مرتکب ہوسکتا ہے البتہ بڑائی اور بہادری اس میں ہے کہ اُس کا بے باکانہ اعتراف کیا جائے اور خلوص دل سے اِس کی تلافی کی جائے۔

بڑی بات فرائض کی ادائیگی ہے۔ فرائض دیانت اور راست بازی سے بلاخوف وخطر انجام دینے چاہئیں۔ ذاتی منفعت کے لئے عدل و انصاف کا خون نہیں کرنا چاہئے۔ ملکی اور قومی مفاد ہمیشہ پیش نظر رہے ورنہ ہمارے پیشوا غلامی کا جو طوق ہمارے گردن میں ڈال گئے ہیں اس سے کبھی بھی نجات حاصل نہیں ہوگی۔ ہم مدرسین کا فرض ہے کہ کارکردگی کے معیار کو اتنا بلند کریں اور فرض کو اس ایمانداری سے انجام دیں کہ دوسروں کے لئے نمونہ ہو۔ قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت اس انہماک سے کریں کہ جاں فروشوں کی فوج تیار ہو جائے اور ایسے سورما پیدا ہوں جو بہ قول شری متی سروجنی نائیڈو " اپنی زندگی کو مادر وطن کی خدمت اور ہندوستان کے لاکھوں بے زبانوں اور بے نواؤں کی خبر گیری کے لئے وقف کردیں اور ایسا انقلاب پیدا کردیں جو انسان کے باہمی مناقشات کی زنجیریں توڑدے جو لاعلمی اور جہالت کی فضا میں علم و دانش کا اُجالا پھیلادے اور جہاں خوف کے بادل چھائے ہوئے ہوں وہاں عزم و ہمت کا آفتاب چمکادے اور زندگی کی تعمیر جدید کچھ اس نہج سے ہو کہ ہم سب کے سب امن و آشتی و یک جہتی و ہم آہنگی کے ساتھ رہنے سہنے لگیں اور تنگ خیالوں کی جگہ قومی خیالات کا پاس و لحاظ پیدا ہو جائے۔"

بھائیو! اِن اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے صحیح قسم کے اساتذہ کی ضرورت ہے۔ ایسے اساتذہ کی جو قدم جمتے ہی دوسرے سررشتوں میں منتقلی کی فکر میں نہ رہتے ہوں جو دوسروں کے حقوق تلف کرکے اپنی ترقی کی پیروی میں پریشان نہ پھرتے ہوں۔ جو ہر گھڑی تبادلہ کا خواب نہ دیکھتے ہوں۔ جو معاملات کی تگ ودو سے آزاد ہوں۔ جو ناجائز اثرات کی بدولت قبل از وقت ترقی یا عہدہ مل جائے تو اس مشہور مقولے کے مطابق "کہ کام کرنے والا بے وقوف ہے"۔ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔

یہ صحیح ہے کہ اس دنیا میں دو اور دو چار نہیں ہوتے۔ تین ہوتے ہیں یا پانچ۔ بہت

ممکن ہے کہ آپ کسی بڑے منصب کے لائق ہوں مگر قسمت کے پھیر نے آپ کو مدرس بنا دیا ہو تو پھر کیوں نہ ایسی کوشش کیجئے کہ اسی خدمت پر آپ کو وہ منصب عطا ہو جو دوسروں کے لئے قابل رشک ہو۔ قسمت کی گردش پر آنسو بہانے کا زمانہ ختم ہو چکا۔ اب اپنے آپ کو کار آمد بنانے کا زمانہ ہے۔

اس لئے ہم سب کو دل وجان سے اپنا فرض ادا کرنا چاہئے اور بچوں کی تربیت کرنی چاہئے کہ یہی بچے کل کے دن قوم کے سورما بنیں گے۔

بھائیو! اس کانفرنس کا بڑا مقصد اساتذہ کا باہمی اتحاد ہے، جو متحد اور منظم نہیں۔ اُس کی کوئی آواز نہیں۔ جس جماعت نے اپنی تنظیم کر لی ہے اس کی قوت کا احساس سب کرتے ہیں۔ اساتذہ کی انجمن ایسی ہونی چاہئے جو واقعی اساتذہ کی ہو۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہم اپنی تنظیم صحیح معنوں میں کریں۔ مجھے یقین ہے کہ پھر حکام کا تغافل یا عوام کی بے حسی باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر ہم نے اپنے فرائض کو ایمان داری سے انجام دیا تو ہمارے شاگرد ہمارے قابو سے باہر نہیں ہو سکتے۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر میں آپ تمام حضرات کا پُرتپاک خیر مقدم کرتا ہوں اور عالی جناب مولوی غوث الدین صاحب ایچ۔ سی۔ ایس اول تعلقدار کو خاص طور پر خوش آمدید کہتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم سب آپ کے زرین خیالات سُننے کے بہت مشتاق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جناب کی رہبری میں ہم مدرسین کا طبقہ زیادہ کار آمد ثابت ہوگا۔

خدا سے میری دُعا ہے کہ ہمارے شاہ ذیجاہ نواب میر عثمان علی خاں بہادر کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ اور ہمیں ملک و مالک کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تعلیم معلم

از

جناب مولوی سعید الدین خاں صاحب بی۔ اے، ڈپ۔ ایڈ۔
صدر مدرسہ وسطانیہ سلطان بازار حیدر آباد دکن

ہندوستان کی موجودہ پستی اور احساس نکبت کی وجہ سے آجکل تعلیم کا مسئلہ ہر طرف تنقید کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ روز آنہ نت نئے اصول پیش ہو رہے ہیں اور ماہرین برابر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ہندوستان کو اس جگہ لیجا کر بٹھا دیں جہاں آجکل یورپ اور جاپان براجمان ہیں۔ اس تنقید سے بیچارہ معلم اور مدرسۃ المعلمین بھی نہیں بچ سکا۔ مندرجۂ ذیل مضمون جو ڈی۔ یس گورڈن کا مصنفہ ہے، اسی تفکر کا نتیجہ اور بلا شبہ صداقت کی طرف منجر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں اکثر کو کلام ہو لیکن اس کا کیا علاج۔

من از آتش و خاں بینم تو آتش از دخاں بینی! (مترجم)

یہاں ایک تجربہ کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا جو اگرچہ ہنوز عہد طفولیت ہی میں ہے اور محتاج ترقی ہے۔ تاہم اس میں ان طیلسانین کے کام کی جو بغرض اکتساب فن تعلیم شریک کلیہ ہیں مفید طریقہ پر رہبری کرنے کے قوی امکانات ہیں۔

یہ عام طور پر تسلیم ہے کہ کالج کے ایک اوسط طالب علم کے کام کی اگر کوئی خصوصیت ہے تو وہ چند عام نقائص ہیں جن میں سب میں عام تر شاید اپنی قوت اظہار پر عدم اعتمادی ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ صفحات کے صفحات اور بعض دفعہ باب کے باب ازبر کر لیتا ہے اور ایسا کرنے میں اس کا یہ

ایقان ہوتا ہے اپنے الفاظ کی بہ نسبت دوسروں کے الفاظ میں اپنے مطلب کو بیان کرنا زیادہ مفید ہے۔ یہ محض ایک غیر زبان پر دسترس کلّی حاصل نہ کرنے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایسے طلبا جو انگریزی میں اظہار مطلب پر قادر نہیں ہوتے اپنی دیسی زبان میں بھی کوئی گل افشانی نہیں کرسکتے۔ اس کمزوری کا اصلی سبب خیالات میں تنظیم کی عدم موجودگی اور ناکافی مشق تخیل ہے۔ اکتساب علم کی رغبت نہ ہونے کے سوا عام معلومات کی کمی بھی ہمارے کالج کے طلبا کی اٹھان میں حارج ہے اور یہ دوسرا بڑا نقص ہے۔

کلیۂ معلمین میں ایسے اساتذہ کی ضرورت نہیں ہے جو محض جان ڈیوی، جان اڈمز، تھارن ڈائک، اسپیرمن، اور ہیالر ڈ کے خیالات کو ذہن نشین کر کے امتحان میں ان کا اعادہ کردیں بلکہ ایسوں کی چاہ ہے جو علم کی روشنی میں خود کو عالم باعمل ثابت کرسکیں۔ تعلیم اور تربیت میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ صرف یہ ہے کہ اول الذکر کا مقصد علم اور ربعد الذکر کا مدعا عمل ہے اور یہ ظاہر ہے کہ تربیت بالراست تیاری ہے زندگی کی۔

کلیات معلمین کی ہندوستان میں اس شکایت کے پیش نظر کہ یہاں زیادہ تر نظریات کی تعلیم دی جاتی ہے اور عملی تعلیم کی جانب بہت ہی کم قدم اٹھایا جاتا ہے اکثر اس نوعیت کی تنقید کی جاتی ہے کہ "ایک مدرس کو چاہئے کہ وہ ٹریننگ کالج کے اصولوں کو جب وہ درس و تدریس میں مشغول ہو خیرباد کہہ دے کیونکہ اگر کوئی شخص ان کی پیروی کرتا بیٹھے تو مقررہ نصاب نہ تو وقت پر ختم ہی ہوسکتا ہے اور نہ طلبا امتحان میں اچھے جوابات ہی دے سکتے ہیں اور مدرس کو صدر مدرس اور مہتمم کا ہدف ملامت بننا پڑتا ہے۔" اس قسم کی رائے طبقۂ اساتذہ میں عام طور پر چونکہ پائی جاتی ہے اس لئے اس کے متعلق کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوسکتا لیکن اس میں اگر کوئی صداقت ہے تب تو اصولی طور پر اس میں کسی نہ کسی سُقم کا پایا جانا ضروری ہے۔ اساتذہ کی ایسی تعلیم کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا جو مدرسہ کی عملی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر نہ دی جائے اور جس میں نظریہ اور عمل کے تطابق کو فراموش کردیا جائے۔ اصول تعلیم کے متعلق کبھی بھی اس خیال کو دل میں جگہ نہیں دی جاسکتی کہ وہ محض علمی

لے مصنف کا خیال کس حد تک صحیح ہے قابل غور ہے ۱۲ مترجم

اور فنی چیزیں ہیں جو یاد کرنے اور بھول جانے کے قابل ہیں اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ آمنا وصدقنا اُن پر ایمان لا کر اندھا دھند جماعت میں ان پر عمل شروع کر دیا جائے۔ کلیۂ معلّمین میں نصاب کا خاص کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ طلباء کے خیالات کو تعلیمی مسائل پر مرکوز کر دے۔ جس کی تکمیل کے لئے دوران لکچر بحث مباحثہ کا بعض مرتبہ آغاز کر دیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی مشق اس حد تک تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے لیکن یہ امر کہ اعتراضات وہی ہوتے ہیں جو اس وقت سمجھ میں آتے ہیں اور پہلے سے سوچے ہوئے نہیں ہوتے اس قسم کی کارروائی کی قدر و قیمت کو گھٹا دیتا ہے۔ ان حالات کے تحت کسی بڑے مسئلہ پر لگاتار سوچنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔

تجربہ:۔ محولہ بالا نقائص کے رفع کرنے کے لئے جامعہ میسور میں مفصلہ ذیل تجربہ کو اختیار کیا گیا تھا کہ ہر اس امیدوار کے لئے جو کلیہ تعلیم المعلمین میں اپنے پیشہ میں حصول کمال کے لئے شریک ہوا ہو یہ لازمی گردانا گیا کہ فل اسکیپ سائز کے چالیس صفحات پر وہ ایک مختصر سا مضمون تیار کرے جو اس کے نصاب کا ایک لازمی جزو ہوگا۔ مضمون کوئی وسیع تعلیمی مسئلہ پر ہوا کرتا تھا اور اس کے لئے ۵ مہینے کی مدت معین تھی۔ کلیہ ہذا کے امیدواروں کی نہ تو کوئی خاص خصوصیت تھی اور نہ وہ مادی طور پر ان طلبا سے جدا تھے جو عموماً ہندوستان کی ہر درسگاہ میں جہاں طیلسانین زیر تعلیم ہوتے ہیں' پائے جاتے ہیں۔ یہ سب شعبۂ فنون اور سائنس کے طیلسانین تھے اور ان میں کی ایک خاص تعداد یم۔ اے کی ڈگری بھی رکھتی تھی۔ نصاب کی مدت ایک سال تھی اور مضامین سب وہی تھے جو عام طور پر ہند کی دیگر جامعات میں ہوتے ہیں۔

آغاز میقات کے چھ ہفتہ بعد مضمون کا کام آغاز کر دیا گیا تا کہ طلبا کو تعلیمی ادب سے واقف ہونے کا کافی وقت مل سکے۔ اسٹاف کی جانب سے مضامین کی ایک فہرست مرتب کی گئی اور طلبا کو اس کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنی پسند کے کسی ایک عنوان پر یا مرتبہ فہرست میں سے کسی ایک مضمون پر خامہ فرسائی کریں۔ جب ایک ہی مضمون کو ایک سے زائد نے منتخب کیا تو یہ قیاس کیا گیا کہ ہر ایک نے اس پر آزادانہ غور و فکر کیا ہوگا۔ چنانچہ مفصلہ ذیل عنوانات سے نوشتہ مضامین کی نوعیت پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

(۱) ہندوستان کے لئے تعلیم کا ایک قومی نظام (۲) جان ڈیوی کا تعلیمی فلسفہ (۳)

تعلیم انگریزی پر ورسیات کی ایک مکمل شرح (۴) تعلیم میں محرک تصاویر کی اہمیت (۵) تعلیم بالغان بلحاظ تخصیص ہند (۶) تیاری نصاب کے اصول (۷) عورتوں کے لئے ایک تعلیمی اسکیم۔

مندرجۂ بالا فہرست سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوا ہوگا کہ یہ مضامین مقاصد کے لحاظ سے کتنے مختلف النوع تھے اور ان کے لئے کتنی مختلف قسم کی کوششیں درکار تھیں۔ مثلاً ڈیوی کے فلسفۂ تعلیم ہی کو لیجئے کہ اس میں محض ڈیوی کی چند تصانیف پڑھنے اور ڈیوی پر چند کتابیں مطالعہ کرنے سے کچھ زیادہ ہی کی ضرورت تھی۔ اسی طرح ہندوستانی قومی تعلیم پر قلم اٹھانے کے لئے واقعات کی اصل بنیادیں زیادہ غور و خوض کی محتاج تھیں اور ورسیات کی شرح تیار کرنے میں تحقیق و تفتیش کی ضرورت لاحق تھی۔ غرض یہ کہ ہر قسم کے نمایاں و برتر کام میں اصل مقصد یہی تھا کہ طلبا وسیع تعلیمی مسئلہ پر باقاعدہ اور مسلسل غور و فکر کرنا سیکھیں اور اپنے خیالات کو منطقی ترتیب میں بیان کریں اور مختلف چیزوں کو ایک دلچسپ پیرایہ میں ظاہر کرسکیں۔

طلبا نے اوائل ستمبر میں مضامین کا کام آغاز کردیا اور ان سے اس کی توقع رکھی گئی کہ وہ اواخر جون تک مضامین حوالہ کردیں۔ جس طریقہ سے مضمون نویسی کا کام جلدی ہی آغاز کردینا نامناسب سمجھا گیا۔ یعنی تعلیمی دنیا سے طلباء کا خود کو روشناس کرنے سے قبل ــ اسی طرح اس کو بھی غیر موزوں خیال کیا گیا کہ اس میں اتنی طوالت دیدی جائے کہ امتحان کا زمانہ سر پہ آپہونچے اور اس کی ناز برداریوں سے انھیں فرصت نہ مل سکے حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود اس کام کو جلد از جلد نمٹ لینا چاہتے تھے اور جب اس سے واسطہ پڑا تو انھوں نے نہایت شوق سے اس کو انجام دیا اور شہر کے کتب خانوں سے استفادہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اگر ایک طرف یہ امر نہایت اطمینان بخش تھا تو دوسری طرف سال اول کا کام بہت ہی مایوس کن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ سے یہ تہیہ کرلیا گیا کہ مضامین کی تیاری میں طلبا کو محض ان کے ماخذات ہی پر نہیں چھوڑا جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سب کے سب طیلسانین تھے لیکن چونکہ شعبۂ تعلیم ان کے لئے عجیب و غریب تھا، مواد کی فراہمی اور کام کے ایک مناسب اور جنرل پلان کے بنانے میں رہبری کی صریح ضرورت تھی؛ اس لئے اسٹاف کے ممبروں نے

فرداً فرداً طلبا سے ملاقات کی اور ان کے مضامین کے خاکوں پر بحث کی جس سے یہ ہوا کہ مضامین کی مطابقت، معانی و مطالب میں ترقی ہو گئی اور چالیس صفحات سے متجاوز ہو جانے کا جو اندیشہ پیدا ہو گیا تھا وہ ابتدا ہی میں ناپید ہو گیا۔ اور جب ان میں کے چند بہتر مقالات کو شہر کی تعلیمی انجمنوں کے جلسہ میں پڑھا گیا تو اکثریت نے اپنے مضامین کی اہمیت سے واقف اور باخبر ہو کر ختم تعلیم پر ان کی واپسی کا تقاضہ بھی شروع کر دیا تاکہ آئندہ اُن سے مطالعہ اور حوالہ کے کام میں مدد لے سکیں۔

لیکن اس دوران میں اس کا بار بار احساس کیا گیا کہ وقت کی کمی کی وجہ سے اسٹاف کو تنقید کا پورا پورا موقع نہیں مل سکا چنانچہ اس سُقم کو دور کرنے اور ایک ایسا انتظام کرنے کے لئے جس سے کہ طلبا کے کام پر ایسی تنقید ہو سکے جس سے کہ وہ جلد ہی فیصلہ پر پہنچ جایا کریں اور تعلیمی مسائل کے مباحث میں انھیں حقیقت کا صحیح ادراک ہو سکے یہ حل سوچا گیا کہ انفرادی مضمون نگاری کو گروپ واری کام سے بدل دیا جائے۔

اس گروپ واری کام کے انتظام کے لئے ضروری تھا کہ جماعت کو مناسب اکائیوں میں تقسیم کر دیا جائے کیونکہ ساٹھ طلبا کی جماعت ہمارے مقاصد کا لحاظ کرتے ہوئے بہت بڑی تھی۔ دس کی تعداد مناسب سمجھی گئی اور اسی مناسبت سے جب تقسیم عمل میں آگئی تو عنوانات کی ایک مختصر سی فہرست گشت کرائی گئی اور ہر گروپ کو ایک ہفتہ کا موقع مضمون کے انتخاب کے لئے دیا گیا۔ بعد ازاں ایک لیڈر کا انتخاب عمل میں لایا گیا جس پر تمام جلسوں کے انتظام کی ذمہ داری عاید کی گئی۔

ہر ہفتہ ان مختلف جماعتوں کے جلسے عام طور پر سنیچر کے دن ہوتے اور اسٹاف کا ایک ممبر ان جلسوں میں شریک ہوتا۔ گو ابتدا ہی سے یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اسٹاف فقط سننے کے لئے آیا کرے گا نہ کر ان کی رہبری کرنے اور بحث مباحثہ میں حصہ لینے کے لئے تاہم اختتام کارروائی پر اس کی جانب سے رائے کا اظہار کیا جاتا جو مشاہدہ کی حد تک محدود ہوتا اور مشورہ اور ہمت افزائی کے الفاظ سے شاید ہی کچھ زیادہ ہوتا۔

اس قسم کا دائرۂ مطالعہ (اِسٹڈی سرکل) سابقہ عمل کی بہ نسبت کامیاب ثابت ہوا اور اس میں نمایاں ترقی بھی ظاہر ہوئی۔ اس میں محض مختلف ماخذات سے واقعات کا جمع کرنا ہی کافی

نہیں تھا بلکہ بحث مباحثہ اور غور و فکر کی بھی ضرورت تھی۔ تجربہ نے یہ بھی بتلا دیا کہ یہ ہنوز محتاج ترمیم و اصلاح ہے اور کسی طرح بھی مکمل نہیں۔ بعض اِسٹڈی سرکلز نے ایک ہی ممبر یا لیڈر کو مستقل صدر نشین بنا لیا تھا جو غیر موزوں تھا۔ اس لئے محوری انتظام کی سفارش کی گئی جس سے کہ ہر ممبر کو صدر بننے کا موقع مل سکا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر دقت یہ تھی کہ اس جماعت واری کام میں انفرادی کارکردگی اور خوبیوں کا پتہ نہیں چلتا تھا اور یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ آیا ہر ممبر نے اس میں کافی اور وافی حصہ لیا بھی ہے یا نہیں؟۔ نظر بر آں دو حل پیش کئے گئے۔ ایک تو یہ تھا کہ ہر ممبر ایک ڈائری رکھے اور دوسرا یہ کہ ہر باب یا مضمون مشترک (Joint Essay) کے ہر فقرہ یا جزو (سکشن) کا مسودہ ایک خاص ممبر کے تفویض کر دیا جائے جو اس کے بالمقابل اس کا نام درج کر دیا کرے۔

طلبا کا یہ متحدہ کام بلاشک سنین ماضیہ کے انفرادی کام کے مقابلہ میں بہتر اور اُولیٰ تھا اور اس کو بہت صاف اور جلد پڑھا جا سکتا تھا کیونکہ بڑے سے بڑا مضمون ساٹھ صفحات سے زیادہ متقضی نہیں تھا۔

غرض اس طریقہ سے اس کی ابتدا کی گئی اور طلباء نے اپنی اس عادت نارِ و کو جو اساتذہ کے اشارات، نوٹس اور مقررہ درسی کتب تک محدود تھی ترک کر دیا اور ان میں سوچنے اور اپنے خیالات کو ترتیب دینے اور دلچسپ پیرایہ میں پیش کرنے کی ایک نئی عادت نے جنم لیا۔ اور اندریں حالات مسائل پر متفقہ کام کرنے کے عمل نے جس کو "کانفرنس میتھڈ" کہنا چاہیئے اور جو آج کل بہت زیادہ مروج ہے شہرت حاصل کر لی۔ (ماخوذ)

تعاونِ مدرسہ از اولیا طلبہ[1]

از

جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب مددگار مدرسہ وسطانیہ سنگاریڈی

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدرسہ کو اولیا طلبا سے تعاون کیوں ضروری ہے۔ اس مسئلہ کی تنقیح کے لئے اغراض ومنشائے تعلیم پر نظر ڈالنی ہوگی۔ بالعموم ہم جب تعلیم کا لفظ زبان پر لاتے ہیں تو ساتھ ہی تربیت کا لفظ زبان پر آجاتا ہے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ کوئی تعلیم بغیر تربیت کے کوئی منزلت نہیں رکھتی ذمہ داران تعلیم جب کبھی تعلیمی امور پر غور کرتے ہیں تو مفاد تعلیم یعنی اخلاقی تربیت بھی ان کے پیش نظر رہتی ہے اور کسی ترقی کنان ملک کی تہذیب وشائستگی کا معیار بھی یہی ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی کردار کا حامل ہو ورنہ ایسی کوئی تعلیم جو صرف علم وخواندگی تک محدود ہو اور عملی اصلاح کا باعث نہ بنی ہو کسی شخص یا قوم کے لئے بھی سرمایہ فخر نہیں ہوسکتی اس سے مدارس کے فرائض میں اگر اضافہ ہوتا تو بھی امر پیشہ مدرسی کی اہمیت واحترام میں بھی ازدیاد کا باعث ہے۔ مگر ہر ایک مدرس کے لئے کیا ان اعلیٰ فرائض سے عہدہ برآ ہونا کچھ آسان امر ہوسکتا ہے؟ جب کہ طلبا کے اوقات کا صرف ایک چوتھائی حصہ مدرس کے زیر نگرانی صرف ہوتا ہے اور وہ بھی صرف ایام تعلیمی میں اور بقیہ ایام کے اوقات قدرتی طور پر اولیا طلبا کی نگرانی یا عدم نگرانی میں گزرتے ہیں۔ تاہم اکثر اولیا طلبا یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ تعلیم کے ساتھ تربیت کی تمام ذمہ داری بھی محض مدرسین پر ہے ہم اس نظریہ پر کوئی تنقید یا تعریض نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ہمارے پیش نظر یہ اصول کار ہے کہ مدرسین اپنے فرائض کو محسوس کرتے ہوئے اپنے طریق عمل سے اولیا طلبا کے احساس کو تازہ اور توجہات خوابیدہ کو بیدار کریں تاکہ وہ اپنی عزیز اولاد کے بہترین مفاد کے لئے مدرسین کے ساتھ اشتراک عمل فرمائیں جس کے بغیر تعلیم سے تربیتی مفاد کو حاصل کرنا ایک مسئلہ لاینحل ہی رہے گا۔

اس تعاون اور اشتراک عمل کے لئے سب سے پہلے اولیا طلبا سے ذاتی واقفیت اور خانگی تعلقات کی ضرورت ہے تاکہ مدرسین اور اولیا کے درمیان تعلیم وکردار طلبا سے متعلق تبادلہ خیالات

---

[1] انجمن اساتذہ ضلع میدک کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۵۵ف یہ رپورٹ جو ذیلی کمیٹی کی مرتبہ ہے پیش کی گئی۔

ہوسکے جو خواہ بالمشافہ ہو یا تحریری اِس کے مواقع ایک سنجیدہ اور دانشمند مدرس بیشتر مہیا کرسکتا ہے اور اس وقت اس کا استحضار مقصود ہے۔

۱۔ اولیا طلبائے سے پہلی ملاقات کا بہترین ذریعہ یہ ہوسکتا ہے کہ جب طالب علم شرکت مدرسہ کے لئے مدرسہ میں آئے تو ممکن صورت تک سرپرست کو بھی مدرسہ تک قدم رنجہ فرمانا چاہئے اِس طرح مدرس طالب علم کے ساتھ اس کے سرپرست کی ذات وخیالات سے بھی واقف ہوگا تو سرپرست مدرس اور مدرسہ سے کسی حدتک آشنا ہو جائے گا اور باہم سلام وکلام کا سلسلہ قائم ہوگا ان ملاقاتوں سے بتدریج مختلف فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں وقتاً فوقتاً طالب علم کی ضروریات تعلیمی کی طرف توجہ دلائی جاسکتی ہے نیز طالب علم کے رفتار و کردار کے متعلق ہمدردانہ گفتگو کی جاسکتی ہے۔

۲۔ اس سلسلہ میں یہ ظاہر کردیا جانا ضروری ہے کہ خود مدرس کی شخصیت ایسی ہونی چاہئے کہ عوام میں اس کا وقار قائم ہو جائے اور جب کبھی اولیا طلبائے سے ملاقات کی جائے تو مدرس اپنے وقار کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ ورنہ ایک رُکن مدرسہ کی شخصیت متاثر ہوجائے تو پورے اسٹاف مدرسہ کی نسبت قیاس آرائی کے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں اور اس لئے نہایت ضروری ہے کہ خود مدرس نیک اخلاق اور باوقار ہو جو ہر کسی کے پاس اپنی شخصیت کا اعتماد قائم کرسکے اور صرف اسی صورت میں وہ تعلیمی یا تربیتی امور میں اولیاٗ طلبا کا تعاون حاصل کرسکتا ہے۔

۳۔ اولیا طلباء کا تعاون حاصل کرنے کے لئے یہ امر بھی ضروری ہے کہ مدرسہ کی تعلیمی اور انتظامی حالت ایسی ہو کہ کسی کو نکتہ چینی کا موقع نہ مل سکے اور ناواقفیت کی بناء پر کوئی نکتہ چینی کی جائے تو اس سے متعلق خندہ پیشانی سے افہام وتفہیم کی جائے کہ جس سے متعرض مطمئن ہو جائے۔

۴۔ طلبا کی غیر حاضری از مدرسہ کی عادت نہ صرف ان کی تعلیمی نقصان کا باعث ہوتی ہے بلکہ اخلاقی خرابیوں کے پیدا ہونے کا باعث بھی زیادہ تر یہی ہے۔ عموماً اولیا طلبا اس سے بے خبر رہتے ہیں کہ بچہ مدرسہ میں پڑھ رہا ہے یا کسی گلی یا کھیت میں دوسرے بے تربیت لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

انسداد غیر حاضری اور اصلاح وتربیت ہر دو اُمور کے مدنظر نہایت ضروری ہے کہ طالب علم کی حاضری اور اس کے تعلیمی کام سے سرپرست کو وقتاً فوقتاً آگاہ کیا جاتا رہے اور کوئی سرپرست ایسا نہ ہوگا کہ حقیقت حال سے آگاہ ہو کر بھی کوئی توجہ نہ کرے اس کی بہتر صورت یہ ہوگی کہ ماہانہ

امتحانات کے نتیجہ اور اوسط حاضری سے سرپرست کو باضابطہ اطلاع دی جائے اور دستخط اطلاعیابی حاصل کی جائے نیز ہفتہ میں ایک بار طلبا کے ہوم ورک پر سرپرستوں کے دستخط حاصل کئے جائیں تاکہ وہ اپنے بچوں کے رفتار تعلیمی سے وقتاً فوقتاً آگاہ ہوتے رہیں۔ اور انھیں خوامخواہ تعلیمی امور سے دلچسپی پیدا ہوجائے۔

۵۔ اولیا طلبا سے وقتاً فوقتاً ملاقات کا ایک بہترین ذریعہ یہ ہوگا کہ مدرسہ میں علمی اور معاشرتی جلسے منعقد کر کے اولیا طلبا کو بھی مدعو کیا جائے مثلاً طلبا کے ماہانہ تعلیمی جلسوں میں سرپرستوں کو بھی شریک کیا جائے اور کبھی کبھی ان ہی میں سے کسی ایک کو صدر جلسہ بنایا جائے۔ مدرسہ کے سالانہ جلسہ اور سالگرہ مبارک کے جلسوں میں بالعموم اولیا طلبا شرکت فرماتے ہیں۔ ایسے مواقع پر بھی اولیا طلبا ہی سے کسی کو صدر کا امتیاز دینا چاہئے اور ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر مدرسہ کے نصابی اور غیر نصابی مشاغل اور کارہائے نمایاں کا مظاہرہ کرنا چاہئے تاکہ اولیا طلبا میں مدرسہ کی طرف سے اعتماد اور دلچسپی و ہمدردی پیدا ہو۔ نیز عیدوں اور تہواروں کے مواقع پر بھی مدرسہ میں اولیا طلبا کے ساتھ اجتماعی ملاقات کا انتظام کرنا چاہئے کہ ایسی بے تکلف اور برموقع ملاقاتوں سے تعلقات میں استواری اور مطمح نظر میں یکسانیت پیدا ہوگی جو ہر آئینہ تعلیمی اور تربیتی مقاصد میں ممد و معاون ہوگی۔

۶۔ یہ ظاہر ہے کہ ملک کی اکثریت غربت اور جہالت میں مبتلا ہے اور کسی تعلیمی ادارہ کا مقصد اولین یہی ہے کہ اس عام جہالت کو ملک سے دور کرنے میں اپنے حصہ کے فرض کو ادا کرے اور یہ امر سعی بلیغ، محنت شاقہ اور حکمت و تدبر کا طالب ہے اور اس کے ساتھ ایثار و قربانی کا بھی۔ کیونکہ اشاعت تعلیم میں بڑی سد راہ عام غربت ہے جو ملک کے عام طبقہ کو علم سے کماحقہ بہرہ ور نہیں ہونے دیتی۔

برادران پیشۂ معلمی خوب جانتے ہیں کہ طلبا سے معمولی فیس تعلیمی اور سامان تعلیمی کی فراہمی کتنی دشوار ہوتی ہے تاہم ہم خیال کرتے ہیں کہ اس دشواری اور مجبوری کا زیادہ سے زیادہ احساس کرنے کی بجائے ایثار و ہمدردی کے جذبات کو تیز کردیں تو بہت ساری مشکلات حل ہوجائیں۔ ہم اپنی ممکنہ حد تک اگر طلبا اور اولیا طلبا سے زبانی اور عملی ہمدردی کا برتاؤ کریں مثلاً مدرسہ کے امدادی فنڈ سے ایسے طلبا کے ضروریات تعلیمی کو پورا کریں اور اپنے خانگی اوقات میں اولیا طلبا کے مشکلات کو بھی دور کرنے کی کوشش کریں نیز مقامی اہل خیر کو ایسی امداد و ہمدردی کی طرف اکسائیں تو نہ صرف مدرسہ کے تعلیمی کام میں سہولت کا باعث ہوگا۔ بلکہ اولیا طلبا کی نظروں میں مدرسہ اور مدرس کے وقار و شخصیت کے ترفع و جاذبیت کا موجب ہوگا اور جو نتیجۃً باوصف ایسے سقیم حالات

معاشی کے اشاعت تعلیم اور مقبولیت تعلیم کے ثمرات پیدا کرے گا۔

۷۔ طلباء سے عام طور پر اُنس و ہمدردی کا یہ اقتضا ہے کہ مدرس جب کبھی کسی طالب علم کو مضمحل غیر متوجہ اور حالت تکان میں پائے تو اس کی وجہ معلوم کرنے کی فکر کرے کیونکہ ان کیفیات کے زیادہ تر باعث ان کے خالی اوقات کے بیجا مشاغل ہوتے ہیں۔ اولیاء طلباء سے اِس بارہ میں دریافت و گفتگو نہ صرف طلباء کی اصلاح حال کا موجب ہے بلکہ طلباء سے آپ کی یہ دلچسپی بالواسطہ اولیاء طلباء پر بھی اثر انداز ہوگی اور ان سے تعاون و اشتراک عمل کا ایک ذریعہ بنے گی۔

۸۔ جن مدارس میں طلباء کا باضابطہ معائنہ طبی ہوتا ہے اس سے طلباء کو اگر حقیقی فوائد بہم پہنچائے جائیں یعنی طلباء کے نقائص صحت کا مواد مرتب رکھکر سہل العلاج شکایات کا انسداد خود مدرسہ کرے اور بار بار اولیاء طلباء کو بھی توجہ دلاتا رہے اور انھیں طبی ہدایات کے بموجب طالب علم کے خواب و خور اس کا بھی نگران بنائے۔ اس طریق عمل کی پابندی سے طلباء کی عام صحت ترقی کرے گی جو ان کی تعلیمی رفتار پر بھی بہتر اثر مرتب کرے گی اور ساتھ ہی اولیاء طلباء قدرتاً اپنی عزیز اولاد کی اس نگہداشت کی کچھ قدر ہی کریں گے۔ اور اس طرح ان کو مدرسہ سے بیش از بیش دلچسپی پیدا ہو کر رہے گی۔

۹۔ کوئی ادارہ جو ضروریات زمانہ اور دُنیا کی رفتار ترقی کا ساتھ دینا چاہتا ہے اپنے آپ کو ایک موضوعہ حالت میں قائم نہیں رکھ سکتا بلکہ اس میں تجدد و تبدیلی آئے دن ہوتی رہتی ہے ہمارا سررشتہ تعلیمات بھی ان ہی مراتب و منازل کو تیز گامی سے طے کر رہا ہے۔ نئے نئے مسائل زیر بحث آتے ہیں جدید اُصول تعلیم کو زیر تجربہ لایا جاتا اور انھیں ماحول کے مطابق بنانے کی سعی کی جاتی ہے۔ تبدیل نصاب پر کیا خواندہ اور کیا ناخواندہ اولیاء طلباء تیز و ترش تنقید اور اعتراض کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر سررشتہ کی تعلیمی پالیسی اور مطمح نظر نیز مضامین نصاب اور کتب نصابی کی مناسبت و موزونیت کے بارہ میں مدرس کو بہت ہی صبر اور باخبری کے ساتھ گفتگو کرنی چاہئے۔ اور بجائے اختصار کلام کے سیر حاصل توضیح و تفہیم کے ذریعہ ان تبدیلیوں کا مفاد معترض کے ذہن نشین کرنا چاہئے تاکہ مدرسہ کی تعلیم کو عام مقبولیت حاصل رہے جس کے بغیر اولیاء طلباء سے تعاون عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

۱۰۔ مدرسین کی ان تمام مساعی کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ دورہ کنان عہدہ داران تعلیمات بھی حین معائنہ مدارس ایک پبلک جلسہ کا انعقاد کیا کریں جس میں اولیاء طلباء کو خاص طور پر مدعو کیا جائے۔

یہ جلسے نیم رسمی کیفیت کے ہونے چاہئیں یعنی صرف مفادِ تعلیم یا اخلاقی تربیت یا فراہمی طلبا پر موقوف و منحصر تقاریر ہی نہ ہونی چاہئیں بلکہ اِس کے سوا زیادہ وقت اولیاء طلباء سے انفرادی گفتگو اور ان کے ضروریات و مشکلات کو معلوم کرنے اور حل کرنے میں صرف کیا جائے اور یہ امر عہدہ داران کے پروگرام کا ایک لازمی جزو ہو۔

ہم خیال کرتے ہیں کہ عہدہ داران کی ایسی توجہات اور مساعی مدرسین کے لئے دلیل راہ ہونگی، اور اس سے مدرسہ کے ساتھ عوام کے تعاون عمل کی راہیں کھل جائیں گی سب کمیٹی کی رائے میں یہ وہ صورتیں ہیں جن سے مدرسہ اولیاء طلباء کا تعاون حاصل کرسکتا ہے۔ (مُرتبہ کمیٹی)

تنقید و تبصرہ

رسالہ ساقی دہلی:- یہ ماہوار رسالہ زیر ادارت جناب شاہد احمد صاحب بی۔اے (آنرس) نبیرۂ شمس العلما مولانا مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم دہلی سے شائع ہوتا ہے اور تقریباً بارہ سال سے ملک کی ادبی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے مضامین عام طور پر دلچسپ ہوتے ہیں اور مختلف مذاق کے مدنظر اِن میں اچھا خاصا تنوع ہوتا ہے۔ زبان صاف ستھری ہے۔ ہندوستان کے نامور اور مشہور ادیبوں کے شاہکار اس میں جگہ پاتے ہیں جس کی وجہ سے رسالہ کا معیار بلند ہے۔ انگریزی زبان کے بہترین افسانوں کا ترجمہ بھی بہت خوبی سے پیش کیا جاتا ہے۔ جن کے انتخاب میں خوش مذاقی سے کام لیا جاتا ہے اس لحاظ سے افسانوں کا مجموعہ دلکش ہوتا ہے۔ مگر قومی اور تمدنی افسانوں کا فقدان ہے۔ ہماری رائے میں حالات و ضروریات کے مدنظر تمدنی اور قومی رنگ غالب ہونا چاہئے۔ اس سے جو فوائد حاصل ہوں گے وہ قابل لحاظ ہیں۔ ہم نے علمی مضامین کی کمی بھی محسوس کی ہے جس کا ہونا ضروری ہے۔ بحیثیت مجموعی رسالہ دلچسپ ہے اور فاضل مدیر قابل مبارک باد ہیں کہ ساقی نے کامیابی کے ساتھ اپنی زندگی کے گیارہ سال پورے کرلئے اور بارہویں سال میں قدم رکھا ہے۔ امید ہے کہ مدارس کے اساتذہ و طلبہ اس رسالہ کے مطالعہ سے مسرور ہوں گے۔

رسالہ کا چندہ صہ ر کلدار سالانہ ہے۔ ہر سال اہتمام کے ساتھ دو خاص نمبر بھی شائع کئے جاتے ہیں مستقل خریداروں سے ان کی کوئی قیمت الگ نہیں لی جاتی۔

شذرات

سالانہ ٹورنمنٹ مدارس ضلع بیدر ۱۳۵۱ف

حسب سابق امسال بھی ٹورنمنٹ میں مقامی عہدہ دار صاجان اور معززین نے کافی تعداد میں شرکت فرمائی۔ گیمس اور اسپورٹس کے مقابلے نہایت دلچسپ رہے۔ باہر سے آنے والی ٹیموں کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا جناب مولوی غلام محی الدین صاحب اول تعلقدار و دیگر عہدہ دار صاجان ضلع اور معززین نے ٹورنمنٹ کو کامیاب بنانے میں کافی حصہ لیا اور ہر طرح کی امداد فرمائی۔ اسی سلسلہ میں ایک مشاعرہ بھی کیا گیا جس میں نامور شعراء نے شرکت کی۔ جناب مولوی سید مہدی صاحب منصف اودگیر نے صدارت فرمائی۔

تقسیم انعامات سے پہلے مولوی سید محمد صاحب نے روئداد ٹورنمنٹ سنائی۔ اس کے بعد جناب اول تعلقدار صاحب نے جیتنے والی ٹیموں کو انعامات تقسیم فرماتے ہوئے ایک جامع تقریر فرمائی۔ آخر میں مالک مجازی اعلیٰ حضرت آصف سابع کی درازی عمر و اقبال کی دعا کی گئی اور جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

تعلقہ واری ٹورنمنٹ جنگاؤں ۱۳۵۱ف

مستقر تعلقہ جنگاؤں ضلع نلگنڈہ کا سالانہ دوسرا تعلقہ واری ٹورنمنٹ بصدارت جناب تحصیلدار صاحب بتواریخ ۷، ۸ ار بہمن ۱۳۵۱ف منعقد ہوا۔ جس میں بہت سے مدارس شریک رہے اور جیتنے والوں کو انعامات دئے گئے۔

جلسہ انجمن اساتذہ مدرسہ فوقانیہ بیدر شریف

انجمن اساتذہ کا ماہواری جلسہ بصدارت جناب شریف الحسن برنی صاحب ۳۰ ر آبان ۱۳۵۱ف کو منعقد ہوا سب سے پہلے مسٹر چھگن لال نے بیسک انگریزی میں نمونہ کا سبق دیا۔ بعد ازاں مسٹر کرشنا چاری نے

انتظام مدرسہ میں طلبا کا حصہ" پر تقریر فرمائی۔ اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ملک کی ترقی کا دار و مدار طلبا پر ہے اس لئے ضروری ہے کہ مدرسہ طلبا کو جسمانی، عقلی اور روحانی طور پر مکمل بنائے اور نوعیت کار کے مختلف طریقے بتاتے ہوئے فرمایا کہ طلبا سے روزانہ معمولی کاروبار مدرسہ اور خاص خاص جلسوں کے انتظام میں مدد لی جائے تعلیمی سفر کے ذریعہ ان کے معلومات میں اضافہ کیا جائے۔ اور رفاہ عام کے کاموں میں ترغیب دلائی جائے۔ مختصر یہ کہ مدرسہ پروجکٹ میتھڈ پر چلایا جائے تو بہت کچھ فائدہ ہوسکتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ طلبا میں موسیقی کا شوق زیادہ ہوتا ہے اس کو ڈراموں کے ذریعہ ابھارا جائے اور ڈراموں کی آمدنی سے پور فنڈ قائم کر کے غریب طلبا کی مدد کی جائے۔

جناب صدر نے آخری فقرہ سے خاص وجوہ کی بناء پر اختلاف فرمایا اور انتظامات مدرسہ میں طلبا کی رائے حاصل کرنے پر زور دیا۔ دوسرا جلسہ ۳۰ آذر ۱۳۴۵ف کو منعقد ہوا۔ مولوی شاہ اسمٰعیل صاحب قادری نے "نصاب تعلیم میں عملی کام کی اہمیت" پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ تعلیم کا مقصد طلبا کو عملی زندگی کے لئے تیار کرنا ہے۔ جس کے لئے حسب ذیل چند مفید تجاویز پیش کرتے ہوئے ہر ایک پر مفصل بحث فرمائی۔ جن کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) حساب کو روزمرہ زندگی سے وابستہ کرنا تاکہ طلبا خرید و فروخت، بازاری نرخ اجناس کا بھاؤ اور شرح سود وغیرہ سے واقف ہوجائیں۔

(۲) سائنس کی تعلیم میں مطالعہ قدرت کو چھوٹی جماعتوں میں ضروری سمجھنا۔ اور طلبا میں ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی عادت ڈالنا۔

(۳) جغرافیہ میں اول گھریلو جغرافیہ پڑھایا جائے۔ تاکہ طلبا اپنے ماحول اور اپنے وطن اور ضلع کے حالات سے واقف ہو کر دنیا کا سیاسی اور طبعی جغرافیہ سمجھ سکیں۔ طبعی جغرافیہ میں مشاہدوں اور تجربوں کا خاص خیال رکھا جائے۔ نقشوں اور خاکوں سے پوری طرح استفادہ کرایا جائے۔

(۴) تاریخ میں مقامی تاریخ اور مقامی حالات و حکومت بتانا، تاریخی مقامات کا مشاہدہ کرانا اور نقشہ کشی کی اہمیت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کو ترغیب دیکر تاریخی ذخیرہ مدرسہ میں جمع کرایا جائے۔ مثلاً سکہ جات قدیم پوسٹ کارڈ، ٹکٹ، فانوسی شیشے وغیرہ۔

اس کے بعد مسٹر کرشنا چاری نے نصاب تعلیم میں عملی کام کی اہمیت بتاتے ہوئے تین طریقے بتائے۔

(۱) بیسک میتھڈ (۲) پراجکٹ میتھڈ (۳) سلائیڈ میتھڈ۔ اور فرمایا کہ آجکل کی تعلیم میں حرکی قوت مفقود ہونے سے ناقص سمجھی جاتی ہے۔ عملی کام اس قوت کو بیدار کرسکتا ہے۔ چنانچہ واردھا اسکیم کا مقصد بھی طلبا میں عملی کام کا شوق پیدا کرنا ہے تاکہ ساتھ ساتھ روزمرہ زندگی کے عملی کاروبار سے طلبہ واقف ہوجائیں۔

آخر میں جناب صدر نے موضوع متعلقہ پر تقریر کرتے ہوئے عملی کام کو ذہنی مشاغل کی حد تک محدود ٹھیرایا ہے۔

ٹورنمنٹ مدارس ضلع نلگنڈہ بابتہ ۱۳۵۱ف

۵ بہمن ۱۳۵۱ف سے ٹورنمنٹ مدارس وسطانیہ ضلع نلگنڈہ کا آغاز ہوا۔ بمقابلہ سنین ماضیہ سال حال اس ٹورنمنٹ کے انتظامات شاندار اور اعلیٰ پیمانہ پر کئے گئے۔ بازیگاہ مدرسہ فوقانیہ کے وسط میں پنڈال قائم کیا گیا اور اس سے کچھ فاصلہ پر اسکوٹس خواتین کھلاڑیوں اور طبی امداد کے ڈیرے نصب کئے گئے تھے۔

۵ بہمن ۱۳۵۱ف کو صبح جناب ناظم صاحب عدالت ضلع نلگنڈہ نے پرچم آصفی کی سلامی کے بعد ٹورنمنٹ کا افتتاح فرمایا۔ کھلاڑیوں نے اپنے مخصوص یونیفارم میں مارچ پاسٹ کیا اس کے بعد کھیلوں کا آغاز ہوا مسلسل پانچ روز تک صبح و شام فٹ بال، ہاکی، والی بال اور اسپورٹس کے مقابلے ہوتے رہے۔ جس میں اساتذہ صاحبان نے بھی حصہ لیا۔ ۹ بہمن ۱۳۵۱ف کو جوبیلی کا دن تھا اول الذکر تین مقابلوں میں مدرسہ فوقانیہ کی ٹیمیں اور اسپورٹس کے پانچ مقابلوں میں مختلف مدارس کے کھلاڑی کامیاب رہے۔ ۶ بہمن کو طلبا کے تقریری مقابلے ہوئے جن میں وسطانیہ دیورکنڈہ اول اور فوقانیہ نلگنڈہ دوم رہا۔ بتاریخ ۷ بہمن اسکوٹس کے مقابلوں میں فوقانیہ نلگنڈہ اول اور وسطانیہ سریاپیٹ کی ٹروپ دوم رہی۔ جناب اول تعلقدار صاحب ضلع نلگنڈہ نے جلسہ تقسیم انعامات کی صدارت فرمائی جس میں عہدہ داران مقامی، معززین، شرفاء و کلاء و اساتذہ صاحبان شریک رہے۔ جناب صدر نے جیتنے والی ٹیموں اور کھلاڑیوں کو انعامات تقسیم فرمائے جناب مہتمم صاحب

تعلیمات و میر مجلس ٹورنمنٹ نے ضرورت اور فوائد ٹورنمنٹ پر ایک پر مغز تقریر فرمائی اور عہدہ داران و منتظمین ٹورنمنٹ کا شکریہ ادا کیا اور ترانہ کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

یوم والدین مدرسہ تحتانیہ موضع ہوکرانہ بتاریخ ۱۴ ار دی ۱۳۵۱ف بہ وقت ۲ ساعت دن زیر صدارت مسٹر گنپت راؤ صدر مدرس یوم والدین منایا گیا مدرسہ کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا اور ایک شاندار اسٹیج بھی تیار کیا گیا تھا۔ جلسہ میں معززین و سرپرست طلبا معہ اسٹاف شریک تھے۔ حمد باری تعالیٰ و پرارتھنا کے بعد جلسہ کا آغاز ہوا موجب پروگرام ایک طالب علم نے تربیت اطفال پر ایک پر اثر مقالہ پڑھا دوسرے و تیسرے نے "بالترتیب بڑوں کا کہنا مانو اور خدا کی بزرگی" پر نہایت دلچسپ پیرایہ میں نظمیں پڑھیں و نیز وطن کی محبت پر بھی ایک نتیجہ خیز مقالہ پڑھا گیا۔ مدرسہ کھرڑہ بزرگ کے چند طلبا نے نتیجہ خیز اشعار ایکشن سانگ کے طور پہ پڑھے۔ مدرسہ مذکور کی ایک کمسن لڑکی نے رقت آمیز آواز میں مرہٹی نظم سنائی۔ ایک اور طالب علم نے علم پر بہ زبان مرہٹی تقریر کی۔ ازاں بعد صدر مدرسہ کھرڑہ بزرگ نے علم و عمل پر ایک مقالہ پڑھا جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد صدر مدرسہ ہوکرانہ نے اسٹاف مدرسہ کی تعلیمی مشکلات اور اس کے حل کے تدابیر پر بسیط اور پر از معلومات تقریر فرمائی۔ صاحب موصوف نے کہا کہ ایک عقلمند سرپرست اپنا حقیقی جانشین قائم کرنے کے لئے اپنی ساری کمائی بچوں کے لئے وقف کر دیتا ہے جو آئندہ حقیقی معنوں میں اس کا بہترین سرمایہ زندگی بن جاتا ہے۔ آخر میں صدر نشین جلسہ نے بزبان مرہٹی سرپرست طلبا و مدرسین کے گہرے تعلق کو واضح کرتے ہوئے متمول اصحاب اور اولیا طلبا کو تعلیمی امداد کے لئے پور فنڈ کے متعلق بطور خاص توجہ دلائی جس کا حاضرین پر خاصا اثر ہوا۔ بادشاہ وقت کی صحت و سلامتی کے بعد جناب صدر نے اپنی دل پذیر تقریر ختم کی۔ بعد برخاست جلسہ طلبا میں شیرینی تقسیم کی گئی۔ جملہ مدرسین صاحبان جو شریک جلسہ تھے منجانب مدرسہ ان کے اکل و شرب کا انتظام کیا گیا۔ اس طرح یہ جلسہ کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

روئیداد کانفرنس انجمن اساتذہ ضلع میدک ۱۳۵۱ف بتاریخ ۵ و ۶ ر ۱۳۵۱ف کانفرنس کا انعقاد بصدارت جناب مولوی ذوالفقار علی خاں صاحب مہتمم تعلیمات ضلع میدک بمقام جوگی پیٹھ عمل میں آیا۔ جس میں خطبۂ استقبالیہ جناب

تحصیلدار صاحب نے پڑھا۔ آپ نے تعلیم کی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی جس کے بعد معتمد انجمن نے سالانہ رپورٹ سنائی مولوی عبد القیوم صاحب صدر مدرس سنگاریڈی کے انتقال پر اظہار ملال کیا گیا۔ اور باری وار طریقہ تعلیم کی سب کمیٹی کی سفارشات کی بنا پر نظامت تعلیمات نے اشاعت اسباق تجدید اختیار کرنے کی بجائے بہ تبدیل تواریخ استعمال کرنے کی جو منظوری صادر فرمائی اس کا ذکر کیا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ سال گزشتہ ۱۸ انجمنیں تھیں اب ۱۹ مراکز پر انجمن قائم ہیں۔ گشتی کتب خانے کے لئے (۱۰۶) کتب مبلغ (۱۱ ؎) کے خرید کر ۶ مراکز میں ایک ایک صندوق گشت کرایا جائیگا۔

صدر کانفرنس نے فرمایا کہ اس سال مدارس کے فرنیچر اور تعمیر امکنہ و آلات تعلیمی کے لئے کافی رقوم سررشتہ سے منظور ہوئیں جس سے بڑی حد تک ضروریات مدارس کی تکمیل ہو سکے گی۔ مدارس کے اوقات فرصت اور غیر سررشتہ کے عہدہ داروں کے تعاون عمل سے تعلیم میں ترقی ممکن ہے۔ تعلیم و تربیت، ڈرائینگ اور دستکاری پر بھی تقریریں ہوئیں۔

صدر مدرس صاحب جوگی پیٹھ نے جماعت ہشتم کو انگریزی ادب پر سبق دیا۔ مولوی انوار الحسن صاحب مددگار رسدی پیٹھ نے جغرافیہ پر جماعت سوم کو نمونہ کا سبق پڑھایا۔

آخری اجلاس میں جناب مددگار صاحب انجمن امداد باہمی نے تنظیم دیہی پر تقریر فرمائی۔ مولوی سعید بن علی صاحب مددگار جوگی پیٹھ نے ضبط مدرسہ پر تقریر کی۔

رپورٹ سب کمیٹی بعنوان ورزش جسمانی :-

مہتمم صاحب تعلیمات ضلع میدک کی تحریک پر فزیکل ٹریننگ کا شارٹ کورس قائم کیا گیا۔ ۱۵ اساتذہ ٹرینڈ کئے گئے۔ انھیں فرسٹ ایڈ کی تعلیم بھی دی گئی۔ چنانچہ مسٹر ویرسنگیا مدرس مدرسۂ ابتدائیہ کولکور نے ایک غرقاب بچے کی جان بچائی۔

اساتذہ کے دستی مشاغل اور ڈرائنگ کی ٹریننگ کے لئے بھی تحریک کی گئی۔ آخر میں صدر جلسہ نے فزیکل ایجوکیشنل اور فرسٹ ایڈ کی اسناد کامیاب اساتذہ صاحبان میں تقسیم کیں۔ اور نمائشی انعامات میں تمغہ جات وغیرہ تقسیم کئے۔ بتاریخ ۴ و ۷ رہبن ۱۳۵۱ف ٹورنمنٹ ہوئے۔

کانفرنس اساتذہ ضلع کریم نگر ۱۳۵۱ف بتاریخ ۷ رہبن ۱۳۵۱ف بصدارت اول تعلقدار صاحب کانفرنس کا آغاز ہوا۔ چار سو سے زائد اساتذہ صاحبان

وحاضرین سے پنڈال پُر تھا۔ مولوی سید عبد العظیم صاحب صدر مدرس حضور آباد نے خطبہ استقبالیہ سنایا۔ اور سررشتہ کی تعلیمی جد و جہد کا تفصیلی اظہار فرمایا۔ جس کے بعد حسب تحریک جناب ہتمم صاحب تعلیمات ایک منٹ کے لئے حاضرین نے استادہ ہو کر متوفی اساتذہ کی تعزیت ادا کی۔

شریک معتمد نے انجمن کی رپورٹ سنائی۔ آپ نے مدرس کی اہمیت اور کانفرنس کی غرض و غایت بیان کی۔

صدر جلسہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں اساتذہ کو مفید مشوروں سے مستفید فرمایا۔

ہتمم صاحب تعلیمات نے "کامیاب نظم مدرسہ" پر تقریر کی۔ اور صدر مدرس و مددگاروں کے اتحاد عمل پر زور دیا۔

مسٹر ستیا نارائن مورتی صدر مدرس منتھنی نے انگریزی پر نمونہ کا سبق پڑھایا۔ نظم "نونہالوں سے خطاب" دلچسپی سے پڑھی گئی۔ اور دیہی مدرسین کے مشکلات اور ان کے حل پر تقریر ہوئی۔

دوسری ہیئات میں دیہی مدارس میں مجالس دیہی کے قیام پر غور کیا گیا۔ اور محمد حافظ صاحب نے تلنگی نظم پر نمونہ کا سبق نیز مولوی حسن مسعود صاحب نے زبان اردو میں طلبا کی غلطیاں اور ان کے ارتفاع پر تقریر کی۔

۸ر بہمن ۱۳۵۰ف کو مولوی عبد اللطیف صاحب فاضل نے مدرسہ میں نظم کی جمالیاتی اہمیت پر زور دیا۔ جناب عبد القادر صاحب نے تنظیم مدارس تحتانیہ سے متعلق گورنمنٹ کی پالیسی بیان کی۔ عبد اللطیف صاحب نے بیسک ہندوستانی کے نمونے پیش کئے۔ محمد وزیر صاحب کا جدید طریقہ تعلیم اردو دلچسپ رہا۔ ایک ڈرائینگ ماسٹر صاحب نے مدارس تحتانیہ میں ڈرائینگ کی ضرورت ظاہر کی۔ مسٹر رام کشن راؤ نے مدرسین و تنظیم دیہی پر تقریر کی۔

سب سے آخر صدر جلسہ نے نمائش کے انعامات تقسیم فرمائے۔

۵ و ۶ر بہمن ۱۳۵۰ف کو ٹورنمنٹ ہوئے اور ۹ر آبان ۱۳۵۱ف کو جناب ناظم صاحب عدالت ضلع نے انعامات ٹورنمنٹ تقسیم فرمائے۔

جلد ۱۶ شمارہ ۳

کانفرنس نمبر

زیر سرپرستی جناب سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔اے (آکسن) ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

صدر انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

کا

سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ اسفندار لغایتہ اردی بہشت سنہ ۱۳۵۱ف

فہرست مضامین

جلد ۱۶ شمارہ ۲

خطبۂ استقبالیہ

پانچویں سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی

از

جناب مولوی فیض الدین صاحب۔ ایم، اے، بار ایٹ لا،

صدر محترم۔ خواتین و حضرات منعم حقیقی کا شکر و احسان ہے کہ اس عام بے چینی کے زمانہ میں بھی ہم انتہائی امن و اطمینان کی زندگی گزار رہے ہیں چنانچہ تعلیمی مسائل پر غور کرنے اور ملک و قوم کے ہونہار طلبہ کی ترقیوں پر روشنی ڈالنے اور انکی بہتری کے اسباب میں اضافہ کر سکنے لئے ہم آج اس کانفرنس کی شکل میں یہاں جمع ہوئے ہیں یہ سارا اطمینان ہمارے مالک حقیقی کے بعد مالک مجازی ہمارے ظل اللہ کی بیشمار عنایتوں کا ایک نتیجہ ہے جسکی منت شناسی ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے خداوند عالم ایسے شاہ فیجاہ کے سایہ کو تا دیر گاہ ہم سب کے سروں پر قائم رکھے آمین ثم آمین

خواتین و حضرات میں کسی انکسار یا مبالغہ سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر کے خدمات انجام دینے کیلئے مجھ سے بہتر ہستیاں موجود تھیں لیکن انجمن اساتذہ نے میرا انتخاب فرمایا جسکا دل سے شکر یا ادا کرتا ہوں۔ اور استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے جملہ حاضرین کیخدمت میں خوش آمدید کہتا ہوں خصوصًا عالیجناب صدر نشین کانفرنس کا بیحد شکر گزار ہوں کہ آپنے گوناگون مصروفیات کے باوجود اس کانفرنس کی صدارت کو قبول فرما کر ہم پر ایک یادگار احسان فرمایا ہے۔

حضرات! یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہمارے ملک کی تاریخ تعلیم میں دورِ حاضر کا زرین ورق نشاۃ جدیدہ کے نام سے موسوم ہو سکے گا۔ یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ محض مذہبیات، اخلاقیات اور نشو و نمائے جسمانی کی تکمیل و تقویت ہی سے انسان کارآمد سمجھا جائے۔ یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ ادبیات اور منطق و فلسفہ کے مبادی کا طالب علم فارغ التحصیل کہلا سکے۔ فی زمانا متذکرہ بالا علوم و فنون کا کما حقہٗ احترام کرتے ہوئے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں، ہر شعبۂ حیات میں وقفیت اور پیش قدمی طالب علم کا شعار گردانی جا رہی ہے۔ پچھلے زمانہ کے لوازم کچھ اور تھے۔ آج کل کی ضروریات کچھ اور ہیں۔ زمانۂ حاضر میں آمد و رفت کی آسانیاں، حمل و نقل کی سہولتیں، معلومات کے عالم محیط، دور رس، ذرائع تجارتی ہم کاری۔ بہ الفاظِ دیگر رفتار زمانہ ساری دنیا کو قریب سے قریب تر کرتی جا رہی ہے۔

اس لئے فطرت انسانی کے یہ مطالبات ہیں کہ جہاں طالب علم فنِ ادبیات کی تعلیم پائے وہیں اپنے اطراف واکناف کی ضروری زبانوں کو بھی سیکھے۔ جہاں شعر وسخن کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہو وہاں ریاضیات کی گتھیوں کو بھی سلجھا سکے۔ جہاں جغرافیہ کے چٹیل اور شاداب میدانوں۔ سمندر کے مدوجزر اور پہاڑوں کی نشیب وفراز پر سر دھنے وہاں تاریخ کی روشنی میں جغرافیہ کے ربط سے قوموں اور نسلوں کی ترقی وتنزّل کے مد نظر اپنے لئے راہ عمل بھی تلاش کرے۔ جہاں سائنس کی حیرت انگیز ترقیوں سے وابستہ رہے وہاں اپنے نشۂ مادّیت کو دینیات واخلاقیات کی روح افزا چاشنی سے فرو بھی کرتا جائے کہ اسی چاشنی کی کمی نے آج عالم حاضر کو وہ سیر ظلمات کرادی ہے جسے ہم دوسرے دیکھ رہے ہیں۔

طالب علم جہاں حسن افزا نقشہ کشی سے جمالیاتی حِس کو ترقی دے وہاں کتّائی تکمیل کود اور ورزش جسمانی کی مدد سے صنعت وحرفت اور دستکاری کے لئے بھی مضبوط دست و بازو پیدا کرے۔

زمانہ کی اس آواز پر ہمارے سررشتہ نے لبّیک کہا۔ ہر عنوان کے مضامین نصابِ تعلیم میں رکھے۔ ان ہی نقطہ ہائے نظر سے ضروریات نسوانی کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ مدارس نسوان کے معائنوں اور دیگر متعلقہ ضروریات کے تصفیوں کے لئے مہتممات مامور کی گئیں۔ ایک مہتممہ جس سہولت اور صحت کے ساتھ مدرسہ نسوان کا معائنہ کر سکتی ہے وہ ایک مہتمم کے لئے بڑی حد تک دشوار ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بیان کردہ عنوانات مضامین کو جب انسانی مطالبات قرار دیا گیا جن کی حقیقت اور اہمیت کو سررشتہ نے بخوبی محسوس کیا تو اسی وسعت نظر سے انسان کا وہ کمزور طبقہ بھی خارج نہ رہ سکا جسے معذور کہتے ہیں۔ کرشمۂ فطرت تو یہ تھا کہ بعض انسان مجبور اور دوسروں کے محتاج پیدا ہوں لیکن ہماری مہربان حکومت نے ان کا بھی دکھ درد گھٹانے سے غفلت نہیں برتی۔ گونگے اور بہرے بچوں کے لئے بھی ایک مدرسہ قائم کردیا گیا ہے۔ اگر فطرت نے انھیں بعض حواس سے آراستہ نہیں کیا تھا تو حکومت نے انھیں ضیائے علم سے روشنی حاصل کرنے کے مواقع بہم پہونچا دئے۔

سماجی فیصلہ بھی سن لیجئے کہ ایک طبقہ پست اقوام کا بھی ہے معصوم بچہ پیدائش ہی سے اچھوت کہا جاتا ہے۔ کیا یہ نوع انسان نہیں؟ کیا یہ ملک کا نونہال نہیں؟ کیا یہ ملک کا خادم نہیں؟ کیوں نہیں ضرور ہے اور جب ملک کا خادم ہے تو ملک کیوں نہ اس کی بھی خدمت کرے۔ انسانی مطالبات کا کیوں نہ وہ بھی حقدار سمجھا جائے یہی وہ حقائق تھے جن کو سررشتہ تعلیمات نے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ عملاً اس طبقۂ پست کی طرف اپنی امداد و شفقت کا ہاتھ بڑھایا چنانچہ اس طبقہ کی تعلیم و تربیت کیلئے ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائی جارہی ہیں۔

آپ کو یہ سنا نا تحصیل حاصل ہے کہ بچوں کی صحیح نشو ونما کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان کے گھروں کی فضا ان کی مدد کرے اور وہ اس وقت ان کی مدد کرسکتی ہے کہ جب علمی بو باس رکھتی ہو یعنی ماں باپ کسی حد تک علم آشنا ہوں۔ اس ضرورت سے قطع نظر جب طرز حکمرانی میں ہر شہری اپنا مناسب حصہ پانے کا مستحق تسلیم کیا جارہا ہے اور انتخاب کے ذریعہ سے اپنے نمائندوں کے حق میں رائے دہی کا مجاز گردانا جانے والا ہے تو اس نقطۂ نظر سے بھی تھوڑی بہت تعلیم لازمۂ حیات بنجاتی ہے اچھے شہری کہلانے اور اچھے شہریوں کی تعداد بڑھانے کے لئے تعلیم کے کم از کم مبادی ہی سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ انہیں وجوہ کے مدنظر آپ سب صاحبوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ سررشتہ نے تعلیم بالغان کی بھی داغ بیل ڈال دی اور مختلف محلہ جات شہر میں کئی مدارس شبینہ مصروف عمل ہیں۔

یہ سب جانتے ہیں کہ ہمارا ملک بڑی حد تک زراعتی ملک ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہماری قلمرو کی مختلف صنعتیں مثلاً اورنگ آباد کی مشروع و ہمرو سازی دولت آباد کی کاغذ سازی ورنگل کی قالین بافی بیدر کی ظروف سازی سنگاریڈی پٹن نارائن پیٹھ کی ریشم بافی۔ ناندیڑ کا مشہور عالم سیلہ اور نفیس ترین ململ مختلف دیہات کی سلاح سازی ظروف سازی وغیرہ ہماری ملکی معاشیات کا مدار رہتی آئی ہیں۔ لہذا زراعت اور صنعت کی طرف بھی توجہ کے لئے کافی وسیع میدان موجود ہیں تاکہ بیروزگاری اپنی منحوس صورت نہ دکھانے پائے اور ہماری تعلیماتی کائنات صرف نظریاتی زندگی

اس لئے فطرت انسانی کے یہ مطالبات ہیں کہ جہاں طالب علم فنِ ادبیات کی تعلیم پائے وہیں اپنے اطراف واکناف کی ضروری زبانوں کو بھی سیکھے۔ جہاں شعر و سخن کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہو وہاں ریاضیات کی گتھیوں کو بھی سلجھا سکے۔ جہاں جغرافیہ کے چٹیل اور شاداب میدانوں۔ سمندر کے مدوجزر اور پہاڑوں کی نشیب و فراز پر سر دھنے وہاں تاریخ کی روشنی میں جغرافیہ کے ربط سے قوموں اور نسلوں کی ترقی و تنزل کے مدنظر اپنے لئے راہ عمل بھی تلاش کرے۔ جہاں سائنس کی حیرت انگیز ترقیوں سے وابستہ رہے وہاں اپنے نشۂ مادیت کو دینیات واخلاقیات کی روح افزا چاشنی سے فرو بھی کرتا جائے کہ اسی چاشنی کی کمی نے آج عالم حاضر کو وہ سیر ظلمات کرا دی ہے جسے ہم دو رسے دیکھ رہے ہیں۔

طالب علم جہاں حسن افزا نقشہ کشی سے جمالیاتی حس کو ترقی دے وہاں کشتی کھیل کود اور ورزش جسمانی کی مدد سے صنعت و حرفت اور دستکاری کے لئے بھی مضبوط دست و بازو پیدا کرے۔

زمانہ کی اس آواز پر ہمارے سررشتہ نے لبیک کہا۔ ہر عنوان کے مضامین نصاب تعلیم میں رکھے۔ ان ہی نقطہ ہائے نظر سے ضروریات نسوانی کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ مدارس نسوان کے معائنوں اور دیگر متعلقہ ضروریات کے تصفیوں کے لئے مہتممات مامور کی گئیں۔ ایک مہتممہ جس سہولت اور صحت کے ساتھ مدرسہ نسوان کا معائنہ کر سکتی ہے وہ ایک مہتمم کے لئے بڑی حد تک دشوار ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بیان کردہ عنوانات مضامین کو جب انسانی مطالبات قرار دیا گیا جن کی حقیقت اور اہمیت کو سررشتہ نے بخوبی محسوس کیا تو اسی وسعت نظر سے انسان کا وہ کمزور طبقہ بھی خارج نہ رہ سکا جسے معذور کہتے ہیں۔ کرشمۂ فطرت تو یہ تھا کہ بعض انسان مجبور اور دوسروں کے محتاج پیدا ہوں لیکن ہماری مہربان حکومت نے ان کا بھی دکھ درد گھٹانے سے غفلت نہیں برتی۔ گونگے اور بہرے بچوں کے لئے بھی ایک مدرسہ قائم کر دیا گیا ہے۔ اگر فطرت نے انھیں بعض حواس سے آراستہ نہیں کیا تھا تو حکومت نے انھیں ضیائے علم سے روشنی حاصل کرنے کے مواقع بہم پہونچا دئے۔

سماجی فیصلہ بھی سن لیجئے کہ ایک طبقہ پست اقوام کا بھی ہے معصوم بچہ پیدائش ہی سے اچھوت کہا جاتا ہے۔ کیا یہ نوع انسان نہیں؟ کیا یہ ملک کا نونہال نہیں؟ کیا یہ ملک کا خادم نہیں؟ کیوں نہیں ضرور ہے اور جب ملک کا خادم ہے تو ملک کیوں نہ اس کی بھی خدمت کرے۔ انسانی مطالبات کا کیوں نہ وہ بھی حقدار سمجھا جائے۔ یہی وہ حقائق تھے جن کو سررشتہ تعلیمات نے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ عملاً اس طبقہ پست کی طرف اپنی امداد و شفقت کا ہاتھ بڑھایا چنانچہ اس طبقہ کی تعلیم و تربیت کیلئے ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائی جارہی ہیں۔

آپ کو یہ سنا نا تحصیل حاصل ہے کہ بچوں کی صحیح نشوونما کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان کے گھروں کی فضا ان کی مدد کرے اور وہ اس وقت ان کی مدد کرسکتی ہے کہ جب علمی بو باس رکھتی ہو یعنی ماں باپ کسی حد تک علم آشنا ہوں۔ اس ضرورت سے قطع نظر جب طرز حکمرانی میں ہر شہری اپنا مناسب حصہ پانے کا مستحق تسلیم کیا جارہا ہے اور انتخاب کے ذریعہ سے اپنے نمائندوں کے حق میں رائے دہی کا مجاز گردانا جانے والا ہے تو اس نقطۂ نظر سے بھی تھوڑی بہت تعلیم لازمۂ حیات بنجاتی ہے اچھے شہری کہلانے اور اچھے شہریوں کی تعداد بڑھانے کے لئے تعلیم کے کم از کم مبادی ہی سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ انہیں وجوہ کے مدنظر آپ سب صاحبوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ سررشتہ نے تعلیم بالغان کی بھی داغ بیل ڈال دی اور مختلف محلہ جات شہر میں کئی مدارس شبینہ مصروف عمل ہیں۔

یہ سب جانتے ہیں کہ ہمارا ملک بڑی حد تک زراعتی ملک ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہماری قلمرو کی مختلف صنعتیں مثلاً اورنگ آباد کی مشروع و ہمرو سازی دولت آباد کی کاغذ سازی ورنگل کی قالین بافی، بیدر کی ظروف سازی، سنگاریڈی پٹن، نارائن پیٹھ کی ریشم بافی۔ ناندیڑ کا مشہور عالم سیلہ اور نفیس ترین ململ مختلف دیہاتی کی سلاح نمائی، ظروف سازی وغیرہ ہماری ملکی معاشیات کا مدار ہوتی آئی ہیں۔ لہذا زراعت اور صنعت کی طرف بھی توجہ کے لئے کافی وسیع میدان موجود ہیں تاکہ بے روزگاری اپنی منحوس صورت نہ دکھانے پائے اور ہماری تعلیماتی کائنات صرف نظریاتی زندگی

کی دماغی نشو ونما تک محدود نہ رہجائے ۔ اسی لئے صنعت، وحرفت پر مختلف طریق سے توجہ کی جارہی ہے ۔ چنانچہ تعلیم ثانویہ کے کم وبیش ہر مدرسہ میں دستکاری کی بنیادیں اس طور پر رکھی گئی ہیں کہ جن سے طلبہ میں ایک صنعتی رجحان اور میلان پیدا ہو سکے ۔

خواتین وحضرات۔! مسائل تعلیماتی پر اس طور پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم بے نیاز ہو چکے ہیں یا یہ کہ اب ترقی کے امکانات باقی نہیں رہے ہیں یقیناً ہم بہت کچھ بڑھ چکے ہیں لیکن ابھی بہت کچھ بڑھنا باقی ہے ۔ ترقی کا راز ترقی کی خواہش میں مضمر رہتا ہے اور یہی وہ خواہش ہے جو اس کانفرنس کی شکل میں عملی جامہ پہنتی ہوی ہے ۔

اپنے استقبال نامہ کو ختم کرنے سے پہلے ایک دیرینہ عہدہ دار معائنہ کنندہ مدارس کی حیثیت سے اس مجمع اساتذہ کو ایک حقیقت حال کی طرف اشارہ کئے بغیر گزر جانا کوتاہی فرض تصور کرتا ہوں ۔ اپنے عزیز دوستوں کو جنکے ساتھ میرا (۲۲) برس کا سابقہ رہا ہے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اُنے طبقۂ اساتذہ آپ کی انسان سازی کی شریفانہ جدوجہد پر بھروسہ کرکے قوم وملک نے اپنی عزیز اولاد کو آپ کے حوالہ کردیا اور ہماری مہربان حکومت نے بھی آپ کی شفقت استادانہ وسلوک پدرانہ وفیض رسانی مربیانہ پر اعتماد کرلیا ایسی صورت میں آپ پر نہ صرف اس ملازمت سرکاری کی حیثیت سے ذمہ داری ہے بلکہ قوم وملک کے اس اعتماد کی بھی مناسب جوابدہی ہے جس نے آپکی سیرت صالحہ واخلاق بزرگانہ کے حوالہ اپنی عزیز ترین متاع کردی ہے آپ کا دوگونہ فریضہ ہے کہ ان ذمہ داریوں کے متعلق اپنے آپ کو نہ صرف حکومت کے آگے اور قوم وملک کے آگے ذمہ دار تصور کریں بلکہ خود اپنے رزاق حقیقی کے روبرو بھی اپنے آپکو جوابدہ تصور فرماتے رہیں"۔

آخر میں مکرر عالیجناب صدر کانفرنس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدرالمہام تعلیمات وفینانس کا بھی شکر گزار ہوں کہ نواب صاحب ممدوح نے اپنی گوناگون مصروفیات کے باوجود تشریف فرما ہو کر طبقہ مدرسین کی عزت افزائی فرمائی ۔

اختتام کلام پر شکریہ باری کے بعد دوبارہ اپنے ظل اللہ اور خانوادۂ شاہی کے حسنات وبرکات کی افزونی کی دعا مانگتا ہوں اور طول عمر وکامرانی کی تمنا کرتا ہوں اور ارباب حکومت کیلئے بھی ادائی فرائض وادائی حق نمک کا متمنی ہوں جو اپنے لئے بھی بدرجہ اولیٰ چاہتا ہوں بیٹھنے سے پہلے حاضرین کانفرنس کا شکر گزار ہوں کہ میرے ٹوٹے پھوٹے الجھے ہوئے خیالات اس قابل نہ تھے کہ انہیں کچھ عزت دیجاتی مگر آپ حضرات نے ان خیالات کو کچھ بھی سماعت فرماکر مجھ کو زیر بار احسان فرمایا ۔ (الحمد للہ رب العالمین ۔

رپورٹ

انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی

بابتہ ۱۳۵۰ف م ۴۱-۱۹۴۰ء

از

کے۔ بی۔ ایر صاحب بی اے بی ٹی۔ معتمد عمومی انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی

مجھے انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی پانچویں سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے بڑی مسرت ہے۔

پچھلی کانفرنس ورنگل میں بتاریخ ۱۱ و ۱۲ ر جنوری ۱۹۴۱ء زیر صدارت آنریبل مولوی سید عبدالعزیز صاحب صدرالمہام عدالت و امور مذہبی منعقد ہوئی۔ صاحب ممدوح نے نمائش کا بھی افتتاح فرمایا جس کا انتظام کانفرنس کے ساتھ ساتھ کیا گیا تھا۔ انجمن اساتذہ صوبہ ورنگل اور انجمن اساتذہ انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل کی دعوت پر یہ کانفرنس ورنگل میں منعقد کی گئی اور انہی انجمنوں نے تمام انتظامات اپنے ذمہ لئے۔ انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی اور خاص کر مولوی بدرالدین صاحب صوبہ دار ورنگل اور مقامی انجمنوں کے صدر مولوی احمد حسین خان صاحب اور مولوی شیخ ابوالحسن صاحب کی مہمان نوازی اور معقول انتظامات کے باعث سپاس گزار ہے۔ اس کانفرنس کی روداد حیدرآباد ٹیچر کے جنوری لغایتہ مارچ کے شمارہ میں شائع ہو چکی ہے۔

ابتداءً یہ طے پایا تھا کہ کانفرنس اورنگ آباد میں منعقد کی جائے مگر بوجہ جنگ اور دوسرے اسباب کی بنا پر یہ مناسب سمجھا گیا کہ یہ شہر حیدرآباد ہی میں منعقد ہو۔

سال زیر رپورٹ چار ذیلی کمیٹیاں حسب ذیل عنوانات پر رپورٹ پیش کرنے کیلئے قائم

کی گئی تھیں۔

۱۔ "تحتانی تعلیم" بحوالۂ قیام کمیٹی ہائے مدارس اُن کے فرائض اور ذمہ داریاں اور اولیائے طلبہ سے اشتراک عمل۔

صدر مولوی شیخ ابوالحسن صاحب بی اے۔ ال۔ بی صدر مہتمم تعلیمات ورنگل۔

معتمد مولوی رحیم الدین صاحب ایم اے مہتمم مدارس ضلع ورنگل۔

مولوی احمد اللہ صاحب کے تبادلہ کی وجہ سے مولوی رحیم الدین صاحب سے استدعا کی گئی کہ وہ معتمدی کے فرائض انجام دیں۔

۲۔ "دینی تعلیم" کھیل کے طریقۂ تعلیم کے حوالہ سے۔

صدر مولوی فیض الدین صاحب ایم۔ اے کنٹب باراپٹ لا صدر مہتمم تعلیمات بلدہ۔

معتمد ریورنڈ جی۔ سندرم۔ ایم اے پرنسپل میتھڈسٹ بائز اسکول۔

مولوی نورالحسن صاحب ابتداءً معتمد ذیلی کمیٹی مقرر ہوئے تھے مگر اُن کے تبادلہ کے باعث ریورنڈ سندرم سے استدعا کی گئی کہ وہ معتمدی کے فرائض انجام دیں۔

۳۔ تعلیم نسواں۔ تعلیم بالغات۔

صدر مس جے نندی صاحبہ مہتممہ مدارس نسواں بلدہ۔

معتمد مسز تہنیت اکرم صاحبہ۔

مس نندی صاحبہ کی طویل علالت اور مسز اکرم صاحبہ کی اس عہدے سے سبکدوشی کی بنا پر کوئی رپورٹ مرتب نہ ہوسکی مگر طبقۂ نسواں کی جانب سے نسوانی تعلیم سے تعلق رکھنے والے عنوان پر ایک مباحثے کا انتظام کیا گیا ہے۔

۴۔ نرسری مدارس (دشنوگھر)

صدر مولوی محمد عثمان صاحب صدر مہتمم تعلیمات اورنگ آباد۔

معتمد مسز محمد عثمان صاحب صدر مدرسہ فوقانیہ نسواں اورنگ آباد۔

بعض وجوہ کی بنا پر یہ رپورٹ تیار نہ ہوسکی۔ لہٰذا مس ولسن مہتممہ طبقۂ ابتدائیہ سینٹ جارجز گرلز اسکول نے از راہ مہربانی بمشورہ مس سوزنٹن (میڈک مشن) رپورٹ تیار کرلی ہے جس کو موضوع

اس موضوع پر مباحثہ کا افتتاح زیرِ صدارت جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) فرمائیں گی اور رپورٹ کانفرنس کے تیسرے اجلاس کی ذیلی کمیٹی میں پیش کریں گی۔

رسالہ حیدرآباد ٹیچر :۔ انجمن ہذا کے تعلیمی آرگن حیدرآباد ٹیچر نے اپنی زندگی کے پندرہ سال ختم کر لئے ہیں اور اب سولھویں سال میں قدم رکھا ہے ہم مدیرین رسالہ کے ممنون ہیں کہ یہ اعزازی کام قابل تعریف جوش اور سرگرمی کے ساتھ انجام پا رہا ہے۔

انجمن ہذا کی ملحقہ انجمنوں کی رپورٹ کارگزاری بابتہ سال تمام درج ذیل ہے۔

انجمن اساتذہ بلدہ :۔ اس انجمن کی ملحقہ انجمنوں کی تعداد ۱۵ بمقابلہ ۱۴ سال گذشتہ کے رہی۔ انتظامی کمیٹی کے ۵ اجلاس ہوئے۔ تحت کی انجمنوں میں بعنوان "تکمیل کے طریقہ پر تعلیم" مباحثے اور نمونے کے اسباق اور ۹ موزوں موضوعات پر دلچسپ مباحثے ہوئے۔ سمت بلدہ اور میدک کی سالانہ کانفرنسیں بھی منعقد ہوئیں۔

انجمن اساتذہ ٹریننگ کالج بلدہ :۔ انجمن کے ۱۲ جلسے سال تمام میں ہوئے جن میں علاوہ اسٹاف کے بیرونی افراد نے تعلیمی اور سماجی مفاد کے عنوانات پر تقریریں کیں۔

انجمن اساتذہ سٹی کالج :۔ انجمن کی سرگرمی چند علمی مسائل جن سے مدرسین کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے جیسے "تعلیم میں آزادی" اور "ضبط مدرسہ" وغیرہ تک محدود رہی۔ انجمن نے تعلیم بالغان کے مسئلہ میں بھی دلچسپی لی ہے۔

انجمن اساتذہ مدرسۂ فوقانیہ چادرگھاٹ :۔ اس انجمن کے ۶ جلسے ہوئے تعلیمی موضوع پر مقالے پڑھے گئے اور ۳ اسباق نمونہ کا بھی انتظام کیا گیا۔ دارالمطالعہ اور اساتذہ کا کلب دونوں اپنا کام کر رہے ہیں۔

انجمن اساتذہ سکندرآباد :۔ اس انجمن کے دو مرکز ہیں ایک سکندرآباد دوسرا بلارم میں سال تمام انجمن نے ۱۲ تقاریر چند نمونہ کے اسباق اور تعلیمی تفریح نیز بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کا انتظام کیا۔ رزیڈنسی کے زیر انتظام رقبہ کی جانب سے سرکار نے مبلغ ماصہ روپیہ سکۂ کلدار کی سالانہ امداد انجمن کے لئے منظور کی ہے۔

انجمن اساتذہ کالج گلبرگہ :۔ سمت ہذا کے بیشتر مدارس بوجہ پلیگ مسدود رہے۔

جس کے باعث انجمن کے کاروبار متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مابقی سال مدارس میں انجمن کے مرتبہ لائحہ عمل کے مطابق کام ہوتا رہا۔ اضلاع گلبرگہ، رائچور اور محبوب نگر میں ضلع کی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں شرکاء کی تعداد کافی تھی۔ گلبرگہ کی کانفرنس میں مشاعرہ کا بھی انتظام کیا گیا۔

انجمن اساتذہ کالج اورنگ آباد :۔ انجمن کی مصروفیات ریاضی، انگریزی، اردو، سائنس اور تاریخ و جغرافیہ کی ۵ ذیلی کمیٹیوں پر مشتمل ہیں۔ ان ذیلی کمیٹیوں نے جو پچھلے سال مقرر کی گئی تھیں، سال زیر رپورٹ مفید کام انجام دیا۔ ہر ذیلی کمیٹی میں چھ چھ مقالے جو عصری معلومات پر مشتمل تھے پڑھے گئے۔ اس طرح مقالوں کی تعداد تیس (۳۰) رہی۔ ہر ذیلی کمیٹی کا ایک علٰحدہ کتب خانہ بھی ہے۔ جو فن تعلیم اور متعلقہ فنی ضروریات سے متعلق ہے۔

انجمن اساتذہ سمت اورنگ آباد :۔ سال زیر رپورٹ اس انجمن کی ملحقہ انجمنوں میں دس (۱۰) تعلیمی عنوانات پر تقریریں ہوئیں۔ ہر انجمن نے نمونہ کے اسباق کا انتظام اپنی اپنی ضروریات کے لحاظ سے کیا۔ اس امر کی کوشش خاص طور پر کی گئی کہ نمونہ کے اسباق، اور مباحثے دلچسپ اور کارآمد ثابت ہوں۔ اضلاع ناندیڑ اور نظام آباد نے ضلع کی کانفرنسیں منعقد کیں اور اکثر مدارس فوقانیہ اور نارمل اسکولوں میں سالانہ جلسے منعقد ہوئے۔

انجمن اساتذہ کالج ورنگل :۔ انجمن ہذا کے تمام اراکین کے استفادہ کے لئے ماہانہ جلسے منعقد کئے گئے جن میں تعلیمی مباحث اور عام دلچسپی کے عنوانات پر تقریریں کی گئیں اور بحث و مباحثہ ہوئے نیز نمونے کے سبق دئے گئے۔ ذیلی انجمنیں اپنے کاروبار علٰحدہ بھی انجام دیتی رہیں اور یہ متعلقہ خصوصی مضمون۔ یا اس سے تعلق رکھنے والے مضمون کی حد تک محدود ہوتے ہیں۔ سال زیر رپورٹ ۷۔ ماہانہ جلسے اور ذیلی کمیٹیوں کے متعدد جلسے ہوئے۔

انجمن اساتذہ سمت ورنگل :۔ سال زیر رپورٹ انجمن کی سالانہ کانفرنس

صوبہ پر منعقد نہ ہو سکی کیونکہ انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی کانفرنس کا سالانہ اجلاس بمقام ورنگل منعقد ہوا تھا۔ ضلع کی تمام انجمنوں نے اپنی اپنی کانفرنسیں منعقد کیں اور اس کے ساتھ مدارس تحتانیہ اور وسطانیہ کے ٹورنمنٹ اور اسپورٹس بھی کئے گئے۔ صوبہ کے ٹورنمنٹ کے ساتھ اسکوٹ ٹروفی کے مقابلے نہایت کامیابی کے ساتھ ہوئے۔ عالیجناب معزز صدر المہام بہادر تعلیمات نے صوبہ کی ٹیچرس کلب کو معتدبہ رقمی امداد عنایت فرمائی۔

انجمن معلمات بلدہ:۔ مستقر کی انجمن کے تحت، مرکز قائم ہیں جو مشترکہ لائحہ عمل کے مطابق کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ کسی ایک مرکز پر دیگر مراکز کے اراکین کو بھیجنے کا انتظام بھی کیا گیا جس کی وجہ سے مباحث میں دلچسپی اور اُن کی افادیت میں خاصا اضافہ ہو گیا۔

انجمن معلمات ورنگل میں سال زیر رپورٹ ۱۲ جلسے ہوئے۔ اسی طرح گلبرگہ اور رائچور کی انجمنوں میں بھی مفید کام ہوا۔

انجمن معلمات اورنگ آباد:۔ انجمن کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق جملہ انجمن ہائے تحت میں دوران سال کام ہوتا رہا۔

حسابات انجمن:۔ اوائل سال میں مبلغ ۲ر۱۰ر۱ سکہ تھے جس کی مقدار ختم سال پر ار۵ر۱ تک پہنچ گئی۔ مولوی باقر محی الدین صاحب لکچرار کامرس نے ازراہ مہربانی انجمن کے حسابات کی تنقیح فرمائی۔ صاحب موصوف نے بعد تنقیح یہ رائے دی کہ حسابات باقاعدہ رکھے جاتے ہیں اور سال گزشتہ جو ہدایات دی گئی تھیں اُن پر باحتیاط عمل کیا گیا۔

آخر میں کارکنان کانفرنس اور نمائش کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ گو کانفرنس شہر حیدرآباد میں منعقد کرنے کا تصفیہ تنگ وقت میں ہوا مگر کارکنان کانفرنس نے تمام انتظامات خاطر خواہ کر لیئے۔

اراکین انتظامی کمیٹی

انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی بابتہ ۱۳۵۱ و ۱۳۵۲ ف

منظورہ اجلاس کونسل منعقدہ ۲۹ بہمن ۱۳۵۱ ف

صدر۔ جناب مولوی سید محمد حسین جعفری بی اے آکسن ناظم تعلیمات۔

نائب صدر جناب مولوی سید علی اکبر صاحب۔ ایم اے (کنٹب) معتمد مجلس تعلیم ثانوی و اسپشل اسسٹنٹ افسر تعلیمات

" جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب " " پرنسپل سٹی کالج بلدہ

" جناب مولوی سجاد مرزا صاحب " " پرنسپل ٹریننگ کالج بلدہ

" جناب مس جے نندی صاحبہ۔ ایم اے لندن مہتممہ مدارس نسوان بلدہ

معتمد عمومی کے بی۔ ایئر صاحب۔ بی۔اے۔ بی ٹی۔ مددگار معتمد مجلس تعلیم ثانوی۔

مددگار معتمد۔ مولوی سید محمد علی بلگرامی صاحب۔ بی اے۔ بی ٹی۔ مددگار ناظم تعلیمات

مولوی عبدالستار صاحب سجانی۔ بی اے ال ٹی، پرنسپل دارالعلوم بلدہ

اراکین بلدہ	اراکین اضلاع
مسز تہنیت اکرم صاحبہ ایم اے ال ٹی مہتممہ مدارس نسوان بیدر	مسز محمد عثمان۔ بی۔ اے مہتممہ مدارس نسوان سمت اورنگ آباد
مولوی فیض الدین صاحب ایم اے بار ایٹ لا صدر مہتمم تعلیمات بلدہ	مولوی احمد حسین خانصاحب بی اے پرنسپل انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل
مولوی غلام ربانی صاحب بی اے بی ٹی۔ پرنسپل۔	مولوی ذوالفقار علی حقانی بی اے بی ٹی۔ پرنسپل انٹر کالج ضلع گلبرگہ
میر احمد علیخان صاحب ایم اے ایڈ لکچرار ٹریننگ کالج بلدہ	مسٹر مہو گلے صاحب بی اے بی۔ ٹی سپرنٹنڈنٹ تعلیم المعلمین اورنگ آباد
محمود علی بیگ صاحب بی۔ اے بی ٹی صدر فوقانیہ نامپلی	مولوی ابوالحسن صاحب بی اے ال ٹی صدر مہتمم تعلیمات ورنگل۔
عبدالسلام صاحب بی۔ اے بی ٹی لکچرار سٹی کالج۔	مولوی محمد عثمان صاحب بی اے ٹی ڈی (لندن) صدر مہتمم تعلیمات اورنگ آباد
	مولوی ساجد علی صاحب بی اے بی ٹی مہتمم تعلیمات ضلع بیدر

خطبۂ صدارت

پانچویں سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی سنہ ۱۳۵۱ف

از

آنریبل سر محمد یعقوب شیر اصلاحات ملک سرکار عالی

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۔ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔

جناب صدر کمیٹی استقبالیہ اراکین انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی!

خواتین و حضرات! آپکی کانفرنس کے پانچویں سالانہ جلسہ کی صدارت میرے واسطے باعث مسرت و بہجت ہے اپنی چار سالہ زندگی میں آپ کی کانفرنس نے غیر معمولی اہمیت اور امتیاز حاصل کرلیا ہے اور نواب مہدی یار جنگ بہادر و آنریبل سید عبدالعزیز صاحب جیسے اراکین سلطنت و ماہرین فن نے آپ کی سالانہ کانفرنس کی کرسی صدارت کو زیب دیکر اس کانفرنس کے مرتبہ کو بہت بلند کردیا ہے اور ان حضرات کے خطبہ ہائے صدارت ایسے عالمانہ و بیش بہا خیالات اور تجاویز سے معمور ہیں کہ اُن پر آپکی کانفرنس بجا طور سے فخر کرسکتی ہے۔ مجھ جیسے ہیچمدان کو دعوت صدارت دے کر آپ یہ توقع نہیں کرسکتے کہ آپ کے گزشتہ سالانہ کانفرنس کے پرمغز خطبہ ہائے صدارت میں میں کوئی اضافہ کرسکوں گا۔ برخلاف اس کے میرے واسطے صرف یہی ایک امر ہمت افزا ہے کہ حضرات ممدوح نے آپکی کانفرنس کے واسطے ایسی شاہراہیں قائم کردی ہیں جن پر مجھ جیسا شکستہ پا بھی گامزن ہوسکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جن جذبات خلوص اور قدر افزائی نے مجھے آپ کی کانفرنس کی خدمت صدارت کے واسطے مدعو کیا ہے اُنھیں کی امداد اور اعانت سے میں اس ذمہ دارانہ خدمت کے فرائض کو باحسن الوجوہ انجام دے سکوں گا جو بحیثیت صدر کے مجھ پر عائد ہوتے ہیں۔

دور حاضر کو صحیح طور پر کانفرنسوں اور قومی اجتماعات کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں آج کل اس قدر کثرت سے قومی ادارے اور انجمنیں قائم ہوگئی ہیں کہ ان کی شمار کے متعلق لاتعد و لاتحصی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن میرے خیال میں آپکی انجمن اور آپ کی کانفرنس تمام ملکی اور قومی

اداروں میں خاص اہمیت اور درجۂ امتیاز رکھتی ہے اس لئے کہ آپ کی ہی ایک جماعت ہے جو ملک میں مدبرین، مصلحین، ماہرین سیاست و رہنمایان ملت کو پیدا اور منظر عام پر ہویدا کرتی ہے۔ آپ تمام ترقی پذیر تحریکات کے معدن ہیں اور ملک میں تہذیب اور سماجی بہبود کی بنیادیں آپ کے ہی ہاتھوں سے رکھی جاتی ہیں اس لئے ہر زمانہ اور ہر ملک میں اساتذہ کا درجہ اس درجہ اعلیٰ وارفع رہا ہے کہ شاہان عالی مرتبت و تاجداران ذی حشمت ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے رہے ہیں۔ مشرق میں تو اساتذہ کا مرتبہ اس قدر ممتاز اور بلند تھا کہ اُن کا ادب اور احترام والدین سے بھی زیادہ کیا جاتا تھا مسلمانوں کے مشہور فقیہ اور امام اعظم یعنی حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اس شہر کی طرف پاؤں کر کے نہیں لیٹتے تھے جو ان کے استاد کا وطن تھا شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اپنے خاص مصلحانہ انداز میں فرمایا ہے ؎

پادشاہے پسر بہ مکتب داد	لوح سیمینش درکنار نہاد
بر سر لوحِ او نوشتہ بہ زر	جورِ اُستاد بہ ز مہرِ پدر

لیکن اساتذہ کا مرتبہ جس قدر اعلیٰ اور بلند ہے ان کی ذمہ داریاں بھی اتنی ہی اہم اور دشوار ہیں۔ قومی تعمیر کا کام کچھ آسان نہیں ہے اور ایک خاک کے پتلہ کو اشرف المخلوقات بنا دینا سب سے بڑی صناعی ہے چھوٹے بچوں کی تعلیم اور تربیت سے زیادہ کوئی خدمت دماغ سوزی اور فراست آزمائی کی محتاج نہیں ہے محض حروف شناس بنا دینا اور کتابوں کے ورق لوٹا دینا اساتذہ کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ بلکہ استاد کا اصلی کام بچوں کی تربیت اور ان کے اخلاق کی درستی ہے جس پر قوموں کی فلاح اور بہبود کا دارومدار ہے اور اساتذہ کی ذرا سی غلطی یا غفلت سے نہ صرف ایک فرد، نہ صرف ایک خاندان نہ صرف ایک جماعت بلکہ پوری قوم قعرِ مذلت میں گر جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم اور تربیت ہی پر قومی ارتقا منحصر ہے اور اسی دور کی غلط کاری ناقابل اصلاح تباہی کا باعث ہوتی ہے ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج	تا ثریا می رود دیوار کج

اس لئے اساتذہ اور معلمین کی اصلاح اور تربیت اور طریقہ تعلیم کا نظم و نسق سب سے زیادہ محتاج توجہ ہے اور انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی قابل مبارکباد ہے کہ اس نے اس اہم خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ آپ کی انجمن کے مقاصد اس قدر بکار آمد اور مفید ہیں کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے بہت کچھ خامیاں جو عام طور سے طریقۂ تعلیم میں پائی جاتی ہیں رفع ہو سکتی ہیں۔ اور خوش قسمتی سے

آپ کا دائرۂ عمل ایک ایسے ملک میں واقع ہے جہاں کا پادشاہ وقت اپنی علمی دوستی اور علم پروری کے واسطے مشہور و معروف ہے اور جہاں کی حکومت ہر طرح سے آپ کی ممد و معاون ہے۔

استاد کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ محض پڑھ لینے سے یا تعلیمی ڈگری حاصل کر لینے سے بحیثیت معلّم کے اپنے فرائض منصبی سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اصلی بات دیکھنے کی یہ ہے کہ وہ طالب علم کو کس طرح سمجھتا ہے اور یہ اس پر موقوف ہے کہ وہ بچہ کی فطرت سے واقف ہو اور اسکی درستی کے طریقہ جانتا ہو۔ استاد کو چاہئے کہ پہلے وہ خود اپنی فطرت کا معائنہ کرے اور یہ دیکھے کہ اس میں کوئی ایسے نقائص تو نہیں ہیں جو طلبہ کی ترقی میں مانع ہوں۔ قبل اس کے کہ طالب علموں کے نقائص پر وہ نکتہ چیں نظر ڈالے اسے خود اپنے نقائص کی چھان بین کرنا چاہیئے۔ وَمَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ یہ تو غیر ممکن ہے کہ ہر شخص انسان کامل اور ہر کمزوری سے آزاد ہو جائے لیکن اساتذہ کو کم از کم اتنا تو کرنا چاہیئے کہ وہ طالبعلموں کی آنکھ کے تنکے پر نظر ڈالنے سے پیشتر اپنی آنکھ کا شہتیر نکال لیں۔

اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ استادوں کی مثال طلبہ کے اخلاق پر سب سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے جو عادات و خصائل اساتذہ میں رونما ہوتے ہیں انھیں پر خود بخود طلبہ عمل پیرا ہونے لگتے ہیں معلّم بمنزلہ ایک معمار کے ہے جو اپنی کارگاہِ عمل میں انسانوں کی ساخت کا کام کرتا ہے اور میرے خیال میں دنیا کی تمام صنعتوں سے زیادہ یہ پیشہ جس قدر مستحسن اور مرتفع ہے اسی قدر پیچیدہ اور دشوار بھی ہے۔ استاد کا صرف یہی کام نہیں ہے کہ وہ طالب علموں کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کرے بلکہ اپنے عمل کی جیتی جاگتی تصویر اُن کے سامنے پیش کرے جس کو دیکھ کر وہ خود اپنی اصلاح کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ انسانی سیرت کی حقیقی اور دیرپا اصلاح وہی ہوتی ہے جو انسان خود اپنے ہی ارادہ اور تجربہ سے کرے کہ اس سے شخصیت کی تعمیر ممکن ہے! در تعلیم کا مقصود اور منتہا ہی یہ ہے کہ شخصیت کے جوہر کو چمکائے اور اور محض صلاحیتوں کو اُجاگر کرے۔

آج کل ہمارے نوجوانوں میں تخریبی مذاق اور شکست و ریخت کا جذبہ زیادہ تر پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو تعمیری اشغال کی طرف متوجہ نہیں کرتے اور طلبہ کے سامنے کوئی تعمیری کام نہیں ہوتا۔ اگر تعمیری پروگرام طلبہ کی روزمرہ کی زندگی میں قائم کیا جائے تو تخریب کے لئے ان کی طبیعتوں میں جاگزین ہونے کی بہت کم گنجائش باقی رہے گی تعمیری کام

کرنے سے جو مسرت اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے، وہ تخریبی کام سے کبھی نہیں ہوتا اور اس لئے تعمیری کام کا چسکا لگنے کے بعد ہمارے طلبہ کے دلوں میں ایسا ذوق عمل پیدا ہو جائے گا جو آئندہ زندگی میں ہمیشہ ان کی ہدایت اور رہنمائی کرے گا۔ اپنی شخصیت کا احساس بھی طلبہ میں تعمیری اشغال کے اختیار کرنے سے پیدا ہوتا ہے جب بچے اپنے تعمیری کام کے مفید نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو فطرۃً ان کے دلوں میں عالی ہمتی اور حوصلہ مندی بڑھتی ہے اور تخریبی خواہشات پیچھے رہ جاتی ہیں لیکن تعمیری کام طلبہ کو اختیار کرانا کچھ آسان نہیں ہے۔ بلکہ اس کے واسطے بچوں کے ساتھ اساتذہ کے برتاؤ میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ تخریب تعمیر سے بہت زیادہ آسان ہے اور اس میں زیادہ غور و خوض کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور تخریب کے نتائج بھی تعمیر کے نتائج سے زیادہ جلد نمایاں ہو جاتے ہیں لیکن مگر ان نتائج سے جو مسرت ہوتی ہے وہ بہت ہی ناپائیدار ہوتی ہے۔ دوسروں کے کاموں کی تخریبی نکتہ چینی کرنا ایک عام وبا کی طرح ہمارے ملک میں پھیل رہا ہے ہم اپنے ساتھیوں اور ہم جلیسوں کی خامیوں اور کمزوریوں پر بہت جلد نظر ڈالتے ہیں لیکن ان کی خوبیاں ہم کو بہت کم محسوس ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ آزادی کا زمانہ ہے اور ہر شخص کو آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کا حق حاصل ہے لیکن بسا اوقات آزادئ خیالات کا نہایت غلط استعمال کیا جاتا ہے اور جذبۂ آزادی محض عیب جوئی اور عیب بینی میں صرف ہوتا ہے۔

لہذا بچپن ہی سے طلبہ میں تعمیری کام کرنے کی عادت پیدا کرانی چاہئے۔ مثلاً ابتدائی درجوں سے بچوں کو لکڑی اور مٹی کے مکان بنانے کی تعلیم دینا یا باغبانی اور زراعت کے مشاغل، تعلیم کے ساتھ ساتھ ان میں پیدا کرنا یہ ایسی تدابیر ہیں جو بچوں کے تعمیری جذبات میں نشو و نما پیدا کر سکتی ہیں۔ ذرا سی توجہ سے اساتذہ اس میں بہت کچھ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں جیسے کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ سب سے بڑی چیز تو خود استادوں کا نمونہ ہے اور سب سے زیادہ جو چیز طلبہ کے عادات و اطوار اور اخلاق پر مؤثر ہوتی ہے وہ خود اساتذہ کے عادات اور اخلاق ہوتے ہیں۔ اگر اساتذہ میں خود بیجا نکتہ چینی کرنے اور عیب جوئی کی عادت نہ ہو تو طلبہ میں یہ مذموم عادتیں ضرور معدوم اور مفقود ہو جائیں گی۔ ہر استاد کا کوئی خاص تفریحی مشغلہ یا شغف کی چیز ہونا چاہئے۔ لہٰذا

گو اس میں کوئی اہمیت معلوم نہیں ہوتی لیکن اگر ہر استاد کی کوئی نہ کوئی ہابی ہو مثلاً کسی کو مصوری کا شوق ہو کوئی صناعی سے دلچسپی رکھتا ہو کسی کو باغبانی کا شوق ہو تو لازمی طور پر ان کے طلبہ میں بھی انھیں چیزوں کا شوق اور شغف پیدا ہو جائے گا۔

ایک اور خاص چیز جس کی طرف اساتذہ کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ طلبہ کے دلوں میں خود اپنی تحقیر اور احساس کمتری کے خیالات جاگزیں نہ ہوں اور ان کو بار بار اس بات کا یقین نہ دلایا جائے کہ وہ غبی یا نا قابل ہیں برخلاف اس کے طالب علموں کو اپنی نسبت بہتر رائے قائم کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ مایوسی کے جذبات بچوں کے نزدیک بھی نہ آنے چاہئیں۔ ہمیشہ ان کی ہمت افزائی کی جائے اور ان کے حوصلوں کو بڑھایا جائے تاکہ وہ اس بات کا یقین کرنے لگیں کہ وہ بڑے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں اور سخت سے سخت امتحانات میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ کیفیت اس طرح پیدا کی جا سکتی ہے کہ طالب علموں سے ایسی باتیں دریافت کی جائیں جن کو استاد جانتا ہو کہ وہ طالب علم کو معلوم ہیں۔ اور جب وہ سوالات کا صحیح جواب دے تو اس کی بہت زیادہ ہمت افزائی کی جائے اور یہ بات اس کے ذہن نشین کی جائے کہ جس چیز کو وہ حاصل کرنا چاہے آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ اگر کسی طالب علم میں کوئی خاص کمزوری ہو تو استاد کو چاہئے کہ اس کے دفع کرنے کی اور اسی شعبہ میں اس کی ہمت افزائی کرنے کی طرف زیادہ توجہ کرے۔

خاص کر ہندوستان میں اساتذہ کے لئے ایک بڑا کام طلبہ کے دلوں سے خوف کا دور کرنا ہے۔ علی العموم ہندوستان کے بچوں کے دلوں میں طرح طرح کے خوف اور اوہام جاگزیں رہتے ہیں۔ ہندوستان کی جاہل مائیں اکثر بچوں کو فرضی چیزوں سے ڈراتی ہیں اور اس طرح ان کے دلوں میں خوف اور جبن جاگزیں ہو جاتا ہے۔ لہٰذا طالب علموں کے دلوں میں ہمت، جرأت اور بہادری کے جذبات پیدا کرنا اساتذہ کا ایک اہم فرض ہونا چاہئے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کے دلوں سے موت کا خوف مٹ جائے اور وہ دنیاوی زندگی کے اختتام کو حیات ابدی کا آغاز خیال کرنے لگیں۔

بچوں کی تعلیم اور تربیت کے لئے اس کے گھر اور اس کے اسکول میں اتحادِ عمل ہونا لازمی

ہے انھیں دونوں مقامات کے ماحول سے بچہ کی زندگی متاثر ہوتی ہے اور انھیں دونوں مقامات کی فضا میں بچہ اپنی آئندہ زندگی کی تشکیل کرتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان دونوں ماحولوں کے درمیان کامل اتحاد عمل ہو جبتک کہ اسکول اور گھر کے مقاصد ایک نہ ہوں جبتک کہ ایک کو دوسرے پر اعتماد نہ ہو، جبتک کہ ان میں سے ہر ایک کو یہ معلوم نہ ہو کہ دوسری جگہ کیا ہو رہا ہے اور جب تک کہ ہر ایک اپنے فرض منصبی کو دوسرے کے فرض منصبی کا جزو لاینفک سمجھ کر انجام نہ دے اس وقت تک بچہ کی تعلیم ناکمل اور یک رخی ہوگی۔ اور بچہ میں متضاد اوصاف اور خاصیتیں پیدا ہو جائیں گی۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں گھر اور مدرسہ میں اتحاد عمل شاذونادر ہوتا ہے۔ عام طور سے مدرسہ کا ماحول گھر کے ماحول سے بہت بلند رہتا ہے اور دیہات میں تو خاص طور سے گھروں کی فضا اسکول سے بہت ہی پیچھے ہوتی ہے اور بیچارے اساتذہ کو یہ دشواری پیش آتی ہے کہ انکی تمام کوشش اور محنت گھروں کی دلدل میں پھنس کر مٹی میں ملجاتی ہے۔ یہ دشواری اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے جب کہ بعض والدین یہ سمجھتے ہیں کہ بچہ کو اسکول میں داخل کرنے کے بعد ان کی تمام ذمہ داریاں ختم ہو گئیں اور یہ کہ بچہ کو اسکول میں داخل کرنے کے بعد اس کے متعلق ہر قسم کی ذمہ داریاں صرف اساتذہ پر عائد ہو گئیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر اور مدرسہ میں اتحاد عمل نہ ہونے کی وجہ سے جب نتائج خراب برآمد ہوتے ہیں اور توقعات پوری نہیں ہوتیں تو اسکول گھروں پر الزام لگاتا ہے اور گھر اسکول کو مورد الزام قرار دیتے ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ والدین اور اساتذہ دونوں میں اتحاد عمل رہے تاکہ نتائج قابل اطمینان پیدا ہوں۔ ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ دو بچے ایک ہی اسکول میں تعلیم پاتے ہیں، ایک ہی اساتذہ ان کو تعلیم دیتے ہیں ایک ہی نگرانوں کے ماتحت ان کی نگرانی ہوتی ہے، اور وہ ایک ہی کتابیں پڑھتے ہیں لیکن ان کی عام واقفیت، ان کی قابلیت، ان کی قوت تقریر، ان کا رکھ رکھاؤ اور ان کے اخلاق بالکل ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں اور یہ زیادہ تر نتیجہ ان کے گھروں کے ماحول کا ہوتا ہے اگر گھر کا ماحول صحیح نہ ہو تو استاد کچھ نہیں کرسکتا۔ اگرچہ اسکول میں داخل ہونے کے بعد بچہ کے معلومات کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے اور دوسروں سے ارتباط کے پیدا ہونے کی وجہ سے اس کے عادات میں بہت کچھ تغیر پیدا ہو جاتا ہے لیکن گھر کے ماحول کا اثر سب سے زیادہ زبردست پڑتا ہے۔

گھر ہی کی فضا میں وہ خوبیاں پیدا ہوتی ہیں جن میں ہمدردی کی شعاعیں جھلک دکھاتی ہیں۔ گھر کی ہی زمین میں محبت اور الفت کے پودے پھولتے اور پھلتے ہیں اور وہیں پر بچہ یہ سیکھتا ہے کہ فیاضی اور کنجوسی، رواداری اور تعصب، انصاف اور ہٹ دھرمی، سچائی اور جھوٹ، چستی اور سستی کیا چیزیں ہیں۔ اس لئے اسکول اور گھر کے اتحاد عمل کے بغیر بچہ کی تربیت غیر ممکن ہے۔ والدین اور اساتذہ بچوں کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں اس لئے بعض اوقات یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہی بچہ گھر پر کچھ اور ہوتا ہے اور اسکول میں اس کی حالت بالکل مختلف معلوم ہوتی ہے۔ گھر پر وہ نہایت سرکش اور شریر نظر آتا ہے اور اسکول میں وہ بہت ہی سیدھا اور فرماں بردار پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک بچہ گھر پر خاموش اور مسکین ہوتا ہے لیکن اسکول میں وہ بڑا غوغائی اور لڑاکا بن جاتا ہے۔ بچہ کے متعلق واقفیت کے مواقع اور ذرائع والدین کو اساتذہ سے زیادہ ہوتے ہیں وہ ابتدا سے اُس کی زندگی کے حالات اور افتاد طبیعت سے واقف ہوتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ بچپن سے بچہ پر کیا واقعات گزرے ہیں اور خاندانی روایات کا اس پر کیا اثر ہے اور یہ حالات ایسے ہیں جن سے علی العموم اساتذہ قطعی ناواقف ہوتے ہیں۔ اور جن اسکولوں میں دارالاقامہ نہیں ہے وہاں طلبہ بمقابلہ اساتذہ کے والدین کے ساتھ اپنے اوقات کا زیادہ حصہ بسر کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے والدین ان ضروریات سے ناواقف پائے جاتے ہیں اور اس معاملہ میں بھی اساتذہ کو ہی رہنمائی کرنا چاہئے کہ وہی والدین کو بھی بتائیں کہ ان کے آپس میں اتحاد عمل کیوں ضروری ہے اور وہ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔

اس مشکل کو حل کرنے کے واسطے یہ مناسب ہوگا کہ اس قسم کے ادارہ قائم کئے جائیں جہاں اساتذہ اور والدین ایک دوسرے سے مل کر تبادلہ خیالات کرسکیں مثلاً اساتذہ اور والدین کی مشترکہ انجمنیں قائم کی جائیں اور جہاں ایسا ممکن نہ ہو جیسا کہ دیہات میں تو وہاں اُن مواقع سے فائدہ اٹھایا جائے جہاں لوگ اکثر جمع ہوتے ہیں اور ان میں اساتذہ اور والدین کچھ نہ کچھ تبادلہ خیالات کرسکیں اس سلسلے میں اسکول کمیٹیوں کا قیام بھی بہت مفید ہے جن میں اساتذہ اور والدین کے قائم مقام شریک ہوتے ہیں اور والدین کے مندوب اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں

جو اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں زیادہ سمجھدار خیال کئے جاتے ہیں۔

بہت کم آدمی ایسے نکلیں گے جو کسی نہ کسی پہلو سے تعلیم سے دلچسپی نہ رکھتے ہوں۔ والدین، اساتذہ، منتظمانِ مدارس، پیشوایانِ مذہب اور سیاسی رہنما سب کی زبانوں پر تعلیم کا لفظ رہتا ہے لیکن تعلیم اور محض تعلیمی مسائل پر ایک منظم اور باضابطہ شکل میں یہ بہت کم جمع ہوتے ہیں اور اسی لئے ہماری تعلیم اور طریقہ تعلیم کی اصلاح اب تک نہیں ہو سکی۔ کاش وہ وقت قریب ہو کہ ملک کے تمام عناصر منتشرہ ایک جگہ جمع ہو کر تعلیم مکمل کا ایک صحیح ہیولیٰ تیار کر سکیں۔

اساتذہ کے فرائض کے سلسلے میں ڈسپلن یا ضبط کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ ڈسپلن سے مراد وہ تدابیر ہیں جو طلبہ میں امن، فرماں برداری اور اتباع قواعد کرانے کے واسطے اختیار کی جائیں اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں جو سکون کے ساتھ مدارس میں کام کرنے میں ممد اور معاون ہوں۔ ایک منظم اور منضبط اسکول وہ ہے کہ جس میں طلبہ اپنی تعلیم میں پوری دلچسپی کا اظہار کریں جہاں اساتذہ اور شاگردوں کے مابین اعتماد اور اتحاد عمل ہو اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہوں۔ طلبہ اساتذہ کا پورا احترام کریں اور اساتذہ اپنے شاگردوں کو کرم اور لطف کی نگاہ سے دیکھیں۔ سوال یہ ہے کہ مدارس میں قیام ضبط اور تنظیم کے کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ اس کے دو طریقے ہیں۔ (۱) تہدید و تنبیہ (۲) ترغیب۔ اس میں شبہ نہیں کہ تہدید سے فوری نتائج یقینی طور پر پیدا ہوتے ہیں اور ترغیب اپنے نتائج کے واسطے بہت سے خوشگوار حالات پیدا کرنے پر موقوف ہے اور یہ حالات ہمیشہ اساتذہ کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ اسکولوں میں ضبط اور نظم قائم کرنے کے واسطے زیادہ تر تہدید و تنبیہ پر عمل درآمد کرنا پڑتا ہے۔ انعام وغیرہ کے لالچ دے کر طلبہ کو ضبط کی ترغیب دلانے سے علی العموم کچھ اچھے نتائج پیدا نہیں ہوتے اور نہ تہدید اور جبر ضبط اور تنظیم قائم کرنے میں مستقل طور پر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس مسئلہ کا حل بہت کچھ طلبہ اور اساتذہ کے باہمی تعلقات پر منحصر ہے۔ اساتذہ اور طلبہ میں وہ ارتباط اور میل جول ہونا چاہئے جو تعلیم کی جان ہے۔ اساتذہ بے تکلفی کے ساتھ تمام وقتی مسائل پر طلبہ سے بات چیت کریں اور طلبہ پر ان کا اخلاقی اثر اس درجہ قائم ہو جائے کہ اساتذہ کے احکام کا طلبہ مذہبی فرائض کی طرح آنکھ میچ کر اتباع کرنے لگیں۔

نوجوان علی العموم حب وطن کے والہ و شیدا ہوتے ہیں شباب کا زمانہ ہی امنگوں اور امیدوں کے اُبھار کا زمانہ ہوتا ہے اور یہی ایسا زمانہ ہوتا ہے جب بلا لحاظ خوف و خطر انسان سخت سے سخت کام کر بیٹھتا ہے۔ ان اُبھرتے ہوئے جذبات اور اٹھتے ہوئے جوش کو بیجا طور پر دبانا تعلیمی مقاصد کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتا بلکہ اساتذہ کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ طلبہ میں یہ احساس پیدا کر دیں کہ قومی مسائل نہ دیگر ممالک میں سرکشی اور قانون شکنی کے ذریعہ حل ہوئے ہوئے ہیں اور نہ ہمارے ملک میں اس قسم کے طفلانہ حرکات سے حل ہو سکتے ہیں۔ یہ امر طلبہ کے ذہن نشین ہونا چاہئے کہ ملک اور قوم کی آئندہ فلاح و بہبود اس پر موقوف ہے کہ ہمارے نوجوان مکمل تعلیم اور تربیت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر زندگی کے دارالعمل میں قدم رکھیں۔ ہمارے طلبہ کو یہ سمجھنا چاہئے کہ محض اپنی تن پروری اور شکم پری کے لئے زندہ رہنا زندگی کا نام نہیں ہے اور یہ کہ حب وطن کے اظہار کا اس سے بڑھ کر کوئی اور طریقہ نہیں ہے کہ ملک کے تمام افراد کے دلوں میں متحدہ خواہشات اور متحدہ جذبات پیدا کر دئے جائیں۔ زندگی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک آدمی پیدا ہو، جوان ہو، بوڑھا ہو اور مر جائے، اس طرح کہ دنیا میں اُسکا یاد کرنے والا کوئی نہ رہے بلکہ مقصد حیات یہ ہے کہ انسان دوسروں کے لئے جئے، دوسروں کے لئے کام کرے، دوسروں کو شادکام بنائے، دوسروں کی خدمت کرتا کرتا اُن کے دلوں میں اپنی یاد کے گہرے نقوش چھوڑ کر دائمی حیات حاصل کرے۔

اس وقت تک میں نے اساتذہ کے فرائض اور ذمہ داریوں پر تبصرہ کیا ہے لیکن میں اس امر کو محسوس کرتا ہوں کہ اساتذہ کے اہم فرائض اور ذمہ داریوں کے مقابلہ میں ان کی تنخواہیں بہت کم ہیں! اول تو استاد کی حیثیت کے اعتبار سے بھی ان کا مشاہرہ اتنا ہونا چاہئے کہ وہ اپنے مرتبہ کو قائم رکھ سکیں اور اپنی اہل و عیال کے اخراجات خانگی سے بے فکر ہو کر اپنی پوری توجہ طلبہ کی تعلیم کی طرف مبذول کر سکیں ورنہ

ع پراگندہ روزی پراگندہ دل

کوئی کام اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں سابق میں اساتذہ کی تنخواہ ۳۵ تا ۶۵ روپیہ ماہانہ ہوتی تھی لیکن جوں جوں مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اساتذہ کی تنخواہیں کم ہوتی گئیں تا آنکہ اب مدرسین کو ۲۰ تا ۴۰ ملتے ہیں ظاہر ہے کہ

یا اس قدر قلیل تنخواہ ہے کہ اس میں کوئی اُستاد سکون قلب کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا۔ یہ ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ ہے کہ تخفیف کے سلسلے میں ہمیشہ چھوٹے عہدداروں پر خنجر بُرّاں چلایا جاتا ہے اور اعلیٰ عہدہ دار جن کی تنخواہیں اس قدر کافی ہوتی ہیں کہ اُس میں سے اگر ۵ یا ۱۰ فیصدی کی کمی کر دی جائے تو انھیں محسوس بھی نہ ہو وہ تخفیف سے محفوظ رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ حیدرآباد کا سررشتہ تعلیم مدرسین کی تنخواہوں کے اضافہ کے مسئلہ پر بہت جلد توجہ کریگا۔ اور مدرسین کی تنخواہوں میں کم از کم اتنا اضافہ ہو جائے کہ وہ نان شبینہ کو محتاج نہ رہیں۔

پائیگاہوں اور جاگیروں کے نظم و نسق کا بھی ایک نہایت اہم سوال ہے جو میرے خطبہ کے دائرہ سے بالکل باہر ہے لیکن جہاں تک پائیگاہوں اور جاگیروں میں تعلیم کا سوال ہے وہ عام حیثیت سے قابل توجہ اور قابل لحاظ ہے اس لئے کہ ملک کے بچوں کی ایک بڑی تعداد جاگیروں اور پائیگاہوں سے تعلق رکھتی ہے اور ان کی تعلیم و تربیت باشندگان ممالک محروسہ کی تعلیم اور تربیت پر ایک موثر آلہ کار ہوتی ہے۔ اگر کوئی چھوٹا طبقہ باشندگان ملک کا صحیح تعلیم اور تربیت سے محروم رہے تو کل ملک کی معاشرت پر اس کا اثر پڑنا لازمی ہے۔ انسان کے جسم کا اگر ایک حصہ سڑ جائے تو وہ رفتہ رفتہ پورے جسم کو سڑا دیتا ہے۔ ع

بنی آدم اعضائے یک دیگرند

جہاں تک میرا علم ہے ہماری پائیگاہوں اور جاگیروں میں تعلیم کا انتظام کچھ زیادہ قابل اطمینان نہیں ہے اگرچہ بعض امرا اپنے علاقوں میں رعایا کی بہبودی اور فلاح کا بہت کچھ خیال رکھتے ہیں جن میں نواب سالار جنگ بہادر خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں لیکن پھر بھی تعلیم کا نظم و نسق قابل توجہ ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض جاگیروں اور پائیگاہوں میں اساتذہ کی تنخواہیں بہت ہی کم ہیں یہاں تک کہ بعض ہیڈ ماسٹروں کی تنخواہیں گیارہ روپیہ ماہوار ہیں جس میں کسی طرح ایک خاندان تو درکنار ایک فرد واحد بھی گزر نہیں کر سکتا ضرورت ہے کہ متعلقین پائیگاہات و جاگیرات کو اس طرف خاص توجہ دلائی جائے۔ اور ضرورت ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے افسرانِ تعلیم کے واسطے اس امر کا مزید اختیار حاصل کیا جائے کہ وہ ان مدارس کا بھی معائنہ کرکے

اُن میں اصلاحی تدابیر کا اضافہ کر سکیں اور نظام تعلیم کو ممالک محروسہ سرکار عالی کے سر رشتہ تعلیم کے سانچہ میں ڈھال سکیں۔

فی زمانناً تعلیمی مسائل ہر ملک میں پہلے سے بہت زیادہ جاذب توجہ ہیں۔ تعلیم ایک ایسا مضمون ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی اور جس کے واسطے ہمیشہ اضافہ اور تجدید کے دروازہ کُھلے رہیں گے۔ بلکہ میرے خیال میں تو صیغۂ تعلیم انتظام مملکت کے سب سے اہم اور ضروری شعبوں میں داخل ہے۔ اور ہر ملک میں ارباب حل و عقد کا یہ فرض ہے کہ وہ شعبۂ تعلیم سے اپنے کو پورا واقف اور آگاہ رکھیں۔ نظام سلطنت کے جتنے بھی شعبہ ہیں مثلاً دیوانی، مالگزاری، محکمۂ امن عامہ، انجنیری، زراعت اور طبابت وغیرہ ہر ایک کا تعلق تعلیم سے وابستہ ہے اس لئے کہ زندگی کے ہر شعبہ کی بنیاد تعلیم پر ہے۔ ہمارے مذہبی عقائد کتنے ہی ایک دوسرے سے مختلف ہوں، ہمارے سیاسی خیالات میں کیسا ہی اختلاف ہو، ہمارے سماجی اور معاشرتی اصول کتنے ہی مختلف ہوں لیکن یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے کہ صحیح تعلیم ہر شعبہ زندگی میں کامیابی کے واسطے لازمی ہے اور اس لئے تعلیم کا تعلق حکومت کے ہر شعبہ سے اور قوم کے ہر طبقہ سے یکساں ہے۔

ہر ملک میں طریقۂ تعلیم بلحاظ اس کی گزشتہ روایات کے اور موجودہ حالات کے جداگانہ ہوتا ہے لیکن تعلیم کے بعض پہلو ایسے ہیں جو ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے یکساں مفید ہیں اور جن کا اختیار کرنا ہر حالت میں مستحسن اور بکار آمد ہو سکتا ہے لیکن کسی ملک کے طریقۂ تعلیم کو مکمل طور سے کسی دوسرے ملک میں جاری نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح بعض درخت اور بعض پھل ایک خاص آب وہوا میں نشوونما پاتے ہیں اسی طرح طرز تعلیم کی بعض خصوصیتیں مختلف ممالک کے واسطے مختلف ہوتی ہیں اور آنکھ بند کر کے کسی دوسرے ملک کے طریقۂ تعلیم کا تتبع ہمارے واسطے کسی حالت میں موصل الی المقصود نہیں ہو سکتا۔ دنیا پر حکمرانی اخلاقی قوت کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور وہی قومیں کامیابی کے ساتھ اپنی حکمرانی کا علم بلند رکھ سکتی ہیں جن کے اخلاق استوار اور مضبوط ہوتے ہیں۔ لیکن قوموں کے اخلاق کا سنگ بنیاد اسکولوں اور مدرسوں میں رکھا جاتا ہے اور اس لئے کسی ملک کی فلاح اور بہبود اس کے طریقۂ تعلیم پر موقوف اور منحصر ہے۔ ہندوستان کا موجودہ طریقۂ تعلیم صرف رٹ کر امتحان پاس کر لینے پر محدود ہے اور اسی لئے ہمارے طلبہ کی

معلومات اور واقفیت بالکل سطحی اور نامکمل ہوتی ہے۔ اساتذہ اور طلبہ دونوں کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ طالب علم امتحان میں پاس ہوجائے اور ایسے مسائل جن سے امتحان کا تعلق نہ ہو اُن میں نہ اساتذہ دلچسپی لیتے ہیں نہ شاگرد۔ برخلاف اس کے ہمارے قدیم طریقہ میں تعلیم حصول علم کے واسطے دی جاتی تھی اور اکتساب علم ہی تعلیم کا مقصد اعلیٰ ہوتا تھا اس لئے زیادہ تر توجہ اور زور طالب علم کی دماغی قوت اور اخلاقی نشوونما پر دیا جاتا تھا چنانچہ پرانے طریقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی واقفیت زیادہ وسیع' ان کی نظر زیادہ غائر اور ان کے اصول سے نتائج اخذ کرنے کی قوت زیادہ بلند ہوتی تھی۔ ہمارے ملک میں اس زمانہ میں ایسے جید علماء اور مصنفین پیدا نہیں ہوتے جیسے کہ پہلے ہوتے تھے۔

غدر ۱۸۵۷ء تک ہمارے ملک کی دفتری زبان فارسی تھی اور عربی اور فارسی کی تعلیم اس زمانہ میں معیار شرافت خیال کی جاتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہوا اور ہندوستان کی عنانِ حکومت براہِ راست آنجہانی ملکہ وکٹوریہ اور پارلیمنٹ کے ہاتھ میں آئی تو اُس وقت سے دفاتر کی زبان انگریزی قرار دیگئی اور اس کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے واسطے لازمی قرار دیا گیا۔ ہندوستانی ریاستوں کو بھی برطانوی ہند کا تعلیم کے معاملہ میں اتباع کرنا پڑا۔ اگرچہ میرے خیال میں حکومت برطانیہ کی یہ ناانصافی تھی کہ اس نے اپنے تھوڑے سے انگریز حکام کی آسانی کی خاطر تمام اہل ہند کو زبان انگریزی پڑھنے پر مجبور کیا' مقتضائے انصاف یہ تھا کہ ان چند انگریزوں کو جو چند روز کے واسطے ہندوستان میں بطور سرکاری ملازمت کے متعین ہوتے تھے اس ملک کی دیسی زبانوں میں واقفیت حاصل کرائی جاتی۔ غدر سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں جو انگریز حکام بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز اور مامور تھے وہ سب اردو اور فارسی بلکہ عربی تک جانتے تھے اور انھیں زبانوں میں دفاتر کا کام ہوتا تھا۔ اور آج بھی پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے انگریز افسر عربی۔ فارسی اور پشتو وغیرہ زبانوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ خیر اگر برطانوی ہند میں انگریزی تعلیم لازمی قرار دیگئی تو ایک حد تک گوارہ کیا جاسکتا تھا لیکن ہندوستانی ریاستوں میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا کسی حالت میں بھی درست نہیں کہا جاسکتا۔

ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمکو برطانیہ کے اترے ہوئے کپڑے پہننا پڑتے ہیں۔ جو طریقہ تعلیم انگلستان میں مردود اور خارج ہوچکا ہے ہندوستان میں وہ آجتک رائج ہے انگلستان میں بھی اب یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ وسیع تعلیم صرف کتابوں ہی کے پڑھنے پر نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس طریقہ پر ہونا چاہئے کہ طلبہ اپنے علم کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ انگلستان میں بھی اگرچہ امتحان بہت ہوتے ہیں لیکن وہاں امتحانوں کا طریقہ ہندوستان سے بہت مختلف ہے اور امتحان پاس کرنے کی وہاں ایسی ہما ہمی نہیں ہوتی جیسے کہ ہندوستان میں! انگلستان میں بچے ۱۱ سال کی عمر میں مرکزی اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں، ۱۵ سال کی عمر میں ان کا ایک امتحان ہوتا ہے جس کو بعض حالتوں میں اسکول کا پہلا امتحان کہتے ہیں، یہ امتحان سرکاری حکام کے ماتحت نہیں ہوتا بلکہ مختلف غیر سرکاری جماعتیں امتحان لیتی ہیں۔ دوسرا امتحان ۱۸ سال کی عمر میں لیا جاتا ہے۔ جس کے بعد بعض قیود کے ساتھ طالب علم یونیورسٹی میں شریک ہوسکتا ہے۔ یونیورسٹیاں اپنے امتحانات خود لیتی ہیں کوئی مرکزی حکمراں جماعت نہیں لیتی، ان امتحانوں کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ یونیورسٹیاں اپنے طلبہ کے خود مختلف امتحان لیتی ہیں۔ ہر طالب علم کو ڈگری کے امتحان سے ایک یا دو سال پیشتر ایک پبلک امتحان پاس کرنا پڑتا ہے اور ڈگری لینے کے بعد طالب علم کو ایک یا دو سیڑھی اور چڑھنا پڑتا ہے اسکے بعد آکسفورڈ اور کیمبرج میں بغیر مزید امتحانات کے ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ باوجودیکہ یہ طریقہ امتحان بھی ہندوستان سے بہت مختلف ہے، لیکن انگلستان میں ان امتحانات پر بھی بڑے اعتراضات کئے جاتے ہیں اور موجودہ رجحانات طلبہ کو امتحان کی قید سے آزاد کرنے کی طرف ہیں۔ برخلاف اس کے ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں امتحانات کی بھرمار رہتی ہے۔ ہر مہینے، ہر سہ ماہی، ہر شش ماہی کے بعد طلبہ امتحانات کے جنجال میں مبتلا کئے جاتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح رٹ رٹا کر انھیں امتحان پاس کرنا پڑتا ہے۔ اور امتحان کے بعد طالب علم اسپنج کی طرح نچڑ کر خشک رہ جاتا ہے۔ موجودہ طرز تعلیم سے ہندوستان میں بھی سالہا سال سے بے اطمینانی کا اظہار کیا جارہا ہے اور ہمارے ملک کے ماہرین فن بھی اپنے تمام خطبات، اپنی تقریروں اور تحریروں میں موجودہ طرز تعلیم کو قابل اصلاح بتا رہے ہیں۔ لیکن اول تو ہمارے ملک میں اصلاحات کی رفتار بہت ہی سست ہے علاوہ اس کے

تقریباً ایک صدی کی غلط کاری کو دفعتاً تبدیل کرنا بھی دراز دشوار ہے لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ ممالک محروسہ میں جہاں حاکم و محکوم ایک ہی نسل اور ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور جہاں تعلیم کے نظم و نسق میں پوری آزادی حاصل ہے وہاں ہم کیوں غلط راستہ پر چلتے رہیں اور خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل پیرا ہو کر مشرق اور مغرب کے طریقہ ہائے تعلیم کو سمو کر ایک نیا طرز تعلیم اور جدید نصاب جو ہمارے ملکی اور قومی ضروریات کے واسطے مفید اور کارآمد ہو قائم نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیل شدہ نظام تعلیم کے واسطے اساتذہ کو بھی جدید طریقہ پر ٹریننگ یا تربیت دینا پڑے گی۔

آج کل صنعت و حرفت کی تعلیم کی بہت زیادہ خواہش معلوم ہوتی ہے لیکن اگر تمام قوم کو مستری اور کاریگر بنا دیا جائے تو اس سے ملک کی نجات نہیں ہو سکتی صنعتی و حرفتی تعلیم کے ساتھ بھی اس کی ضرورت باقی رہے گی کہ طلبہ کے ذہن و جذبات کی تربیت کی جائے تاکہ وہ کاریگر ہونے کے ساتھ ملک اور قوم کے لئے مفید شہری بن سکیں۔

مجھے نہایت مسرت ہے کہ ممالک محروسہ میں تبدیل طریقہ تعلیم کے متعلق نیا اسکیم تیار کیا گیا ہے اگرچہ کسی انسانی اسکیم کو مکمل اور مستغنی عن الاصلاح نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ یہ قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھایا گیا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ تجربتاً اس اسکیم کا نفاذ جلد از جلد عمل میں آئے گا میں نے افسوس کے ساتھ فائنانس کے اس نوٹ کو دیکھا جسمیں یہ لکھا گیا ہے۔ کہ "چونکہ آئندہ سہ سالہ تعہد کا موازنہ مرتب اور منظور ہو چکا ہے بلکہ شائع بھی ہو چکا ہے لہذا اس وقت کوئی نئی رقوم شریک کرنے کا موقع نہیں ہے۔" تعلیم کا مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو ضابطہ کی الجھنوں میں ڈال کر تعویق میں ڈالا جائے۔ ارباب حل و عقد جب کسی کام کو ضروری سمجھتے ہیں تو موازنہ کی تمام قیود بالائے طاق رکھ کر اور خارج از موازنہ رقوم برآمد کرا کے صرف ہونے لگتی ہے۔ تاہم محکمہ فائنانس نے جدید اسکیم کے ساتھ جو اظہار ہمدردی کیا ہے وہ بھی قابل تشکر ہے۔

جدید اسکیم کے مطابق مدت تعلیم از جماعت اول تا بی۔اے چودہ سال قرار دیگئی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر کوئی طالب علم ۶ سال کی عمر میں تعلیم شروع کرے اور جماعت اول سے

بی اے تک برابر امتحان میں پاس ہوتا جائے تب بیس سال کی عمر میں بی اے کرے گا۔ اس کے بعد مقابلہ میں امتحانات اور دیگر اعلیٰ امتحانات میں شریک ہو سکے گا لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ ایک معمولی دماغ کا طالب علم جماعت اول سے بی اے تک کسی امتحان میں فیل نہ ہو، لہذا اسی فیصدی طلبہ ۲۲ تا ۲۳ برس کی عمر میں بی اے کر سکیں گے۔ اس لئے میری رائے میں یونیورسٹی کے امتحانات میں بذریعہ مدارج کے امتحان پاس کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے جس کو ہندوستانی یونیورسٹیوں میں (Compartmental) امتحان کہتے ہیں اس کے بموجب اگر کوئی طالب علم صرف ایک مضمون میں فیل ہو اور باقی مضامین میں خاصی تعداد سے پاس ہو جائے تو آئندہ اس کو صرف اسی ایک مضمون میں امتحان دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک فیل شدہ طالب علم کو دوبارہ امتحان میں شرکت کے لئے پورے ایک سال کا انتظار کرانا نہایت ہی صبر آزما ہوتا ہے۔ خاصکر اگر طالب علم کو ایک ہی مضمون میں امتحان پاس کرنا ہے تو ۳ ماہ ۴ ماہ کے بعد اسی مضمون میں اس کا امتحان ہو جانا چاہئے تاکہ مزید تعلیم حاصل کرنے میں وقت کی گنجائش نکل آئے۔

جدید اسکیم میں جو مدارس میں دو عملی نظم رفع کرنے کی سفارش کی گئی ہے اس کو بنظر استحسان دیکھتا ہوں۔ تعلیم صنعت و حرفت اور پیشہ وری کی طرف توجہ قابل ستائش ہے اور امید ہے کہ اس اسکیم پر جلد سے جلد عمل شروع ہو جائے گا۔

نصاب تعلیم متعلقہ مدارس بالغان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نصاب میں مذہبی تعلیم کو بھی جگہ دی گئی ہے اور یہ میرے خیال میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے اس وقت مدارس میں دینیات کی تعلیم خاطر خواہ نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کی نگرانی ہی اطمینان بخش ہے حتیٰ کہ جو بچے میٹرک پاس کرتے ہیں اور تقریباً چھ تا سال تک مدارس میں تعلیم حاصل کر چکے ہوتے ہیں کہا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض نماز تک صحت کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے اور دیگر روزمرہ کے مسائل دینیہ سے واقفیت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ کیسی ہوتی ہو گی۔

یہ امر قابل ستائش ہے کہ موجودہ ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم کی توجہ سے مدارس کو پہلے

جدید مکانات تعمیر ہو رہے ہیں طلبہ کے دماغی نشو ونما پر ان کے ماحول کا بہت کافی اثر پڑتا ہے۔ اور تعلیم گاہوں کے واسطے روشنی، ہوا دار اور حفظ صحت کے اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے مکانات کا ہونا خود تعلیم میں ممد و معاون ہوتا ہے۔

اسکیم جدید کے سلسلہ میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ صدر مہتممان تعلیمات کی تعداد اس خیال سے کم کیگئی تھی کہ نائب ناظم کے دو جدید عہدہ قائم کئے جائیں گے جنکے سپرد علاوہ دفتری کام کے معائنہ کی خدمات بھی ہونگے لیکن صدر مہتممان کی تعداد تو کم ہوگئی اور نائب ناظم کا مسئلہ حافظہ عمل میں نہیں آیا جس کی وجہ سے موجودہ ۴ صدر مہتممان تعلیمات کے حلقہائے گشت اس قدر زیادہ وسیع ہوگئے ہیں کہ وہ کافی نگرانی اور معائنہ نہیں کرسکتے اور چونکہ ابتدائی تعلیم کے مدارس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جو قابل اطمینان ہے تو اسکے ساتھ نگرانی اور معائنہ کنندگان کی تعداد میں بھی اضافہ کی ضرورت ہے۔ خاصکر ابتدائی تعلیم کے جدید مدارس بہت زیادہ نگرانی کے محتاج ہوتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی قابل توجہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے مدارس میں تو اضافہ ہو رہا ہے لیکن ثانوی مدارس کی تنظیم اور توسیع کی جانب ہنوز کوئی توجہ نہیں کیگئی ظاہر ہے کہ ابتدائی مدارس سے جب زیادہ طلبہ کامیاب ہونگے تو ثانوی مدارس میں طلبہ کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہوگی اور اس ترقی و اضافہ تعداد طلبہ کو سنبھالنے کیواسطے ضرورت ہے کہ ثانوی مدارس کی جانب بھی توجہ کیجائے اور ان مدارس میں ضرورت کے اضافہ کی اسکیم پیش نظر رکھی جائے۔

تعلیم دینیات کیطرف سے مدارس میں پہلے ہی سے بے توجہی برتی جاتی ہے مگر پھر بھی امتحانی مضمون ہونیکی وجہ سے اسکی تھوڑی بہت جو کچھ اہمیت باقی تھی وہ اس وجہ سے اب باقی نہیں رہی ہے کہ اس مضمون کو غیر امتحانی قرار دیدیا گیا ہے۔ سابق میں سررشتہ امور مذہبی کو اس کا حق حاصل تھا کہ وہ تعلیم دینیات کی حد تک اپنے دورہ کنندہ عہدہ داروں کے ذریعہ سے مدارس سرکاری کا معائنہ کرا سکتے تھے مگر اب یہ حق سررشتہ مذکور سے لے لیا گیا ہے اس قسم کی بیرونی نگرانی اگر سررشتہ تعلیمات نامناسب خیال کرتا ہے تو کم از کم ایک یا دو مہتمم محض اس مضمون کی نگرانی اور جانچ کے لئے علحدہ مقرر کئے جانا چاہئیں تاکہ بالکلیہ وہ صرف اسی ایک مضمون سے متعلق رہ کر ضروری ہدایات وغیرہ سے موجودہ کمزوریوں کو دور کرا سکیں صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کی گورنمنٹ نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی درخواست پر اس صوبہ میں چند اسلامی اسکولوں کے معائنہ کنندہ افسر مقرر کردئے ہیں جو مسلمان طلبہ کی مذہبی تعلیم کی نگرانی کرتے ہیں ممکن ہے کہ علاوہ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے برطانوی ہند کے اور صوبوں میں بھی اس قسم کے افسر ہوں! ور جب برطانوی ہند نے مسلمان طلبا کی مذہبی تعلیم کی خاص نگرانی کی ضرورت کو محسوس کر لیا ہے تو ممالک محروسہ سرکار عالی میں اس پر عملدرآمد ہونیکی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی

اِس وقت لامذہبی اور مادہ پرستی دُنیا پر چھائی ہوئی ہے ۔ نازیت، فسطائیت اور بالشویزم یہ سب دَہریت کے مختلف شعبے ہیں ۔ عام طور سے یورپ میں لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مذہب صرف جہلا کے دِل خوش کرنیکی تدبیر کا نام ہے اور سائنیس کی ترقی کے ساتھ مذہب کا ہیولیٰ قائم نہیں رَہ سکتا۔ دُنیا نے خدا کو بُھلا دیا ہے اِسی لئے خدا نے بھی اہل دنیا کو بُھلا دیا نسوا اللّٰہ فانساھم۔ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج تمام عالم میں خون کا سیلاب پھیلا ہوا ہے ۔ بلا اِمتیاز عمر اور صنف کے اِنسانوں کا خون نہایت بیدردی اور بیرحمی کے ساتھ بہایا جا رہا ہے ۔ اور جن سائنیس کے کرشموں پر اہلِ مغرب ناز کرتے تھے وہی آج ان کے واسطے پیام اجل ثابت ہو رہے ہیں ۔ اور چونکہ ہندوستان پر بھی مغربی تہذیب کا اثر چھا گیا ہے اِس لئے اِس مذہب آموز ملک اور دیوتاؤں و رشیوں کی زمین پر بھی لامذہبیت اور دَہریت کی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔

ہندو اور مسلمان دونوں جبتک اپنے اپنے مذہب کے پابند تھے تو ان کے آپسمیں نہ وہ جھگڑے اور فساد تھے جو آج پیدا ہو گئے ہیں اور نہ مذہب کے نام سے آج جو فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے نہ وہ ہوتا تھا ۔ یہ سب زیادہ تر لامذہبی کا نتیجہ ہے ۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی ایک مذہب کے طالبعلم کو دوسرے مذہب کی تعلیم دیجائے ۔ بلکہ ہر مذہب کے بچوں کو انہیں کی مذہبی تعلیم دینا چاہیئے علاوہ خاص مذہبی تعلیم کے طلبہ کو اَخلاق، تواضع، رواداریٔ باہمی ہمدردی، رحم اور حق پرستی کے ایسے اخلاقی اُصول پڑھائے جائیں جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔

سررشتہ تعلیم ممالک محروسہ کو ایک خاص اَمر کی طرف اور متوجہ کرانا چاہتا ہوں ۔ وہ یہ کہ تعلیم نسوان مسلمانوں میں ابتک بہت ہی ابتدائی مدارج میں ہے اور مسلمانوں کے پُرانے خاندانوں میں لڑکیوں کو مدارس بھیجنے میں بہت زیادہ پس و پیش کیا جاتا ہے ۔ مجھے مسرت ہے کہ حیدرآباد میں مسلمانوں نے تعلیم نسوان میں برطانوی ہند سے زیادہ ترقی کی ہے ۔ اور غالبًا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جو حکومت سرکارعالی نے طالبات کے پَردہ اور نگرانی کے متعلق

خاص اہتمام کیا ہے۔ لیکن اسی سلسلے میں ایک اور امر خاص طور پر قابل توجہ ہے وہ یہ کہ خدا کے فضل سے اس وقت اگرچہ ممالک محروسہ میں مسلمان معلّمات کی قلت نہیں ہے اور چونکہ علی العموم مسلمان اس امر کے خواہشمند ہیں کہ ان کی لڑکیوں کی تعلیم مسلم معلّمات ہی کے ذریعہ ہونا چاہیئے لہذا تقرر معلّمات کا موجودہ طریقہ قابل اصلاح معلوم ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسی مسلم خواتین کا انتخاب جو خواہاں ملازمت سررشتہ تعلیم ہوں یا مسلمان خواتین کا کوئی بورڈ کرے یا کم سے کم وہ انتخاب ناظم صاحب تعلیمات کی موجودگی میں ہوا کرے۔ نیز اضلاع کی مسلم طالبات زیادہ تر جماعت چہارم پاس ہوتی ہیں لیکن اب بورڈ یعنی جماعت ہفتم کا امتحان مسدود کردیا گیا ہے اور دوسرے اضلاع میں خال خال مقامات چھوڑکر مدارس وسطانیہ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خواندہ مسلم طالبات سررشتہ تعلیم کو مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں پس اسی دشواری کو فوری رفع کرنے کے لئے فوری توجہ کی ضرورت ہے چاہیئے کہ اضلاع میں نسوانی مدارس وسطانیہ قائم کرکے صرف طالبات کی حد تک بورڈ کا انتخاب دوبارہ جاری کیا جائے۔

ممالک محروسہ کے باشندوں کے ساتھ اعلیحضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع نے اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیکر جو احسان کیا ہے اس کو اہل دکن تا قیامت فراموش نہیں کرسکتے۔ ہندوستان میں تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ ہم کو ایک اجنبی زبان میں تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے اور طالب علموں کا بہت سا وقت غیر زبان کے الفاظ، ان کے صحیح تلفظ، انکی ہجے اور ان کی صرف و نحو کے سیکھنے میں صرف ہو جاتا ہے جسکی وجہ سے بچوں کے کمزور دماغ پر اتنا بار پڑتا ہے کہ وہ اعلیٰ علوم کے حاصل کرنے میں اسکے بار گراں کو برداشت کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اگرچہ میں زبان انگریزی کا بہت بڑا مداح ہوں اور میرا خیال ہے کہ کوئی دوسری زبان سوائے انگریزی کے ایسی نہیں ہے جو ایسی خوبی کے ساتھ خوبصورت، چکنے اور چرپرے الفاظ پیدا کرسکتی ہو۔ اور چونکہ اس زمانہ میں دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ پر انگریزی بولی اور

پڑھی جاتی ہے اس لئے ہمارے نوجوانوں کے لئے انگریزی میں بھی مہارت حاصل کرنا لابدی ہے اور میں اس قدر احسان فراموش نہیں ہوں کہ ان فوائد کو نظرانداز کردوں جو ہمارے نوجوانوں نے انگریزی تعلیم کے ذریعہ سے گذشتہ ایکصدی کے اندر حاصل کئے ہیں۔ مگر باوجود اس کے میں یہ سمجھتا ہوں کہ غیر زبان میں علوم و فنون کو صحیح طور پر ذہن نشین کرنا تقریباً غیر ممکن ہے اور حضرت سلطان العلوم کے سایۂ عاطفت میں اردو جس قدر تیزی کے ساتھ علمی خزانوں سے معمور ہو رہی ہے اس کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اردو علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ذریعہ نہیں بن سکتی۔ حیدرآباد میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دئے ابھی بہت تھوڑا عرصہ گذرا ہے لیکن اسی عرصہ میں سائنس، فلسفہ، طبعیات، اور دیگر علوم کے جو بیش بہا اور نادر الوجود جواہر اردو کے خزانے میں داخل ہوئے ہیں اور روز افزوں ترقی کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں وہ ہرگز آج مہیا نہ ہوتے اگر اردو یہاں ذریعہ تعلیم نہ بنائی گئی ہوتی۔

ایک اور نہایت پیچیدہ مسئلہ جو اس وقت پیش نظر ہے وہ طلبہ کے سیاسیات میں حصہ لینے کا ہے۔ اس پر ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہے کہ کالج کلاسوں کے طلبہ زمانہ حاضر کی سیاسیات کا مطالعہ کریں اور اس میں علمی دلچسپی کا اظہار کریں۔ سیاسیات کا علوم میں نہایت ممتاز درجہ ہے اور اس سے بیگانگی اور اسکی طرف سے بے ذوقی تعلیم کو نامکمل اور ادھورا چھوڑ دیتی ہے لیکن سیاسیات میں عملی حصہ لینا طلبہ کیواسطے کسی حالت میں مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا۔ آپ ایک انجنیری کے طالبعلم کے سپرد اپنے مکان کی تعمیر کرنے پر آمادہ نہیں ہونگے۔ ایک قانون کے طالبعلم کے سپرد اپنے اہم مقدمات کی پیروی کرانا گوارا نہیں کرینگے۔ آپ ایک طب یا ڈاکٹری کے طالبعلم سے اپنے معمولی مرض کا علاج نہیں کرائیں گے تو بتائے کہ سیاسیات میں جو نہایت پیچیدہ اور دشوار مسائل پر مشتمل ہے کس طرح طلبہ کا عملی حصہ لینا روا رکھا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں اعلیحضرت حکیم السیاست خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ نے طلبائے عثمانیہ یونیورسٹی کو جو اپنے پُراز حکمت مشورہ سے سرفراز فرمایا ہے، وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اور طلبہ کیواسطے اس پر عملدرآمد کرنے سے

بہتر کوئی اور مسلک نہیں ہو سکتا۔ اعلیحضرت کے فرمان مبارک کا ترجمہ اساتذہ اور طلبہ کی ہدایت کیواسطے ذیل میں درج کرنیکی عزت و شرف حاصل کرتا ہوں۔

ترجمہ

ہمارے خیال میں اُن کے (طلبہ کے) واسطے دورانِ حصول تعلیم میں ملک کے اُمور سیاسی (پالیٹکس) میں حصہ لینا مفید نہ ہوگا کہ اس کے جو نتائج اِس قسم کے معاملات میں پیدا ہوتے ہیں خواہ ملک کے اندر رہوں یا بیرون ملک ہوں وہ انکی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں بلکہ تمام عالم پر ظاہر ہیں۔ اِن حالات پر نظر کر کے طلبہ پر لازم ہے کہ کسی امر کو اختیار کرنے سے پیشتر اس کے مالۂ اور ماعلیہ پر گہری نظر ڈالیں تاکہ اُنہیں غلط پیش قدمی کرنے کی پشیمانی دامنگیر نہ ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعد حصول تعلیم اگر یہ اپنے کو قابل اور اہل ثابت کریں تو اُمور متذکرۂ صدر میں شرکت کریں لیکن وہ بھی سلامت رَوی اور احتیاط کے ساتھ نیز فراست اور دانشمندی کے ساتھ، کہ یہ تمام عقلا اور مُدبرین کا شیوہ ہے تو اس میں کچھ مضائقہ نہ ہوگا بشرطیکہ ہر شئے حدود معینہ کے اندر رہوا ور نیز بعد پورے غور و خوض کے اِختیار کیجائے کہ اس کوچۂ خار دار میں راستہ چلنا آسان نہیں ہے بلکہ بہت دشوار ہے نیز یہ بھی جاننا چاہیئے کہ بغیر موسم بہار کے آئے ہوئے بادِ صبا چمن میں نہیں چلتی اور مختلف قسم کے پھول تبدیل لباس نہیں کرتے تا وقتیکہ حظ باغ میں تمام ضروری سامان خوبی کے ساتھ مہیا نہ ہو جائے۔ ورنہ کوئی شخص خوبصورت منظر دیکھنے کا خواہشمند نہ ہوگا اور یہ تمام اسباب فیضان قدرت سے پیدا ہوتے ہیں تاکہ چمن کی آبیاری اور شادابی گم نہ ہو جائے بلکہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے باقی رہے۔

آج ہم ایک ایسے وقت پر جمع ہو رہے ہیں جو ہمارے ملک اور دنیا کے لئے عظیم ترین خطرہ اور طوفان کا وقت ہے۔ دنیا کی حالت اِسوقت بہت ہی نازک اور تشویش انگیز ہے تخت اور تاج ٹوٹنے والے تاروں کی طرح گر رہے ہیں۔ بنی نوع انسان سب سے بڑے خطرہ کی حالت میں ہے۔ وہ ممالک جو صدیوں سے اپنی آزادی پر فخر کرتے تھے آج بیرحمانہ، حیوانی قوت کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت پھر بے علمی اور بہیمیت کے اُسی قعرِ ذلّت میں پہونچ جائیگی جس سے صدیوں کی کوشش اور تعلیم و تربیت کے بعد نکلی تھی اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب جس کی چمک دمک نے عالم کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا وہ اب خاک میں مل رہی ہے۔ آج دنیا امن و سکون کو ہر گوشہ میں تلاش کر رہی ہے لیکن یہ نعمت دُور دُور نظر نہیں آتی۔ ہر جانب قیامت برپا ہے اِنسانیت خود اپنے آپ سے دست و گریبان ہے، نظامِ کائنات میں ایک ہیجان برپا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میزانِ عمل قائم ہے اور ہم اپنے اعمال کی سزا پا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں؟ اِسلئے کہ ازمنہ وسطیٰ کے ذہنی خلفشار کے بعد سوچنے والوں نے صفائی کے ساتھ ریاستی اور مذہبی مناقشات کے مضمر نتائج پر نہیں سوچا، اور ریاستوں نے جو مغربی طرز کے جمہوری اُصول پر قائم ہوئیں اگر کھُلم کھُلا خدا کا انکار نہیں کیا تو اقرار بھی نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست اِنتظامی اور قانونی ادارہ ہو کر رہگئی اور اخلاقی اِحتساب اُس کے دائرہ عمل سے خارج ہو گیا۔ سرمایہ دار اور مزدور کی آویزش شروع ہو گئی۔ قومیت کا تعصب بڑھکر قومی اِقتصادیات کیطرف لایا۔ اندرونی سرمایہ داری اُبھری اور نو آبادیات کیطرف بڑھی۔ مغربی یورپ کے مختلف ممالک باہم رقیب ہو گئے جس کا نتیجہ یہ عالمگیر اور خونخوار جنگ ہے۔ اہلِ ہند اِس بات کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں کہ سیاسی اقتدار کو کھو بیٹھنے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ حُبِّ جاہ اور خواہش حصولِ اِقتدارِ اعلیٰ، تمدن اور معاشرت کے تمام اُصول کو توڑ رہی ہے جنگ اب ہمارے دروازہ پر پہونچ چکی ہے اور خدا نہ کرے کہ اس عالمگیر آگ کی چنگاریاں ہمارے قدیم لیکن غیر محفوظ ملک میں گِر کر ہندوستان جنت نشان کو

بھی خاک کا ایک تودہ بنا دیں۔ ہم کو حق کی حمایت کرنا چاہیئے۔ اِس لیئے کہ فتح و نصرت آخر میں حق ہی کے ساتھ ہوتی ہے۔ جاء الحق و زھق الباطل اِن الباطل کان زھوقا۔

خواتین و حضرات! میں ایک بار پھر اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہوئے اس اعتماد، اس بھروسہ، اور اس رواداری کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہون جس کا آپ نے مجھے اِس کانفرنس کا صدر منتخب کر کے مظاہرہ کیا ہے اور میں آپ کے صبر اور سکون کا منت پذیر ہون جس سے آپ نے میرے ہیچمیر خطبہ صدارت کو سنا۔ میں تمام حضار جلسہ کا صدق دل سے خیر مقدم کرتا ہون اور کانفرنس کی کامیابیوں کی دعا کے ساتھ اپنی تقریر کو ختم کرتا ہون۔

شاہ عثمان زندہ باد　　　　دولت آصفیہ پائندہ باد

روئداد پانچویں سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی

بابتہ ۱۳۵۱ف بمقام سٹی کالج

از مولوی سید برہان الدین صاحب مددگار مدرسہ فوقانیہ گوشہ محل

سال حال کانفرنس ہذا کا سالانہ جلسہ زیر صدارت آنریبل سر محمد یعقوب مشیر اصلاحات بمقام سٹی کالج بروز جمعہ وشنبہ بتاریخ ۲ و ۳ رجنوری ۱۹۴۲ء منعقد ہوا۔ اس سال کانفرنس کے انعقاد کا انتظام بمقام اورنگ آباد کیا جانے والا تھا۔ لیکن حالات جنگ کے مدنظر حیدرآباد ہی میں انتظام کیا گیا۔

نمائش تعلیمی بہ ضمن کانفرنس نمائش تعلیمی کا انتظام بھی کیا گیا تھا جس کا افتتاح بتاریخ ۳۱ رڈسمبر ۱۹۴۱ء بروز چہارشنبہ (۵) بجے شام بمقام ماڈل پرائمری اسکول صدر عالی قدر نے فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ نمائش، نمائش مصنوعات ملکی ممالک محروسہ سرکار عالی کا پیش خیمہ ہے حکام تعلیمات اور معزز مہمانوں و مندوبین نے نمائش کا معائنہ کرکے اظہار خوشنودی فرمایا۔ مولوی فصیح اللہ حسینی صاحب و مس ڈی۔ وبسٹر صاحبہ نے جس سرگرمی وخوش سلیقگی سے نمایش میں حصہ لیا وہ نہ صرف قابل ستایش۔ بلکہ موجب استحسان ہے۔ اس سلسلے میں مس لینل و مس جلسن وجناب زہرہ بیگم صاحب بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے سابقتی اشیائے نمایش کا تصفیہ کرکے انعامات کا اعلان فرمایا۔

اجلاس کونسل کونسل کا اجلاس بتاریخ یکم جنوری ۱۹۴۲ء بروز پنجشنبہ بوقت (۱۰½) ساعت صبح دفتر نظامت تعلیمات میں بصدارت سرپرست انجمن مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری ناظم تعلیمات منعقد ہوا جب عمل درآمد رپورٹ اور حسابات انجمن

کی منظوری کے بعد ۱۹۴۲ء کے لئے عہدہ داران و کارکنان انجمن کا انتخاب عمل میں آیا اور پروگرام نیز تحریکات پیش شدنی کی منظوری دی گئی۔

افتتاحیہ اجلاس

بروز جمعہ بتاریخ ۲ر جنوری ۱۹۴۲ء از (۹) تا (۱۲) ساعت صبح اجلاس افتتاحیہ کی کارروائی کا آغاز ہوا۔

جناب مولوی محمد فیض الدین صاحب ایم۔اے دکنٹب) بارایٹ لا صدر نشین کمیٹی استقبالیہ نے اپنے مبسوط خطبہ میں فرمایا کہ ہمارے ملک کی تاریخ تعلیم میں دور حاضر کا زرین ورق نشاۃ جدید کے نام سے موسوم ہوگا، جو ہمارے ظل اللہ کی بے شمار عنایتوں کا نتیجہ ہے۔ طبقہ مدرسین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "اے اساتذہ آپ کی انسان سازی کی شریفانہ جدوجہد پر بھروسہ کرکے قوم و ملک نے اپنے عزیز اولاد کو آپ کے حوالہ کر دیا ہے۔ اس لئے آپ کا دو گونہ فرض ہے کہ اپنے آپ کو نہ صرف حکومت کے آگے ذمہ دار تصور کریں بلکہ رزاق حقیقی کے روبرو بھی جواب وہ تصور فرمائیں"۔

اس کے بعد جناب معتمد صاحب عمومی نے سالانہ رپورٹ سنائی جو اشاعت ہذا میں بجنسہ شائع کی گئی ہے۔

خطبہ صدارت صدر والا مرتبت نے اپنے بصیرت افروز و پر از معلومات خطبہ صدارت کے سرنامہ کو آیہ ربانی سے مزین فرمانے کے بعد اپنی شرکت کو موجب مسرت تصور کرتے ہوئے فرمایا کہ کانفرنس ہذا کو تمام ملکی اور قومی اداروں میں خاص اہمیت اور درجہ امتیاز حاصل ہے۔ اس لئے کہ یہی ایک جماعت ہے جو ملک میں مدبرین مصلحین، ماہرین سیاست و رہنمایان ملت پیدا کرتی ہے۔ اس لئے اساتذہ کا اصلی کام بچوں کی تربیت اور ان کے اخلاق کی درستی ہے۔ جس پر قوموں کی فلاح اور بہبود کا دار و مدار ہے۔ مدرسین کی تنخواہوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے فرائض اور ذمہ داریوں پر نظر کرتے ان کی تنخواہیں کم ہیں اور وہ پراگندہ روزی پراگندہ خاطر کا مصداق ہیں۔ گھر اور مدرسہ کے اتحاد عمل پر زور دیتے ہوئے

اساتذہ کے فرائض کے سلسلہ میں فرمایا کہ ڈسپلن یعنی ضبط کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ آزادی کے آڑ میں طلبہ کی بے راہ روی افسوس ناک ہے۔ مدرسین کا فریضہ ہے کہ وہ جدید طریقوں کو کام میں لاکر اس سے عہدہ برآ ہوں۔ اس کے دو طریقے ہیں۔ (۱) تہدید و تنبیہ (۲) ترغیب۔ لیکن اس مسئلہ کا حل بہت کچھ طلبہ اور اساتذہ کے باہمی تعلقات پر منحصر ہے۔ احساس کمتری معاشرے کو گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ مدرسین کو چاہیئے کہ طلبہ میں خود اعتمادی اور خودداری پیدا کریں اولیاء اور مدرسین کو چاہیئے کہ تخریبی میلانات کی بیخ کنی میں لگ جائیں اور ان کے تعمیری رجحانات کو ترقی دیں پھر صاحب ممدوح نے فرمان خداوندی کی جانب جس میں طلبہ کو سیاسی تحریکات سے باز رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، مدرسین کو متوجہ کیا طریقہ تعلیم کے بارے میں فرمایا کہ جو طریقہ انگلستان میں مردود ہو چکا ہے وہ آج تک ہندوستان میں رائج ہے۔ اس ریاست ابد مدت میں تعلیم کی جدید تنظیم جس نہج پر ہو رہی ہے اس کی تعریف کی اور نظام تعلیم کی دوعملی دور کرنے کے بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر اطمینان ظاہر کیا۔ پھر مذہبی تعلیم کی اہمیت واضح کرتے ہوئے ناظر دینیات کے انتظام پر زور دیا نیز تعلیم نسواں کے ضمن میں مزید مدارس کے قیام اور معلمات کی فراہمی کے مسئلہ کو خاص اہمیت دیتے ہوئے کہا کہ اس بارے میں موثر تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ غرض کہ ممدوح الشان کا بصیرت افروز خطبہ جو بجنسہٖ اشاعت ہذا میں شائع کیا جاتا ہے ہمیں یقین ہے کہ مدرسین کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے گا۔ اس خطبہ کے بعد مسٹر ایف۔ ویبر بی۔ پی۔ ای۔ پرنسپل فزیکل کالج نے ایک پر از معلومات تقریر "مدارس میں سماجی اصول صحت کی تعلیم" کے عنوان پر کرتے ہوئے کہا کہ انسانی زندگی کی بنیاد زیر بحث مسئلہ پر ہے۔ لہٰذا مدرسین کا اہم فریضہ ہے کہ وہ ضبط نفس کے معاملہ میں اپنے شاگردوں کی رہبری کریں۔ صاحب موصوف نے (۷) نقاط غور و خوض کیلئے پیش کئے۔ اس تقریر کے بعد حسب ذیل تحریک پیش ہوئی۔

(۱) انڈر گراجویٹ اساتذہ صاحبان کی ٹریننگ کیلئے ایک سال کے عوض دو سالہ نصاب رکھا جائے۔

فاضل محرک مولوی ملک سردار علی صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی لکچرار ٹریننگ کالج بلدہ

نے دیگر ممالک کے ٹیچرز ٹرننگ اور ٹکنکل اداروں کا تذکرہ فرماتے ہوئے، ٹرننگ کی اہمیت کے مدنظر ارشاد فرمایا کہ ایک سالہ قلیل مدت میں خاطرخواہ طریقہ پر اصول ٹرننگ کی تعلیم نہیں ہو سکتی ہے۔

مولوی خواجہ یوسف الدین صاحب ایم۔ اے لکچرار ٹرننگ کالج بلدہ نے تحریک معرّصدر کی موثر پیرایہ میں تائید فرمائی۔

مولوی محمد سلطان صاحب منشی فاضل مددگار مدرسہ فوقانیہ نام پلی نے اس تحریک کے خلاف تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مالی مشکلات کا لحاظ کرتے مدرسین کے لئے دو سالہ مدت تکلیف دہ ہے۔ علاوہ ازیں فنی اعتبار سے بھی یہ مدت کچھ زیادہ سودمند نہیں۔ کیونکہ ٹرننگ کے اصول سیکھنے کے بعد اساتذہ صاحبان کو قابل و تجربہ کار صدر مدرسین اور معائنہ کنندہ افسران تعلیمات کے تحت ایک مدت تک کارگزار رہنے کا موقع ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے معلومات میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

مسٹر بی۔ وی۔ سبا راؤ نے اعتراض فرمایا کہ دو سالہ مدت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ مدراس یونیورسٹی میں تقریباً پچاس سال سے ایک سالہ ٹرننگ کا طریقہ رائج ہے۔ محرک کی جوابی تقریر کے بعد رائے لی گئی تو بہ غلبہ آرا تحریک نا منظور ہوئی۔

"ہندوستان میں تعلیم کے جدید رجحانات" کے عنوان پر جناب مولوی خواجہ یوسف الدین صاحب ایم۔ اے۔ نے نہایت مدلل تقریر فرماتے ہوئے واردھا اسکیم و نیز ہندوستان کے تعلیمی رجحانات و تحریکات پر تبصرہ فرماتے ہوئے ممالک محروسہ سرکارعالی کی تنظیم جدید سے مقابلہ کیا اور آخرالذکر کو ترجیح دی۔ نیز جامعہ عثمانیہ کو جو اپنی نوعیت کی واحد یونیورسٹی سراہتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ طلبائے یونیورسٹی کے لئے۔ یو۔ ٹی۔ سی۔ کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ اس کے ماسوا طلبہ اور طالبات کے نصاب تعلیم میں امتیاز کرتے ہوئے زور دیا کہ دونوں نصاب علحدہ علحدہ ہونے چاہئیں۔

اجلاس دوم

رپورٹ تحتانی تعلیم اس اجلاس میں بیک وقت دو ذیلی کمیٹی کے جلسے منعقد ہوئے۔

پہلا جلسہ جو معلّمات کے لئے مختص تھا، بمقام مدرسہ وسطانیہ حسینی محلہ "تعلیم نسواں" پر منعقد ہوا۔ دوسرا "تحتانی تعلیم" پر بصدارت مولوی شیخ ابوالحسن صاحب بی۔ اے۔ ایل ٹی صدر مہتمم تعلیمات ورنگل سٹی کالج میں منعقد ہوا۔ مولوی عبدالجبار صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی۔ شریک معتمد نے رپورٹ مذکور سناتے ہوئے قواعد وضوابط قیام دیہی مجلس تعلیمی کو پیش فرمایا۔ ازاں بعد مولوی ذوالفقار علی خاں صاحب مہتمم نے اعتراض فرمایا کہ رپورٹ مذکور میں فرائض کمیٹی کے متعلق جو ذکر کیا گیا ہے وہ ممکن ہے کہ کامیاب نہ ہو۔ کیونکہ (۱۰۰۰) آبادی والے مواضعات میں بعض مقامات پر صرف ایک یا دو مدرسین مامور رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں (۶) گھنٹے کام کرنے کے بعد مدرسین پھر ان فرائض کو انجام دینے کے قابل نہیں رہ سکتے۔ اس لئے جن مقامات پر ایسے مدارس موجود ہوں جہاں (۴) یا (۶) مدرسین مامور ہیں وہاں ان قواعدو فرائض کو نافذ کیا جا سکتا ہے۔

جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے۔ (کنٹب) اسپیشل انسپکٹنگ افسر نے تیاری رپورٹ پر مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا کہ ریاست حیدرآباد میں جس طریقہ پر کام ہو رہا ہے وہ برطانوی ہند کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ مدارس دیہی کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا تذکرہ فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ فرمان واجب الاذعان میں کسی حد تک اس کمیٹی کے فرائض کی صراحت کی گئی ہے۔ اسکیم کے متعلق جو احکام وصول ہوئے ہیں ان میں مقامی کمیٹیوں کی صراحت مکمل غور و خوض کے بغیر نہیں کی جا سکتی تھی۔ بعض اضلاع سے اس بارے میں آراء وصول ہوئی ہیں۔ بریں ہمہ اس اہم مسئلہ میں زیادہ سے زیادہ حضرات کی رائے درکار ہے۔ رپورٹ نہایت مفید ہے۔ مولوی ذوالفقار علی خاں صاحب کا اعتراض بھی قابل غور ہے۔ رپورٹ میں بجائے معلّم کے معلّمہ کی جو سفارش کی گئی ہے وہ نہایت کارآمد ہے۔ چنانچہ ممالک متحدہ میں یہی طریقہ جاری ہے۔ مگر ہمارے ملک میں ابھی معلّمات کی بہتات نہیں ہے اس لئے حسب اجازت ضابطہ تعلیمات چھوٹی لڑکیوں کو شریک مدرسہ کیا جا سکتا ہے۔ ٹراونکور، میسور بڑودہ میں اصول کفایت شعاری کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس لئے فی صد تعداد تعلیمی کی زیادتی کے باوجود مصارف تعلیمی نسبتاً کم ہیں۔ کمیٹی نے طالبات کا لحاظ کرتے ہوئے نصاب تعلیمی کی جو

سفارش کی ہے، اس میں نقائص کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے یہاں نصاب تعلیمی میں اس قدر کی ضرور پائی جاتی ہے کہ اردو کتب تعلیمی میں جہاں ذکور کے لئے مردوں کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں اناث کے لئے مشہور خواتین کا تذکرہ بھی لازمی ہے۔ اسی طرح سوالات ریاضی وغیرہ میں ان کی دلچسپی کا لحاظ کرکے سوالات مرتب کئے جائیں۔

قواعد وضوابط میں مقامی کمیٹی کے فرائض میں فراہمی آلات تعلیمی وگیمس وفرش وغیرہ کا جو تذکرہ کیا گیا ہے وہ سیاسی حیثیت سے مناسب نہیں ہے۔ چونکہ لوکل فنڈ کی (۳) پائی کی آمدنی سے از روئے اسکیم عمارت وفرش وآلات تعلیمی وغیرہ کا انتظام کیا جا رہا ہے، اس لئے مہتممہ صاحبہ مدارس نسواں نے فرش وفرنیچر وآلات تعلیمی کے متعلق ایک حد تک انتظام فرمالیا ہے۔ چنانچہ بہ حین معائنہ اس بارے میں مجھ کو بڑی مسرت ہوئی۔ بدین وجہ آلات تعلیمی وغیرہ کے عوض لباس وغذا وصحت و تعاون والدین کے متعلق غور فرمایا جائے اور رجسٹر میں ترمیم کی جاتی ہے۔

(۱) رجسٹر ولادت وممات کے عوض رجسٹر تعداد طلبہ وطالبات قابل تعلیم۔

(۲) ایک مدرسی مدرسہ میں بھی کمیٹی قایم کی جائے۔

(۳) رقومات وچندہ کے صرف کرنے کے لئے کمیٹی کی منظوری لازمی ہوگی۔

جناب مولوی احمد حسین خاں صاحب پرنسپل انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل نے رقومات چندہ کو صرف کرنے کے متعلق بجائے معتمد کے کمیٹی کی منظوری کو ضروری خیال فرمانے کے بعد قواعد میں اس کی صراحت کو لازمی متصور فرمایا۔ رپورٹ ترمیمات مصرحہ صدر کے ساتھ باتفاق آرا منظور کی گئی۔

بنیادی ہندوستانی اس کے بعد جناب مولوی سید فخر الحسن صاحب ملا۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ نرمل نے عنوان مذکور پر تقریر فرماتے ہوئے بیسک کا ترجمہ "بنیادی" فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ میرے ایک دوست نے بنیادی کے عوض "بیرنگی" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں تلمیحات

اور استعارے وتشبیہوں وغیرہ کو استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ابتدائی مدارج کی کتابوں میں اس کو مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اس واسطے یہ زبان سیدھی سادی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا کے مطبع میں جہاں یہ کتابیں طبع ہو رہی ہیں سر عبدالقادر نے بھی اس کو بطور خاص پسند فرمایا ہے۔ بیسک ہندوستانی کن اصولوں پر مبنی ہے اس کا تصور بہت قدیم ہے۔ چنانچہ شاہ نامہ میں الفاظ کو بہت گھٹا کر لکھا گیا ہے۔ انگلستان میں انگریزی الفاظ میں اس قدر تخفیف کی گئی ہے کہ بیسک کے الفاظ (۸۵۰) تک محدود ہو گئے۔ بیسک ہندوستانی کے الفاظ تقریباً (۹۰۰) ہیں۔ اگر مترادفات کو شامل کر لیا جائے تو (۱۰۰۰) ہو جاتے ہیں۔ اس کی حسب ذیل خصوصیات ہیں۔

(۱) تصاویر سے مطلب واضح کیا گیا ہے۔ (۲) استعارے اور تشبیہوں کو نہیں لایا گیا۔ (۳) استعمال قواعد کی چنداں ضرورت نہیں۔ (۴) بیسک رسم خط (اگر خوبصورتی کو پیش نظر رکھا جائے تو) آسان اور تاجرانہ حیثیت سے مفید ہے۔ اس میں جوڑ توڑ کم ہیں۔ (۵) (۵۰،۰۰۰) الفاظ لغات اردو کی تحلیل کر کے (۵) ہزار الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

تقریباً (۵۳) مدارس میں بیسک ہندوستانی کی تعلیم کو رائج کیا گیا ہے اور فوجی بڑے شوق سے پڑھ کر اس میں خط وکتابت کر رہے ہیں۔ اس سے بہت ساری توقعات وابستہ ہیں۔ جنہوں نے اس سنگلاخ زمین میں قدم رکھا ہے وہ قابل مبارک باد ہیں۔

ذیلی کمیٹی تعلیم اناث تعلیم اناث کا جلسہ مدرسہ وسطانیہ حسینی محلہ نسواں سرکار عالی میں بصدارت مسز جبار صاحبہ صدر فوقانیہ نسواں بلدہ منعقد ہوا۔ اولاً جیلانی بیگم صاحبہ ناظرہ دینیات مدارس نسواں نے مدارس تحتانیہ شاہی و مدارس نسواں تحتانیہ امدادی کا تقابل فرماتے ہوئے مدارس شاہی کی تعلیمی وانتظامی حالات پر تبصرہ اور اظہار خیال فرمایا کہ ان کے انتظامات بفضلہ اطمینان بخش ہیں۔ مدارس امدادی میں مجھے جن مشکلات کا احساس ہوا ان میں سے چند یہ ہیں (۱) عدم پابندی وقت (۲) عدم تکمیل نصاب (۳) آلات تعلیمی کی کمی (۴) ناموزوں مکانات (۵) معلمات کی کمی۔

ثانیاً مس کرک پیٹرک، سپرنٹنڈنٹ مدرسہ تعلیم المعلمات بلدہ نے اپنی دلچسپ و موثر تقریر میں حسب ذیل امور پر بلحاظ اہمیت اظہار خیال فرمایا۔

(۱) پیشہ مدرسی کی اہمیت کا لحاظ کرتے اس کو کسب معاش کا ذریعہ نہ سمجھا جائے (۲) معلماۃ کا طبقہ جدید تعلیمی ترقیات سے باخبر رہے۔ (۳) اشارات تعلیمی باحتیاط تیار رکئے جائیں۔ (۴) ہفتہ میں دو مرتبہ یکشنبہ و جمعہ کو تعطیل دی جائے اور موسمی تعطیلات میں بھی اضافہ کیا جائے۔ (۵) مالی مشکلات کارگزاری میں سدراہ ہیں۔ الونس رخصت وغیرہ بعجلت ارسال فرمایا جائے (۶) معلماۃ کے گریڈ گھٹائے نہ جائیں۔

آخری تین امور پر سرگرمی کے ساتھ مباحثہ ہوا تمام سفارشات کو باتفاق آرا منظور کیا گیا۔

اجلاس سوم

اجلاس ہذا کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ بصدارت مفکر تعلیم فضیلت مآب عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات، تعلیم بالغان کے انعامی مضامین کے متعلق ایک خصوصی اجلاس مقرر کیا گیا۔ مولوی زاہد حسین صاحب نے اپنا ایک انعامی مقالہ جو تعلیم بالغان سے متعلق ہے پڑھ کر سنایا۔ جو اصول تعلیم کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا تھا۔ اس کو انعام اول ملا۔ مولوی محبوب خاں صاحب نے اپنا دوسرا مقالہ جو اسی مضمون سے متعلق ہے پڑھ کر سنایا۔ اس کو دوسرا انعام مرحمت فرمایا گیا۔ یہ مضمون گہرے اور وسیع مطالعہ کی بنا پر پسند کیا گیا تھا۔

مولوی محمد سلطان صاحب نے اپنے تجارب کی بنا پر ارشاد فرمایا کہ اس بارے میں قابلیت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جذبہ تعلیم و ایثار کی ضرورت ہے ۔ نیز انجمن تعلیم بالغان ہند کی طرح ہمارے ملک میں بھی قیام انجمن اور تنظیم نصاب کی ضرورت ہے ۔

مولوی شیخ ابو الحسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ صدر مہتمم تعلیمات ورنگل نے تنظیم دیہی کے سلسلہ میں تعلیم بالغان کے افتتاح کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہم کو ترغیب و تحریص کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ صرف مدرسین کی ضرورت ہے۔ کیونکہ تقریباً سوا سو مواضعات میں کام شروع کر دیا گیا ہے۔ ادارۂ ادبیات کے علاوہ جامعہ ملیہ دہلی کی جانب سے (۵۰) رسالوں کی اشاعت عمل میں آئی ہے جو نہایت مفید ہیں ۔ ورنگل کے (۳۰) مدارس ذکور میں تلنگی کی تعلیم دی جا رہی ہے ۔

مسٹر قریشی مددگار سٹی کالج نے ارشاد فرمایا کہ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں کارخانوں اور گرنیوں کو مرکز بنایا جائے اور غیر تعلیم یافتہ مزدوروں کو مینجر کارخانہ کی مدد سے تعلیم یافتہ بنایا جائے۔

اس کے بعد نواب میر احمد علی خاں صاحب نے یہ تحریک پیش کی کہ "تحریک تعلیم بالغان کے لئے بہت ضروری ہے کہ قبل از قبل مقامی زبانوں میں خاص طور پر لٹریچر تیار کیا جائے۔" اس کی تائید مولوی عبد العزیز صاحب نے ان الفاظ میں فرمائی کہ درسی کتب کے علاوہ ایسی کتب فراہم کی جائیں جو کار آمد اور مفید ہوں۔

صدر والا مرتبت نے اعلان فرمایا کہ تحریک ہذا باتفاق آرا منظور کی گئی۔

رپورٹ نرسری مدارس

ایک ذیلی جلسہ بعنوان نرسری مدارس بصدارت جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔اے (کنٹب) منعقد ہوا۔

صدر عالی قدر نے رپورٹ سے قبل نرسری مدارس کے متعلق چند مفید معلومات کا اظہار فرمایا۔ مس و بلسٹر صدر طبقہ ابتدائیہ سنیٹ جارجز گرلس اسکول و معتمد ذیلی کمیٹی نے بلدہ حیدرآباد میں پہلا نرسری اسکول قایم فرمایا ہے اور اس مفصل اور مفید رپورٹ کو ترتیب دیا ہے جو نرسری مدارس سے متعلق ہے۔

انگلستان میں کئی نرسری مدارس قایم ہیں جن میں مختلف حضرات نے حصہ لیا ہے ان مدارس میں (۵) سال سے کم عمر بچوں کی نفسیات اور ان کے ذہنی وجسمانی حالات کے متعلق غور وخوض کرکے ان کے لئے کھلی جگہ، کھلی ہوا اور رہائشی مکانات نیز صحت جسمانی اور تجسس وتخیل کی نشو ونما کے علاوہ مل جل کر کام کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہندوستان تو کجا انگلستان میں بھی ان امور کی اصلاح کے لئے متعدد کمیٹیاں قایم کی گئیں تو ہزاروں بچے ایسے پائے گئے کہ ان کے لئے خاطرخواہ انتظام موجود نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء کے بعد سے ایسے مدارس قایم کئے گئے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں جب کہ مجھے مس راشل کے نرسری مدرسہ کے معائنہ کا موقع ملا، تو مجھے اس مدرسہ کی خصوصیات وحالات دیکھ کر تعجب ہوا۔ یہ مدرسہ ان بچوں کے لئے قایم کیا گیا ہے جن کے ماں باپ دن میں گھر پر موجود نہیں رہتے ہیں۔ ان کے بچوں کی تربیت کھیل کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ باغبانی کے علاوہ ان کے طعام کا ایسا انتظام کیا گیا ہے

کہ طلبہ ایک دوسری کی مدد کرتے ہیں۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ منجانب بلدیہ بچوں کے کھیلنے کے لئے کھلے میدان اور مرکز بہبودی اطفال جابجا قایم کئے گئے ہیں۔ لیکن ان مقامات کی نگرانی کے لئے مزید توجہ درکار ہے۔ ہمارے ملک کی ہونہار و نوجوان لڑکیوں کو جو کسی حد تک تعلیم یافتہ ہیں بغرض ٹریننگ مس ویبسٹر کے نرسری اسکول میں روانہ کیا جائے تو وہ ملک کے کمسن بچوں کی تعلیم و تربیت اور محبت و موانست کے طریقوں سے واقفیت حاصل کرسکتی ہیں۔ واردھا اسکیم میں بھی اس قسم کے مدارس کی نسبت سفارش کی گئی ہے۔ مس راشل کے نرسری اسکول کی رپورٹ کا ضروری و اہم اقتباس بزبان انگریزی سنایا گیا۔ اس کے بعد مس ویبسٹر نے اپنی مرتبہ رپورٹ بزبان انگریزی سنائی پھر مباحثہ کا موقع مرحمت فرمایا۔ مسٹر قریشی مددگار سٹی کالج بلدہ نے بزبان انگریزی تائید فرماتے ہوئے کہا کہ ایسی خواتین کو اس کام کے لئے ترغیب دی جائے جنکی اولاد نہ ہو۔ ایک کرسچین ٹیچر نے پر زور تائید فرمائی کہ ایسے مدارس غربا کے لئے نہایت مفید ہیں۔

مولوی سعادت اللہ خاں صاحب مولوی کامل اول مددگار مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ نے باظہار مسرت ارشاد فرمایا کہ ہمارے غریب ملک کے لئے ان مدارس کا انتظام نہایت ضروری ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہمارے ملک کی غریب مائیں دیہات میں بچوں کو زمین کے ایک حصہ پر محفوظ جگہ بٹھا کر سامنے حفاظت کیلئے ایک سل رکھ دیتی ہیں۔ مسٹر درّانی صدر ماڈل پرائمری اسکول چادرگھاٹ نے بزبان انگریزی فرمایا کہ ماحول سے طلباء متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی سیرت سازی کے مدنظر تعلیم یافتہ معلمات ایسے مدارس میں مقرر کی جائیں تو مناسب ہے۔

معزز صدرنشین نے ارشاد فرمایا کہ تقاریر سے ظاہر ہے کہ اس بارے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے اس لئے رپورٹ کی اہمیت کا لحاظ کرتے سررشتہ غور و خوض کرکے ارباب مقتدر کی توجہ مبذول کرائے گا۔

جدید تعلیم

ایک ذیلی جلسہ "جدید تعلیم" کے عنوان سے بصدارت جناب مولوی فیض الدین صاحب ایم۔ اے (کنٹب)، صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و اطراف بلدہ و میدک مقرر ہوا۔ ریورنڈ جی۔ سند رم۔ ایم۔ اے۔ پرنسپل میتھوڈسٹ بائز ہائی سکول و معتمد ذیلی جلسہ

نے اپنی مرتبہ رپورٹ سنائی۔ مسٹر قریشی و مسٹر توقیر احمد کی مزید وضاحت اور بحث و مباحثہ کے بعد صدر نشین صاحب نے ارشاد فرمایا کہ صدر مجلس میں اس رپورٹ کو مع ترجمہ پیش کر دیا جائے گا تا کہ ضروری کارروائی ہو سکے۔ اس رپورٹ کی ترتیب میں اولاً مولوی نورالحسن صاحب صدر مدرسہ فوقانیہ دارالشفا و مولوی فیض محمد صاحب بی۔ اے۔ ڈپ۔ ایڈ نے حصہ لیا تھا۔ مولوی نورالحسن صاحب کی منتقلی بہ سررشتہ دیگر کی وجہ اس اہم مقصد کی تکمیل ریورنڈ صاحب موصوف نے فرمائی۔ ریورنڈ صاحب موصوف نے "کھیل کے ذریعہ تعلیم کے طریقوں" کی وضاحت فرماتے ہوئے مختلف نمونہ جات کو پیش فرمایا جن کو طلبا نے دلچسپی و شوق کے ساتھ دوران تعلیم تیار کیا تھا۔ سزائے جسمانی کے متعلق فرمایا کہ اس کو ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔ مسٹر قریشی اور مسٹر توقیر احمد نے بھی اس بارے میں روشنی ڈالی۔ صدر محترم نے اختتام پر رپورٹ مذکور کی نسبت مبارک باد دیتے ہوئے ریورنڈ صاحب کا شکریہ ادا فرمایا۔

اجلاس آخر

کانفرنس کا اختتامی اجلاس بصدارت عالیجناب سر محمد یعقوب صدر کانفرنس منعقد ہوا جس میں حسب ذیل کمیٹیوں کی مرتبہ رپورٹیں باتفاق آرا منظور ہوئیں۔

(۱) تحتانی تعلیم (۲) تعلیم نسواں (۳) رپورٹ تعلیم بالغان (۴) نرسری مدارس (۵) جدید تعلیم۔

اس کے بعد مس وبیسٹر نے زبان انگریزی میں نمائش کمیٹی کی رپورٹ کو پیش فرمایا۔

جناب مولوی عبدالحکیم صاحب ایم ایس سی۔ مددگار مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ نے بزبان اردو "زہریلی گیس اور جنگ" کے عنوان پر ایک مبسوط موثر اور مفید مقالہ سنایا۔ جسے حاضرین و سامعین نے دلچسپی سے سنا۔

ڈاکٹر ڈی۔ ڈی۔ تنڈارکر صاحب پی ایچ۔ ڈی (لندن) لکچرار ٹیچرز ٹریننگ کالج بلدہ نے "انفرادی اختلافات اور تعلیم میں ان کی اہمیت" پر ایک بصیرت افروز تقریر کی۔

اس کے بعد حسب ذیل تحریکات پیش ہوئیں۔

"یہ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ نان گزیٹیڈ ملازمین سررشتہ تعلیمات کی آل واولاد کی اُجرت تعلیم بلا قید مدرسہ واسکیل مقررہ معاف فرمائی جائے خواہ وہ مدرس کسی مدرسہ میں کارگزار ہو یا وظیفہ یاب ہو چکا ہو"

فاضل محرک جناب مولوی مرغوب الدین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ مددگار فوقانیہ چادرگھاٹ نے مدرسین کی قلیل تنخواہ وخاندانی ضروریات کا تذکرہ فرماتے ہوئے صدر محترم کے خطبہ صدارت کے مصرع پر اگندہ روزی پراگندہ خاطر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مدرس چونکہ تعلیم یافتہ ہوتا ہے اس لئے اپنی اولاد کو بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے میں جمیع مدرسین کی جانب سے اس تحریک کو پیش کرتا ہوں۔ جناب مولوی مرزا محمود علی بیگ صاحب بی۔ اے۔ ایم۔ ایڈ (لیڈس) مہتمم تعلیمات محبوب نگر نے اس تحریک کی پُر زور الفاظ میں تائید فرمائی۔

مولوی مظفر الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ معظم شاہی نے کہا کہ مدرسین کی آل واولاد میں لڑکے ولڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ مگر یہ امر غور طلب ہے کہ فیس تعلیم سے فیس شکرام اور موٹر زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس تحریک میں اجرت تعلیم کے بعد لفظ سواری کی ترمیم فرمادی جائے تو مزید سہولت کا باعث ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اس ترمیم کے ساتھ یہ تحریک باتفاق آرا منظور ہوئی۔

مولوی عبد الکریم صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ناظر ضلع گلبرگہ شریف نے یہ تحریک پیش کی کہ "آل حیدرآباد ٹیچرز کانفرنس مناسب سمجھتی ہے کہ سررشتہ تعلیمات محکمہ مال پر تحریک فرمائے کہ علاقہ کرناٹک کے جملہ مواضعات کے عمال دیہی کے دفاتر کی زبان حکماً کنڑی قرار دے تاکہ مدارس تحتانیہ میں مقامی زبان کی تعلیمی دقتیں ایک حد تک رفع ہوجائیں"۔

صاحب موصوف نے مادری زبان کی اہمیت کو واضح فرماتے ہوئے کہا کہ بعض مقامات کے مدارس میں اولیائے طلبہ بجائے مادری زبان (کنڑی)، کے صرف موڑی کی تعلیم کو اپنے کاروبار کی خاطر ضروری سمجھتے ہیں اور مدرسین کو تعلیم موڑی کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر ان کی خواہش کی تکمیل نہ کی جائے تو خانگی طور پر مدارس قایم کرکے مقصد برآری

کرلی جاتی ہے۔

مولوی علی بن غالب صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔ مددگار انٹرمیڈیٹ کالج گلبرگہ شریف نے ضلع گلبرگہ شریف کی تاریخی اہمیت کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ ضلع کنڑی کا مرکز رہا ہے اور شاہان بہمنیہ نے اس کی جو کچھ سرپرستی کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس لئے میں تحریک ہذا کی تائید کرتا ہوں۔

یہ تحریک باتفاق آراء منظور ہوئی۔

جناب مولوی شیخ ابوالحسن صاحب بی۔اے۔یل۔ٹی۔صدر مہتمم تعلیمات ورنگل نے باشندگان اضلاع کی پریشاں حالی وقحط سالی کا ذکر فرماتے ہوئے یہ تحریک پیش کی کہ "موجودہ گرانی اونس جنگ بلدہ اور اضلاع کے مدرسین کے لئے یکساں ہونا چاہیئے کیونکہ عموماً اضلاع کی گرانی بلدہ سے زائد ہے" صاحب موصوف نے فرمایا کہ اضلاع میں بلدہ کی نسبت زیادہ گرانی ہے اس لئے بلدہ میں (۵۰) روپیہ تنخواہ تک (دو) روپیہ اونس گرانی جاری فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح اضلاع میں بھی (۳۵) کے بجائے (۵۰) روپیہ تک اونس گرانی (دو) روپیہ مقرر فرمانے کی نسبت مہتمم صاحبان مدارس سے تحریکات وصول ہورہی ہیں۔

جناب مولوی سید محمد جواد صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔مہتمم تعلیمات ضلع نلگنڈہ نے بلدہ واضلاع کی گرانی کا توازن فرماتے ہوئے تحریک ہذا کی تائید فرمائی۔

یہ تحریک بہ غلبہ آراء منظور ہوئی۔

زائد نصابی مقابلے اور انعامات

زائد نصابی مصروفیات کے بارے میں مولوی محمود علی بیگ صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔صدر مدرسہ فوقانیہ نامپلی نے فرمایا کہ جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔اے۔(کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ کا تقرر جس وقت اسپیشل انسپکٹنگ آفیسری کے عہدہ پر عمل میں آیا تو صاحب موصوف کی ناقابل فراموش دیرینہ کارگزاری اور رفقید المثال ہردلعزیزی کی یادگار میں زائد نصابی مصروفیات کا ادارہ قایم ہوا اور مختلف انعامی مقابلے مابین مدارس رکھے گئے جس کی صدارت مولوی نورالحسن صاحب صدر مدرسہ فوقانیہ دارالشفاء فرماتے رہے۔ اس کے

بعد صاحب موصوف نے انگریزی و اردو مباحثوں، نظم خوانی اور باغبانی کے مقابلوں کا ذکر کرتے ہوئے بحیثیت صدر ادارہ محکمہ صاحبان و صاحبات کے علاوہ ان مدرسین کا بھی شکریہ ادا کیا جنھوں نے طلبہ کو تیار کیا تھا۔ پھر معزز صدر محترم نے نمائش اور زائد نصابی مصروفیات کے مقابلوں کے انعامات اور اسناد وغیرہ کثیر تعداد میں تقسیم فرمائیں۔

اختتامی تقریر صدر کانفرنس مجھے مسرت ہے کہ ہر دو اجلاس جس کی عزت آپ نے مجھے بخشی تھی نہایت کامیابی و خاموشی سے ختم ہوئے۔ آپ حضرات نے ضبط کا جو نمونہ پیش فرمایا ہے وہ اکابرین قوم کی بڑی سی بڑی کانفرنسوں میں بھی کم پایا جاتا ہے۔

سب کمیٹیوں کی مشغولیت قابل مبارکباد ہے۔ کیونکہ ان حضرات نے اصولی اور بنیادی کام انجام دیا ہے۔ تعلیمی کمیٹی نے جو تعاون والدین کے متعلق اظہار خیال کیا ہے اس کی نسبت میں نے بھی خطبہ صدارت میں تذکرہ کیا ہے۔ رپورٹ تعلیم جدید میں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ جسمانی سزا کو مسدود کر کے آزادی کے ساتھ طلبہ کو حصول علم کا موقع دیا گیا ہے جس کی طرف میں نے بھی خطبہ مذکور میں اشارہ کیا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ کانفرنس کی کارروائی کاغذی نہیں رہے گی بلکہ اس کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ تحریکات کانفرنس مفید ہیں۔ آج جن دو مقالوں کو پڑھا گیا ان میں پہلا مقالہ جو زہریلی گیس اور جنگ کے متعلق ہے وہ ہندوستان میں پہلا مقالہ ہے جو اس نوعیت پر ضروریات جنگ و حالات حاضرہ کے مدنظر تیار کیا گیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس کو طبع کرا کے تقسیم کیا جائے۔

دوسرا مقالہ جو "انفرادی اختلافات اور تعلیم میں ان کی اہمیت" کے عنوان سے پڑھا گیا اس میں اساتذہ صاحبان کے لئے جن مفید خیالات و معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے وہ ایسے ہیں کہ ان کو بھی طبع کروا دیا جائے تاکہ پورے طور پر استفادہ کیا جا سکے۔

شکریہ جناب مولوی عبدالستار صاحب سبحانی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ نے بحیثیت معتمد کمیٹی استقبالیہ، اولاً صدر ذی قدر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ ممدوح نے

باوجود کثیر مصروفیات کے شرکت کی زحمت گوارا فرمائی اور اپنے پُر از معلومات خطبہ صدارت میں گراں بہا خیالات کا ذکر فرمایا جو ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔

زاں بعد بطور خاص عالیجناب نواب صدر المہام بہادر تعلیمات نے اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود جو صدارت کو قبول فرما کر عزت بخشی ہے اس کی نسبت اظہار استحسان فرمایا۔

جناب ناظم صاحب تعلیمات نے انجمن ہذا کی سرپرستی فرمانے کے علاوہ انعقاد کانفرنس کی اجازت مرحمت فرما کر ہم کو ان مصروفیتوں کا موقع مرحمت فرمایا ہے جس کی وجہ ہم ان کے مرہون منت ہیں۔

اس موقع پر جناب مولوی سید علی اکبر صاحب اسپیشل انسپکٹنگ آفیسر جو نہ صرف بانی انجمن ہیں بلکہ انجمن کی روح رواں ہیں۔ ان کے دم قدم سے جو جذبات موجزن ہیں وہ صاحب موصوف کی دلچسپی کا نتیجہ ہیں۔ آپ نے تمام اساتذہ کو ایک برادری میں منسلک فرمادیا ہے وہ ایک احسان عظیم ہے۔ آپ کا یہ کارنامہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

ہم جناب سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج کے ممنون احسان ہیں کہ ان کی توجہ سے جناب مولوی غلام قادر صاحب وائس پرنسپل اور مولوی خیرالدین صاحب داروغہ کالج ہذا نے ہمارے جملہ انتظامات میں ہاتھ بٹایا جس کی وجہ یہ حضرات بھی مستحق شکریہ ہیں۔

جناب مولوی فیض الدین صاحب (ایم۔اے کنٹب) صدر کمیٹی استقبالیہ نے کارکنان مجلس کے ساتھ برادرانہ سلوک کرکے ہم کو کامل آزادی کے ساتھ مصروف بکار رہنے کا موقع عطا فرمایا صاحب موصوف کا یہ طرز عمل موجب امتنان ہے۔

کارکنان کانفرنس کے علاوہ جن حضرات نے مختلف حیثیتوں سے تقاریر و تیاری رپورٹ و مضامین کے علاوہ شرکت کانفرنس ہذا کی زحمت گوارا فرمائی۔ ان تمام حضرات کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

مولوی مرزا ضیاءالدین بیگ صاحب ناظر مدارس بلدہ و مولوی سعیدالدین خاں صاحب و مولوی روشن علی صاحب کے ہم منت پذیر ہیں کہ ان کے دیرینہ تجارب کی بناء پر ہم کامیاب رہے۔

نمایش تعلیمی کی نگرانی و مصروفیات کی بنا پر ہم مولوی فصیح اللہ حسینی صاحب ناظر مدارس بلدہ و مس ویبسٹر کے مرہون منت ہیں کہ انھوں نے جس عمدگی و سلیقہ سے اس کو ترتیب دیا وہ ان کے دیرینہ تجربہ کا ثبوت ہے۔ اور مس لینیل و مس جلبن و جناب زہرہ بیگم صاحبہ نے مسابقتی اشیاء نمایش کا تصفیہ بحیثیت حکم کر کے انعامات کا اعلان فرمایا جس کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

انتظام ایٹ ہوم میں جناب مولوی مرزا محمود علی بیگ صاحب صدر فوقانیہ نامپلی نے نمایاں حصہ لیا اختتام کانفرنس ہذا پر ایک پر تکلف عصرانے کا انتظام کیا گیا تھا جس میں معزز مہمانوں اور اراکین کمیٹی استقبالیہ اور مقررین وغیرہ نے شرکت فرمائی اور یہ سالانہ اجتماع اختتام کو پہنچا۔



شذرات

یوم والدین تحتانیہ اعظم پورہ بتاریخ ۱۵ر بہمن ۱۳۵۱ف ۴ ½ ساعت شام مدرسہ تحتانیہ اعظم پورہ سرکار عالی نے زیر صدارت مولوی سید مجتبیٰ حسین صاحب نقوی مددگار صدر مہتمم تعلیمات بلدہ یوم والدین منایا۔ اس جلسہ میں مدرسہ ثانویہ و تحتانیہ کے صدر مدرسین و مدرسین اور اولیائے طلباء کے علاوہ مولوی سید علی اکبر صاحب انسپکٹنگ آفیسر تعلیمات اور مولوی فیض الدین صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ بھی شریک تھے۔ جلسہ میں سیفٹی فرسٹ اور ورزش جسمانی کا مظاہرہ اور بیک انگریزی میں ایک ڈرامہ بھی پیش کیا گیا۔ صدر مدرسہ نے ایک مختصر رپورٹ پڑھی۔ صدر جلسہ نے مدرسہ کی رفتار ترقی پر اظہار خوشنودی فرمایا اور جلسہ برخاست ہوا۔

جلسہ تعلیمی تحتانیہ کولمبی بتاریخ ۴ر اسفندار ۱۳۵۱ف ۸ ساعت شام مدرسہ تحتانیہ کولمبی نے زیر صدارت صدر مدرس صاحب مدرسہ تحتانیہ تعلیمی جلسہ منایا۔ مدرسہ کو آراستہ کیا گیا تھا۔ مقامی رعایا اور مدرسین شریک جلسہ تھے۔ مدرسہ کے دو طالب علموں نے اُردو و مرہٹی میں دلچسپ مکالمے کئے۔ تعلیمی فوائد پر دو تقریریں ہوئیں اس کے بعد رپورٹ پڑھی گئی اور جلسہ برخاست ہوا۔

یوم والدین تحتانیہ سیندورواوہ بتاریخ ۱۳ر اردی بہشت ۱۳۵۱ف مدرسہ تحتانیہ سیندورواوہ نے زیر صدارت ناظر صاحب تعلیمات درجہ اول حلقہ اورنگ آباد یوم والدین منایا۔ جلسہ میں سرپرست و طلباء شریک تھے۔ صدر مدرس صاحب نے علم کی خوبیوں پر اور دیگر مدرسین نے تعلیم و تربیت وغیرہ پر اُردو و مرہٹی میں دلچسپ تقریریں کیں۔ اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

افتتاح شاخ مدرسہ پست اقوام کنگ گیری بتاریخ یکم اردی بہشت ۱۳۵۱ف مدرسہ تحتانیہ

عثمانیہ کی ایک شاخ برائے پست اقوام قصبہ کنگ گیری ضلع رائچور کا افتتاح عمل میں آیا۔ پرچم آصفی کے بلند ہونے اور قومی ترانہ پڑھے جانے کے بعد مقامی عہدہ داروں و معززین جو مدعو تھے بشکل جلوس بیانڈ کے ساتھ عمارت کی جانب روانہ ہوئے۔ عمارت کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔ بصدارت پنڈت شیشا چاری صاحب جلسہ منعقد ہوا۔ صدر مدرس صاحب مدرسہ ہذا نے پست اقوام کو تعلیمی فوائد بتلائے اور سلطان العلوم کی علم پروری پر موثر تقریر کی بعد ازاں مقدم کو توالی و صدرنشین صاحب کی تقاریر ہوئیں۔ آخر میں دعائے سلامتی خانوادہ آصفی پر جلسہ برخاست ہوا۔

جلسہ ہائے انجمن اساتذہ مدرسہ تحتانیہ بلدتی

بتاریخ ۲۲ر آبان ۱۳۵۰ف انجمن ہذا کا جلسہ منعقد ہوا۔ مولوی امام الدین صاحب صدر مدرسہ نے ترتیب تختہ سالانہ و تیاری رجسٹرات جدید ۱۳۵۱ف سے متعلق تفصیلی طور پر تفہیم فرمائی۔ اور مدرسین کو اندراجات کا عملی طور پر موقع دیا۔ داخل خارج کے رجسٹرات کے اندراجات کی تکمیل کو وضاحت سے سمجھایا اور سن فصلی وعیسوی بھی درج کرنے کے لئے فرمایا نیز بچوں کی عمر کی تشخیص کے متعلق چند اصول بیان فرمائے اور جلسہ برخاست ہو گیا۔

جلسہ انجمن اساتذہ بتاریخ ۵ ۲ر آذر ۱۳۵۱ف منعقد ہوا۔ مسٹر کشتیا مددگار مدرسہ ہذا نے جماعت سوم اردو کو حساب پر نمونے کا سبق دیا۔ طریقہ تعلیم و تفہیم دلچسپ تھا۔ صدر جلسہ نے فرمایا کہ ابتدا میں تعلیم اعداد و مفروں اشیاء سے دی جائے۔ اور سوالات روزمرہ کاروبار سے متعلق ہوں۔

بتاریخ ۲۴ر دے ۱۳۵۱ف جلسہ انجمن اساتذہ منعقد ہوا۔ مولوی امام الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا نے جماعت اول کو اردو کا سبق دیا۔ سبق اصولی اور بحیثیت مجموعی کامیاب رہا۔

بتاریخ ۱۲ر بہمن ۱۳۵۱ف مسٹر نارائن راؤ و مسٹر کشتیا اور محمد عثمان صاحب مددگاران مدرسہ ہذا نے تعلیمی تفریح کے فوائد پر تقریریں کیں۔
آخر میں صدر جلسہ نے فرمایا کہ تعلیمی تفریح کے لئے فی الوقت سررشتہ میں امداد کی گنجائش

نہیں ہے۔ البتہ کانفرنس ضلع ہذا میں یہ طے پایا ہے کہ تعلیمی تفریح کے لئے آئندہ ماہ سے فی لڑکا ۲ ؍ (دو پائی) وصول کی جائے اور سال میں تین مرتبہ تعلیمی تفریح (اوائل سرما۔ گرما فصل آبی) میں کرائی جائے۔

سالانہ جلسہ تحتانیہ گجویل مدرسۂ ہذا کا سالانہ جلسہ بہ صدارت مولوی عبد اللہ خاں صاحب سب انسپکٹر پولیس تواریخ ۲ و ۳ اردی بہشت ۱۳۵۱ف منعقد ہوا۔ دیہات کے مدرسین و طلبہ کے علاوہ عالیجناب صوبہ دار صاحب میدک و اول تعلقدار صاحب اور تحصیلدار صاحب و نیز مہتمم صاحب لوکل فنڈ نے نمائش تعلیمی کا معائنہ فرما کر اظہار خوشنودی فرمایا۔ نمائش و اسپورٹ کے ختم پر انعامات تقسیم کئے گئے۔

جلسہ تحتانیہ یاسائی پیٹھ مدرسہ ہذا کا جلسہ بصدارت مولوی حفیظ اللہ صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ ۲۶ ؍ فروردی ۱۳۵۱ف منایا گیا۔ اسپورٹس کے مقابلوں میں اول و دوم آنے والے طلبہ کو انعامات دیئے گئے۔

اس کے بعد نواب معین الدین صاحب جاگیردار کی صدارت میں طلبائے مدارس کی تقاریر ہوئیں اور نزک مسکرات کا ڈرامہ بہت ہی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا۔

جلسہ سالانہ مدرسہ وسطانیہ عالم پور مدرسہ وسطانیہ عالم پور کا سالانہ جلسہ ۴ ؍ فروردی ۱۳۵۱ف اور یوم والدین بتاریخ ۵ ؍ فروردی ۱۳۵۱ف زیر صدارت جناب مولوی میر بدر الدین علی خاں صاحب منصف تعلقہ عالم پور منایا گیا۔

۴ ؍ فروردی ۱۳۵۱ف کو ہاکی اور وال بال کے میاچ ہوئے۔ شب میں کشافہ کا کامیاب مظاہرہ ہوا۔

۵ ؍ فروردی ۱۳۵۱ف کو چار بجے مدرسہ کے جدید گراونڈ پر اسپورٹس ہوئے جن میں طلبہ کے علاوہ عہدہ داران تعلقہ و سرپرستوں و قدیم طلبہ نے بھی حصہ لیا جو بہت ہی دلچسپ رہے۔ مدرسہ میں نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا علاوہ طلبہ مدرسہ ہذا کے کام کے مدرسہ نسواں کی طالبات کی تیار کردہ چیزیں بھی رکھی گئی تھیں۔ شب میں طلبہ نے تمثیلی مشاعرہ کیا جس میں قدیم شعراء اور مغلیہ تہذیب کے آخری دور کا ایک مکمل نقشہ کھینچا

گیا تھا جو ہر لحاظ سے قابل تحسین تھا۔

مشاعرہ سے پہلے مولوی عبدالوکیل صاحب ایم۔اے۔ ڈپ۔ ایڈ۔ صدر مدرس نے ایک فاضلانہ تقریر یوم والدین کی اہمیت بتاتے ہوئے کی۔ اور والدین کا مدرسہ سے اشتراک عمل طلبہ کی کامیاب زندگی کے لئے ضروری بتلایا۔ تقسیم انعامات کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

روئداد جلسہ انجمن اساتذہ مدرسہ فوقانیہ بید رشریف

انجمن ہذا کا ماہواری جلسہ بصدارت عالیجناب مولوی شریف الحسن صاحب برنی صدر مدرسہ بتاریخ ۲۱ بہمن ۱۳۵۱ف منعقد ہوا۔ مولوی حبیب اللہ صاحب فوقانیہ یوم والدین پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ کے والدین یا سرپرست صاحبان صرف ان کی ناکامی کی وجہ سے اساتذہ صاحبان اور صدر مدرسہ سے ملتے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے کبھی مدرسہ تشریف لانے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے۔ جب تک کہ اساتذہ صاحبان اور طلبہ کے والدین اور سرپرستوں کے درمیان تعاون عمل نہ ہوگا۔ اس وقت تک ان کو اپنے بچوں کی اخلاقی پستی، مضامین میں کمزوری وغیرہ سے متعلق بخوبی علم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مدارس میں یوم والدین کے جلسوں کا انتظام کیا جائے۔ تاکہ اساتذہ صاحبان اور والدین کو آپس میں تبادلۂ خیالات کا موقع ملے اور وہ بچوں کی فطری صلاحیتوں سے واقف ہوسکیں۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بچوں کی زندگی پر مکان کے ماحول کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اس لئے والدین اور سرپرستوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کی کافی نگرانی رکھیں اور ان کی کمزوریوں کی اطلاع مدرسہ میں باقاعدہ دیتے رہیں۔ اگرچہ کہ حکومت مختلف اسکیمات کے ذریعہ ملک میں تعلیم و صنعت کو کافی وسعت دے رہی ہے تاہم عوام بھی حکومت کا ہاتھ بٹائے تو مفید نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا جب تک والدین اور سرپرست مدارس کے ساتھ اشتراک عمل نہ کریں طلبہ کی تعلیم اور تربیت مکمل نہیں ہوسکتی۔

جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ کوٹھا بتاریخ ۱۰ اردی بہشت ۱۳۵۱ف زیر صدارت مولوی

عبدالرحیم صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ کولبی ضلع ناندیڑ منعقد ہوا جس میں قریب کے مدارس کے مدرسین اولیا طلبہ اور معززین شریک جلسہ تھے۔ طلبا مدرسہ نے نظم دعائیہ پڑھی وچند نصیحت آمیز ڈرامے ومکالمہ ونظم خوانی سے حاضرین جلسہ کو مسرور کیا۔

مسٹر رامچندر راؤ صاحب مددگار مدرسہ نے سبق الاشیاء پر اور مسٹر رگھوناتھ سنگھ صاحب مددگار مدرسہ کولبی نے تصاویر کے ذریعہ مضمون نویسی پر نمونہ کے اسباق دئیے۔ اسباق کامیاب رہے۔ مولوی سالم بن عبداللہ صاحب نے (مدارس دیہی و مدرسین کے مشکلات) پر بزبان اردو، مسٹر رامچندر راؤ صاحب مددگار مدرسہ نے (تعلیم کی اہمیت) پر مسٹر کیشو راؤ صاحب نے (اخلاقی تعلیم) پر بزبان مرہٹی اور مسٹر رگھوناتھ سنگھ صاحب نے (اخلاقی تعلیم) پر مدلل تقریریں فرمائیں۔

مولوی تاج الدین صاحب تاج نے اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی کے فیض جاریہ پر نظم سنائی۔ اختتام جلسہ پر جناب صدر نے مقصد قیام مدارس ونتائج پر پر اثر تقریر فرمائی۔ اعلیحضرت بندگان عالی متعالی وصاحبزادگان بلند اقبال وصاحبزادیان ہمایوں فال کی دعائے ترقی عمر واقبال پر جلسہ ختم ہوا۔

تنقید و تبصرہ

ابتدائی اسکولوں میں تعلیم کے طریقے

کتاب زیر نظر مسٹر مدن گوپال سنگھ وائس پرنسپل ٹریننگ کالج لاہور نے انگریزی کتاب "انسٹرکشن اِن انڈین پرائمری اسکولس" سے اردو میں ترجمہ کی ہے۔ جیسا کہ فاضل مترجم کا بیان ہے، ترجمہ کے وقت بعض ترمیم اور اضافوں کے ساتھ اس کتاب کو پنجاب کے مدارس کی ضروریات کے مطابق بنا لیا گیا ہے۔ ایسی ترمیم اور اضافوں کی ذمہ داری مترجم نے اپنے ذمہ لی ہے۔ "واوین وغیرہ جیسے نشان امتیاز کے نہ ہونے سے کتاب کو پڑھتے وقت اصل مضامین اور ترمیمات کے متن میں امتیاز کرنے میں دقت ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اصل ترجمہ اور ترمیمات کے متن کو الگ جانچنے اور ان سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع اردو داں قارئین کو (جن کے لئے یہ ترجمہ کیا گیا ہے) دیا جائے۔ اس لئے کہ "مادری زبان پڑھانا" کے عنوان کے تحت عبارت کا مفہوم سمجھنے کے سلسلہ میں لایق مترجم تحریر فرماتے ہیں "وہ کسی خیال کو محض اس لئے قبول نہ کریں کہ وہ اخبار یا کتاب میں لکھا ہوا پایا گیا۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم لکھے ہوئے مواد کو سوچے سمجھے بغیر صحیح تسلیم کرلیں" یہ اصول بچے اور بالغ سب کے لئے یکساں صادق آتا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ آئندہ اڈیشن میں محولہ بالا رعایت ملحوظ رکھی جائے۔

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ تحتانی تعلیم چھوڑنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ناخواندہ لڑکوں اور اُن بچوں میں جنھوں نے تحتانی منزل پر تعلیم ختم کردی ہے تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اس نقص کا الزام بلاشبہ طریق تعلیم پر لگایا جاسکتا ہے اور اس کی اصلاح بے شک وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مترجم لایق مبارکباد ہیں کہ ترمیم اور اضافوں کے ساتھ موصوف نے اصلاحی نقطۂ خیال سے اردو داں مدرسین کے واسطے ایک پرخلوص انداز میں ترجمہ کے لئے قلم اٹھایا ہے۔ تحتانی جماعتوں کے مدرسین کے لئے تمام ترکارآمد اور مفید مطلب مسائل

مثلاً مادری زبان کی تعلیم، ریاضی، جزافیہ، تاریخ، مطالعہ قدرت وغیرہ وغیرہ کو اُردو کے قالب میں سلیس اور عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جو اگر دلچسپی سے پڑھے جائیں اور حتی المقدور عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جائے تو عجب نہیں کہ تحتانی تعلیم وہ نہ رہے جو اب ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ لیکن جگہ جگہ انگریزی الفاظ مثلاً سلبس، گراف، فزیکل ماڈل، اسکول کورس، ٹائیم ٹیبل، پرائمری وغیرہ کا غیرضروری استعمال جائز رکھا گیا ہے۔ بعض جگہ عبارت مبہم، ترجمہ تحت اللفظ اور زبان غیرفصیح ہے۔ مثلاً (۱) زندگی کے اور کسی صیغے میں اتنی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے (صفحہ ۸) (۲) آج کل حفظان صحت محض تہذیب حاضرہ کا تصنع ہی نہیں ہے۔ (صفحہ ۸۱) (۳) بچوں کے دل میں کائنات قدرت کے لئے عظمت پیدا ہو جائے۔ (صفحہ ۸۵) (۴) وہ طلبا جنھیں استادوں کے تیار کردہ علم کو سننے کی بُری عادت پڑجاتی ہے۔ (صفحہ ۹۴) (۵) اکثر مدارس میں کھیلوں کے وقت اسکاوٹنگ کیا جاتا ہے۔ (۶) ننھے ننھے ہاتھوں کے عضلے اور نسیں اس درجہ تک ترقی یافتہ نہیں ہوتے کہ وہ اپنے تصوروں کو صحت و صفائی سے ظاہر کرسکیں (صفحہ ۱۲۶) (۷) ہنسی مخول سے ان کے دل پہ چوٹ لگتی ہے۔ (صفحہ ۱۲۹) (۸) رنگ دار مٹیوں سے گزارہ ہوسکتا ہے۔ (صفحہ ۱۲۷) (۹) ایسے پیریے استاد خود بھی کہہ سکتا ہے یا سنو قیانہ اخباروں سے جمع کرسکتا ہے۔ (صفحہ ۲۹) (۱۰) جھلکی طریقہ؛ اختیار کرنا چاہئیے (صفحہ ۵۱) (۱۱) دکن کے راجپوتانہ کے بچے (صفحہ ۶۷) (۱۲) جادو کی لالٹین کی تصویروں (صفحہ ۶۸) (۱۳) رشوت خور دربان (صفحہ ۱۲۸) (۱۴) ہندوستان کے پرائمری استادوں نے ..... فائدہ نہیں اٹھایا (صفحہ ۶۲) اس کے علاوہ قدرت کی کہانیوں کے عنوان کے تحت جو بھی بیان ہوا ہے اس کا تعلق محض ہندو صنمیات (Mythology) سے ہے اور بجز ایک مخصوص فرقہ کے کسی دوسرے کو اس سے دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ امید کہ آئندہ اڈیشن اصلاح ترمیم اور اضافہ کے ساتھ شائع ہوگا۔

(س)

تذکرہ شمیم۔ مولفہ سعید الحسن رضوی لکھنوی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔

یہ انوار فاطمہ شمیم لیڈی پروفیسر کراسٹھ ویٹ گرلس کالج الہ آباد کا مختصر سا تذکرہ ہے،

جیسے ان کے بھائی سعید رضوی صاحب نے اُن کی حسرت آیات موت کے بعد مرتب اور شائع کیا ہے۔ اس میں شمیم صاحبہ کی تصنیفات پر مختصر تبصرہ اُن کے انتقال پر مشاہیر شعراء کی نظمیں، مرثیے، قطعات اور تاریخیں شامل ہیں۔

نظم و نثر کے جستہ جستہ اقتباسات سے جو تبصرے کے ضمن میں درج کئے گئے ہیں اندازہ ہوتا ہے کہ لیڈی پروفیسر صاحبہ مرحومہ ایک مخصوص، سادہ، عمیق اور دلنشین طرز نگارش کی مالک تھیں۔ شاعری میں بھی اکثر اشعار سے اُن کے سلامت ذوق، ادبی بصیرت اور صحت احساس کا پتا چلتا ہے۔ ان باتوں کے علاوہ بھی بحیثیت ایک مسلمان تعلیم یافتہ خاتون کے اُن کے حالات میں طالبات اور خواتین کے لئے بہت سی کارآمد باتیں موجود ہیں۔

مولف نے مقدمہ میں محض جذبۂ محبت و عقیدت کو اپنی تالیف کا ”سنگ بنیاد“ قرار دیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ کم از کم تذکرہ کے ان حصوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جو مولف کے لکھے ہوئے ہیں ناگزیر ہے کہ کوئی شخص اُن کے خلوص گرویدگی اور برادرانہ معصوم محبت سے متاثر نہ ہو۔ لیکن یہ بات قابل قدر ہے کہ انھوں نے مرحومہ کے اشعار اور تصنیفات پر تبصرہ کرتے ہوئے ”نقد و تقریظ“ کے حدود کو قایم رکھا ہے۔

لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ قیمت درج نہیں۔ ہ

اداریہ

گزشتہ بہمن میں انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی چوتھی کانفرنس ہوئی۔ اس کی صدارت عالی جناب مولانا سر محمد یعقوب مشیر اصلاحات سرکار عالی نے فرمائی۔ صاحب موصوف اپنی عمل پسندی اور تعلیمی شغف کے لئے مشہور ہیں۔ اس کانفرنس میں آپ نے جو فاضلانہ خطبہ ارشاد فرمایا جسے ہم نے اسی نمبر میں طبع کیا ہے، اس میں خصوصیت بدرجہ اتم نمایاں ہے۔

مدرس کی شخصیت، اوصاف، فرائض اور ذمہ داریوں کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور کہا جاتا ہے۔ سر محمد یعقوب نے بھی مدرس کے اوصاف اور شخصیت کا ذکر نہایت پرزور الفاظ میں فرمایا ہے۔ مگر جس چیز کو آپ نے سب سے زیادہ نمایاں کیا ہے وہ مدرس کا وقار ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"مدرسین کی ایک ایسی جماعت ہے جو ملک میں مدبرین، مصلحین، ماہرین سیاست رہنمایان ملت پیدا اور منظر عام پر ہویدا کرتی ہے..... تمام ترقی پذیر تحریکات کے معدن ہیں اور ملک میں تہذیب اور سماجی بہبود کی بنیادیں آپ ہی کے ہاتھوں سے رکھی جاتی ہیں۔ اس لئے ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں اساتذہ کا درجہ ارفع و اعلیٰ رہا ہے، کہ شاہان عالی مرتبت تاجداران ذی حشمت ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے"

یہ درست ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ مدرسین کا مرتبہ جس قدر اعلیٰ و ارفع ہے اُس قدر اُن کی "ذمہ داریاں بھی اہم اور دشوار ہیں"۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے معلّمین کی اصلاح اور تربیت اور طریقہ تعلیم کا نظم و نسق ضروری ہے۔ اس کام کا بیڑا انجمن اساتذہ نے اٹھایا ہے۔ کئی سال کی پیہم سعی، جلسوں اور

کمیٹیوں، رپورٹوں اورمقالوں کے ذریعہ مدرسین کے نقطۂ نظر، معیار طریقۂ تدریس اور احساس فرائض میں نمایاں ترقی ہوگئی ہے۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم تعاون مدرسہ و اولیا طلبہ، غیر نصابی مصروفیات، کنڈرگارٹن وغیرہ کے متعلق جو رپورٹیں پیش ہوئی ہیں اور جو مقالے پڑھے گئے ہیں، اُن کے باعث یہ مقاصد بہت کچھ حاصل ہوچکے ہیں۔ اولیاء طلبہ سے اتحاد عمل پیدا کرنے کے لئے مدرسین کی ایک طرف کوشش بہت دور پہنچ چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی۔ جب تک والدین ایسی تحریکوں سے دلچسپی نہ لیں، جب تک اعلیٰ عہدہ دار اور جاگیردار اپنے مرتبہ اورمنصب کو فراموش کرکے بچوں کے والدین اور سرپرست کی حیثیت سے مدرسہ کی تحریکوں میں دلچسپی نہ لیں اس وقت تک بیچارہ مدرس کچھ زیادہ نہیں کرسکتا۔ تاہم جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ کیا جارہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مدرس نے بہت کچھ کیا ہے۔

سب سے اہم مسئلہ جو قابل صدر نے اٹھایا ہے وہ مدرس کی تنخواہ کا مسئلہ ہے۔ اس میں شک نہیں بعض مدرسین کی تنخواہ کم ہے۔ جہاں پہلے (۱۵ ، ۳ تا ۶۵) ملتے تھے اب زیادہ سے زیادہ (۴۰) ملتے ہیں۔ یہ تنخواہ ایسی نہیں کہ کوئی اطمینان اورسکون قلب کے ساتھ کام کرسکے۔ اس کے متعلق ہم یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کو خود مدرسین کی مشکلات کا احساس ہے کیونکہ مدرسین کی طمانیت اورسکون قلب پر اس کی کارکردگی کا دارومدار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن مدرسین کو (۳۵ تا ۶۰) ملتے تھے، ان کی تنخواہوں میں کمی نہیں ہوئی۔ یہ ضروری ہوا ہے کہ بعض نئی جائدادوں پر جو تقررات ہوئے ہیں انکی یافت کم ہے۔ مگر مدرسین کی ابتدائی تنخواہوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ لوکلفنڈ کے مدرسین کے مشاہرہ کا اسکیل مختلف اور حد درجہ پست تھا اس میں یکسانیت پیدا کرکے مُدرس کی تنخواہ (۱۵) (۱۸) روپیہ اور صدر مدرس کی (۲۵) روپیہ کی گئی۔ اس پر بھی سررشتہ مطمئن نہیں ہے مگر در اصل یہ سوال بالکل اقتصادی ہے۔

تعلیمات کا موازنہ مقررہ ہے۔ مگر پبلک کا مطالبہ ہے کہ تعلیم پھیلائی جائے اور مدارس کی تعداد میں اضافہ ہو۔ چنانچہ بڑھتی ہوئی ملکی ضروریات اور پبلک کے مطالبات کے

مدنظر سررشتہ کو توسیع تعلیم تحتانیہ کا ایک پنج سالہ اسکیم منظور کرانا پڑا جس کا نفاذ ۱۳۴۹ف سے ہوا ہے۔ اسکیم مذکور کی رو سے پہلے سال توسیع تعلیم کے لئے (۲ ½) لاکھ روپیہ دیئے گئے اور بعد میں آئندہ پانچ سال تک ایک ایک لاکھ سالانہ دیئے جائیں گے۔ باوجودیکہ جنگ کی وجہ اکثر اسکیم معرض التوا میں پڑ گئی ہیں۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہر سال نئے مدارس کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور پانچ سال کے ختم پر امید ہے کہ (۵۲۰) مدارس تحتانیہ کا قیام مکمل ہو جائے گا۔ یہ رقم اگر سررشتہ مدرسین کی تنخواہوں کے اضافہ پر صرف کرے تو توسیع نہیں ہو سکے گی اور نہ مدارس کے اسٹاف میں اصلاح ممکن ہوگی، جس کی شدید ضرورت ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ مجبوراً تنخواہیں کم رکھی جائیں۔ اگر حکومت موازنہ میں اضافہ کرے تو سررشتہ کو تنخواہ کا اسکیل بڑھانے میں جس کے لئے وہ خود بے چین ہے، بڑی آسانی ہوگی۔

امتحانات کے معاملہ میں بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن نے ملک کی ضرورتیں پوری کر دی ہیں۔ ایک طرف تو نصاب ایسے مقرر کئے گئے ہیں جو مفید ہیں۔ دوسری طرف امتحانات کی تعداد اور نوعیت میں نہایت دل خوش کن تبدیلی کی گئی ہے۔ طبقہ ادنیٰ ثانوی کے امتحان ہشتم پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اب امتحانات نے رٹائی کے امکانات بہت گھٹا دیئے ہیں اور عام قابلیت کو بڑھانے کی صورتیں پیدا کر دی ہیں۔ آٹھویں جماعت کے ختم پر جو سرکاری امتحان لوئر سکنڈری لیا جانے والا تھا وہ مسدود کیا گیا۔ اور امتحانی اور غیر امتحانی مضامین کا امتیاز اب باقی نہیں رہا۔

دینیات سے فاضل صدر نشین نے نہایت گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے۔ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دینیات کی تعلیم کی خرابی، انتظام یا نگرانی کی خرابی یا کوتاہی کے باعث نہیں ہے۔ اور نہ اس کا سبب یہ ہے کہ دینیات ایک غیر امتحانی مضمون ہے۔ نگرانی کے لئے ایک ناظر القراء کا تقرر کیا گیا ہے، جو مدرسین کے کام کی نگرانی کرتا ہے اور ان کو مشورے دیتا ہے۔ غیر امتحانی مضامین سے متعلق یہ غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے کہ مضامین کی اہمیت گھٹ گئی ہے۔ اصل میں غیر امتحانی مضامین کے باعث رٹائی کا موقع

بہت کم ہوگیا ہے اور مدرس کا وقار بہت بڑھ گیا ہے۔ کیونکہ مدرسہ اور مدرسین ان مضامین میں اطمینان کر لینے کے بعد لڑکوں کو امتحان کے لئے منتخب کرتے ہیں اگر کوئی طالب علم ان مضامین میں کامیاب نہ ہو تو ان کو روک لیا جاتا ہے۔ اس طرح ان مضامین کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس سے قطع نظر جو حضرات دینیات یا اخلاقیات کی تعلیم کی خرابی کا اصلی سبب یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ غیر امتحانی مضامین ہیں انہیں خوش خبری دی جاتی ہے کہ اب دینیات یا اخلاقیات کو طیفہ فوقانیہ میں امتحانی مضمون کی حیثیت حاصل رہے گی۔ چنانچہ اس بارے میں فرمان خداوندی شرف صدور لایا ہے اور اب ان مضامین میں تمام طلبہ کو لازماً امتحان بھی دینا ہوگا۔

غرض کہ دینیات کی تعلیم میں جو نقص نظر آتا ہے اس کا حقیقی سبب یہ ہے کہ والدین اساتذہ سے تعاون نہیں فرماتے۔ اگر عام طور پر والدین دینیات سے ایسی ہی دلچسپی لینے لگیں جیسی کہ فاضل صدر نشین کو ہے تو ہمیں یقین ہے کہ دینیات کی تعلیم سے طلبہ کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا۔

تعمیر امکنہ اور تعلیم نسواں کے انتظامات موجودہ نظامت تعلیمات کے شاندار کارنامے ہیں۔ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ فاضل صدر نے اس کا استحسان فرمایا ہے ہمیں توقع ہے کہ رفتہ رفتہ تمام مدرسوں کے لئے موزوں عمارتوں کا انتظام ہوجائے گا۔ اور تعلیم کا جو مقصد ہے اس کی تکمیل میں مدرسین اور اساتذہ کو سہولت اور کامیابی ہوگی۔

آخر میں ہم جناب صدر کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ صاحب موصوف نے مدرسین کو اپنے قیمتی مشوروں سے سرفراز فرمایا۔ ہمیں یقین ہے کہ مدرسین ان مشوروں پر عمل کرکے سررشتہ کی کارکردگی میں اضافہ کرنے کی سعی فرمائیں گے۔ فقط

جلد ۱۶
شمارہ ۴

زیر سرپرستی جناب سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔ اے (آکسن) ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

صدر انجمن اساتذہ ممالک محروسہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

کا

سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت

سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسئول عبدالنور صدیقی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

سعید الدین خاں بی۔ اے۔ ڈپ۔ ایڈ (عثمانیہ) ملا فخر الحسن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ خورداد لغایتہ امرداد ۱۳۵۱ف

فہرست مضامین

جلد (۱۶) شمارہ ۴

تعلیم ہند میں جدید رجحانات

از

خواجہ محمد یوسف الدین صاحب ایم۔اے (لیڈز) لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج

میں سمجھتا ہوں کہ اس تقریر کے عنوان کے اعلان میں کچھ لفظی تغیر ہوا ہے۔ میرا مقصد دراصل اُن تحریکات کے متعلق گفتگو کرنا ہے جو گذشتہ پچیس تیس سال سے ہماری تعلیم میں بہت نمایاں ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک ہم ذرا تفصیل سے ان کا جائزہ نہ لیں ہم ان رجحانات کو نہیں سمجھ سکتے جن کے وہ مظہر ہیں۔ اور ان تحریکات کو اُن کی صحیح روشنی میں دیکھنے کے لئے نیز یہ معلوم کرنے کے لئے کہ دراصل ان خیالات کے محرک کیا اسباب ہیں اور ان کی ہمارے نظام تعلیم میں کیا اہمیت ہے ایک مختصر سے پس منظر کی ضرورت ہے۔ اور اس کی ابتدا ہوتی ہے لارڈ میکالے کے اس مشہور یادداشت سے جس کے بعد ہندوستان کی تعلیمی پالیسی معین ہوگئی۔ سنسکرت یا فارسی کو ذریعہ تعلیم بنانے کا قضیہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ انگریزی نے ان کی جگہ لے لی اور ہر ایک ہندوستانی طالب علم کے لئے اُس کا سیکھنا لازمی قرار پایا۔ گو اس کے بعد بھی انگریزی کی مخالفت ہوتی رہی اور مختلف فرقوں نے اس سے الگ رہنے کی کوشش کی مگر حکومت کی مستقل مزاجی کے آگے کسی ایک کی بھی پیش نہ گئی۔ مسلمان اس مخالفت میں سب سے پیش پیش تھے اور اس سے بہت دنوں تک علٰحدہ رہنے کی کوشش کی۔ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا وہ اپنے مذہب اور ثقافت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے مرادف سمجھتے تھے اور اسی لئے وہ اس جدید تعلیمی دوڑ میں اپنے ابنائے وطن سے بہت پیچھے رہے اور جب تک سرسید علیہ الرحمتہ نے اپنی غیر معمولی عملی قوت اور خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر ان میں اس تعلیم کے عام کرنے کا بیڑا نہ اُٹھایا اور ایم۔اے۔اُو کالج علی گڈھ قائم کرکے ان کے لئے جدید علوم و فنون کا ایک سرچشمہ مہیا نہ کردیا۔ ان کی بڑی تعداد اس سے دُور دُور رہی۔ بہرحال اس نئی تعلیم کا سکہ

کسی نہ کسی طرح چل گیا پانچ جامعات قائم ہوگئیں یعنے جامعات مدراس۔ الہ آباد۔ بمبئی۔ کلکتہ و پنجاب۔
اور یہیں سے موجودہ ہند کو بنانے والے سارے لیڈر۔ سیاس۔ سائنس دان۔ شاعر اور
فیلسوف پیدا ہوئے۔ رفتہ رفتہ قومی نوعیت کے بعض ادارے بھی قائم ہوئے جن میں
سب سے مشہور بنارس کالج اور علی گڈھ کالج ہیں اور جو بعد میں چل کر ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی
بن گئے اور اس کے بعد پروفیسر کاروے کی عورتوں کی یونیورسٹی۔ ڈاکٹر ٹیگور کا شانتی نکیتن اور
گروکل قابل ذکر ہیں۔ اس اثنا میں سیاسیات ہند میں بہت سے مدوجزر ہوئے اور تحریک ترک
موالات کے نتیجہ طور پر علی گڈھ کالج کا ایک حصہ کٹ کر علٰحدہ ہوگیا اور جامعہ ملیہ کے نام سے
موسوم ہوا۔

مذکورہ قدیم جامعات کا معیار کافی بلند تھا (اور وہ اب بھی اُس کو برقرار رکھنے کی
کوشش کرتی ہیں) اور ان کے اخراجات میں بھی روزافزوں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر ہر ممکن کوشش
اور صرف زرکثیر کے باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد محدود ہی رہی۔ گو اس خصوص میں
جامعہ کلکتہ کی کوششیں مقابلۃً کامیاب اور وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کی تعداد کافی زیادہ
رہی مگر عام طور پر ثانوی مدارس اور جامعات کی پیداوار کیا بلحاظ تعداد اور کیا بلحاظ افادیت
زیادہ تشفی بخش نہ رہی۔ گو اس کے بعد ہر صوبے و مقام کی ضروریات کے مدِ نظر جدید جامعات
کا قیام بھی عمل میں آیا مگر اس کے باوجود بھی تعلیم کا اصل مقصد کہ وہ طالب علم کو ہر جہتی ترقی اور
کامیاب زندگی بسر کرنے کے قابل بنائے حاصل نہ ہوا۔ پہلے تو جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے
تعلیم یافتگان کی تعداد اخراجات اور کوششوں کے مقابلے میں بہت کم تھی اور اس کے باوجود
ان میں سے اکثر اس قابل نہ تھے کہ میدان عمل میں دوسروں کے دوش بدوش کام کریں
اور جہاد زندگی میں نمایاں حصہ لیں۔ تقریباً سب کے سب تعلیم یافتہ نوجوان نوکری کی تلاش میں
سرگرداں رہتے تھے اور سرکاران کے لئے اس کثیر تعداد میں آسامیاں فراہم نہ کرسکتی تھی اور
اسی لئے وہ حکومت اور ملک کے لئے ایک مصیبت اور بوجھ بن گئے۔ اس کے ساتھ یہ بھی
محسوس کیا گیا کہ اس طریقہ تعلیم میں تضیع کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ پہلے تو ان نوجوانوں کو بہت
سی ایسی چیزیں سکھائی جاتی تھیں جن میں سے بہت سی اب بھی سکھائی جاتی ہیں جو ان کے لئے

آئندہ مفید نہیں ہوتیں۔ اور دوسرا جو اُنھیں غیر زبان میں تعلیم دیجاتی ہے۔ اس کی وجہ سے اُس کے حصول میں اور اُس پر عبور حاصل کرنے کے لئے اُن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ رائگاں جاتا ہے۔ جب اس نظام تعلیم سے غیر اطمینانی کا اظہار کھلم کھلا کیا جانے لگا اور ہر ایک پلیٹ فارم سے اس پر حملے ہونے لگے اور تقریباً ہر یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں اس پر نکتہ چینی کی جانے لگی تو حکومت ہند نے اس پر نظر ثانی کرنے کے لئے چند کمیٹیاں اور کمیشن مقرر کئے جن میں سے سیڈلر کمیشن اور ہارٹاگ کمیٹی قابل ذکر ہیں۔ مگر ان کمیشنوں اور کمیٹیوں نے نظام تعلیم میں کسی بنیادی تغیر کو روا نہ رکھا اور صرف معمولی سی تبدیلیوں کی سفارش کی اور ظاہر ہے کہ لوگ اس سے مطمئن نہ ہو سکے۔ ایسے وقت میں جامعۂ عثمانیہ کے قیام اور ایک دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیکر حیدرآباد نے ایک نہایت ہی قابل تقلید اور دلیرانہ قدم اُٹھایا اور ہندوستان کے ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ کو حل کر دیا۔ گو اس تجربہ پر ابتدا میں بہت سی چہ میگوئیاں ہوئیں اور مختلف نوعیت کے اعتراضات کئے گئے مگر اس کی شاندار کامیابی نے معترضین کو ساکت کر دیا۔ اور اب تو ہر جگہ اس کی علانیہ تقلید کی جا رہی ہے۔ اس طرح زبان کی حد تک تو تقریباً یہ مسئلہ حل ہو گیا مگر چونکہ نصاب تعلیم میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی اس لئے یہ مسئلہ اپنی جگہ پر ہی رہا۔ تعلیم یافتہ بیکاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا جو اب بھی جاری ہے۔ اور علاوہ ازیں یہ تعلیم یافتہ ملک اور قوم کے لئے اتنے مفید ثابت نہ ہو سکے جس کی ان سے توقع کی جاتی تھی۔ صائب الرائے اشخاص نے ملک کے مختلف گوشوں سے ان مسائل کے حل کے متعلق مختلف تجاویز پیش کیں مگر چونکہ غلبہ اس رائے پر تھا کہ فنی اور حرفتی تعلیم ہی ملک کی تعلیم یافتہ بے روزگاری اور دیگر معاشی مسائل کا ایک واحد ذریعہ ہے اس لئے حکومت نے انگلستان سے دو ماہرین صنعتی تعلیم یعنے مسٹر ایبٹ اور مسٹر ووڈ کو ہندوستان بلایا اور اُن سے استدعا کی کہ وہ یہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کر کے یہاں صنعتی اور فنی تعلیم کو رواج دینے کے متعلق تجاویز پیش کریں۔ چونکہ ان ہر دو کے لئے تمام ہندوستان کا تفصیلی دورہ کرنا مشکل تھا اس لئے انھوں نے صرف دو صوبہ جات یعنے صوبہ متحدہ (یو۔پی) اور پنجاب کو بطور نمونہ چن لیا اور اپنی جو رپورٹ مرتب کی اُس کی بنیاد اسی اعداد و شمار اور مواد پر

رکھی جو انھیں ان صوبہ جات میں حاصل ہوا۔

ابٹ اور ووڈ صاحبان کی رپورٹ - چونکہ ان ہر دو اصحاب نے فنی تعلیم کے کسی قابل لحاظ توسیع کی سفارش نہیں کی اس لئے ان کی رپورٹ سے نہ تو قوم پرست اخبار مطمئن ہو سکے اور نہ قوم پرست ہندوستانی۔ ان ہر دو نے اس پر نہایت ہی سخت تنقید کی اور اس کو غیر اہم ٹھہرایا۔ وہ ایک حدتک اپنی تنقید میں حق بجانب بھی تھے اس لئے کہ اس کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مصنفین کے خیال میں نہ صرف موجودہ زمانے میں بلکہ آئندہ ایک بڑی مدت کے لئے بھی ہندوستان کے لئے کوئی شاندار صنعتی مستقبل نہیں ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان جس طرح ایک قدیم طرز کا زراعتی ملک ہے وہ اس میں کوئی زیادہ تبدیلی مناسب نہیں سمجھتے۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ دیہات کی آبادی کے حالات کو دیہات سے متعلق صنعتوں کو فروغ دے کر درست کرنے کے امکانات بالکل محدود ہیں۔ صنعت و زراعت کے متعلق بھی وہ کوئی ایسے جدید طریقے تجویز نہیں کرتے جن کے باعث یہاں کی زراعت بھی جدید اصولوں پر ترقی یافتہ ذرائع اور آلات کے ذریعہ عمل میں آئے۔ موجودہ چند صنعتی مدارس کے منتظمین کی وہ تعریف کرتے ہیں اور اُن کی رہبری کے لئے چند تجاویز پیش کرتے ہیں۔ بڑے پیمانہ کے صنعتوں کی ملک میں ایزاد، ترویج و ترقی کے متعلق وہ کچھ نہیں کہتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی موجودہ منظم صنعتوں میں اعلیٰ تربیت یافتہ منتظمین (یعنے ڈائرکٹر اور منیجر) کے حصول کی خواہش نہیں ہے اور اس لئے یہ غیر ضروری ہے۔ ہر قدم پر وہ صنعتی ترقی میں احتیاط کی تلقین کرتے ہیں اور یہ خوف دلاتے ہیں کہ کہیں فنی بے روزگاری نہ پھیل جائے۔ عام اور فنی تعلیم کے متعلق چند تجاویز پیش کرکے اور اس کے لئے ایک نصاب کا خاکہ تیار کرکے وہ اپنی رپورٹ کو ختم کرتے ہیں۔

رپورٹ کے اس مختصر سے خلاصہ سے ظاہر ہوگا کہ اس میں ہندوستان کے اس اہم اور بڑے مسئلہ یعنے صنعتی ترقی کو حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ گو مسرس ابٹ اور ووڈ کو اس کا اعتراف ہے کہ اگر اعلیٰ پیمانہ پر صنعتی ترقی ہو تو ہندوستان کی خام پیداوار کو کام میں لانے کا اچھا موقعہ ملے گا مگر اس کے ساتھ ہی وہ کہتے ہیں کہ جس تدریجی طور پر اعلیٰ صنعتوں کی

بنایا جاتا ہے اس کا یہاں کافی احساس نہیں۔ محض تربیت یافتہ کاری گر پیدا کرنا گو صنعتی ترقی کے لئے ضروری ہے مگر اس سے صنعتیں پیدا نہیں ہوسکتیں۔ گو یہ ایک حد تک صحیح خیال کیا جا سکتا ہے پھر بھی اگر قوم صنعتوں کو ترقی دینے پر کمربستہ ہو اور حکومت ہر قسم سے اس کے لئے سہولتیں پیدا کرے تو یہ کوئی ناممکن بات نہیں۔ حال ہی میں رُوس نے جو صنعتی ترقی کی ہے اس کی مثال سب کے پیش نظر ہے۔ کوئی ڈھائی سال پہلے مختلف کانگریسی صوبہ جات کے وزراء کی ایک کانفرنس اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس کے صدر تھے اور مسٹر ویسوسوریا اس کے سرگرم رکن۔ مگر افسوس ہے کہ سیاسی نشیب و فراز کے باعث یہ کام سرسبز نہ ہوسکا۔

وردھا اسکیم۔ قانون حکومت ہند کے تحت جب صوبہ جات کو خودمختاری عطا ہوئی اور کانگریس نے انتخاب میں حصہ لے کر نو صوبہ جات کی حکومت پر قبضہ کر لیا تو اس کو قوم کے روبرو ایک ٹھوس لائحہ عمل پیش کرنا تھا۔ گاندھی جی نے دو تجویزیں پیش کیں ایک ترک مسکرات اور دوسرے ابتدائی تعلیم کو عام کرنا تاکہ ہر ایک ہندوستانی بچہ تعلیم سے بہرہ ور ہو۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ ترک مسکرات سے حکومت کی آمدنی میں بہت کمی ہوتی تھی)۔ اس کو پورا کرنے کے لئے گاندھی جی نے یہ تجویز پیش کی کہ ابتدائی تعلیم کو خودمکتفانہ اُصول پر چلایا جائے۔ اس سے اس کی توسیع کے لئے نہ صرف حکومت سے روپیہ نہ لینے کی ضرورت ہو گی بلکہ موجودہ روپیہ جو اس پر خرچ ہوتا ہے اس سے بھی دست برداری کر کے اس کو ترک مسکرات سے جو آمدنی میں کمی ہوئی ہے اس کے پورا کرنے میں لگایا جا سکے گا اور اس تجویز کو روبہ عمل لانے کے لئے اُنھوں نے اپنا مشہور وردھا اسکیم پیش کیا۔ اس کی ابتدا گاندھی جی کے ایک مضمون سے ہوئی جس کو اُنھوں نے اپنے اخبار ہریجن میں شائع کیا تھا۔ اُس میں اُنھوں نے تجویز کی کہ (۱) ابتدائی تعلیم سات سال تک جاری رہے اور اس کے ختم پر طلبہ کا معیار میٹرک کے آخری درجے کے معیار کے مساوی ہو۔ انگریزی نصاب میں شامل نہ ہو گی (۲) طلبا و طالبات کی عام ترقی کے لئے اس تعلیم کو کسی سودمند پیشے کے ذریعہ دیا جانا چاہئیے۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ اس ابتدائی تعلیم کے ذریعہ نہ صرف طلبہ کی ذہنی تربیت ہو بلکہ وہ کوئی مفید پیشہ بھی

سیکھ لیں تاکہ وہ ختم تعلیم کے بعد اسی کے ذریعہ اپنی روٹی کما سکیں (۳) ان مدارس کی جو صنعتی پیداوار ہوگی اُس کی مناسب قیمت مقرر کر کے حکومت خود اس کو خرید ے (۴) یہ تعلیم بحیثیت مجموعی خود مکتفی ہونی چاہئے۔ اعلیٰ اور ثانوی تعلیم خانگی کوششوں کی رہین منت رہے اور جامعات (یونیورسٹیوں) کی حیثیت محض ایک امتحان لینے والے ادارے کی رہے۔

اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد گاندھی جی کی صدارت میں ۱۹۳۷ء میں تمام ہندوستانی قوم پرستوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں دوسری جماعتوں کے ماہران تعلیم کو بھی شریک کیا گیا تھا اور اس میں حسب ذیل تحریکات منظور ہوئیں :۔

(۱) قومی بنیاد پر سات سال تک کے لئے جبری اور مفت تعلیم کا انتظام کیا جائے (۲) ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو (۳) یہ کانفرنس گاندھی جی کی اس تجویز کی تائید کرتی ہے کہ یہ تعلیم کسی عملی کام کے ذریعہ دی جائے اور اس کا انتخاب مقامی پیشہ اور گرد و نواح کے حالات کے مدنظر کیا جائے (۴) اس کانفرنس کو توقع ہے کہ اس طریقہ تعلیم سے رفتہ رفتہ مدرسین کی تنخواہیں نکل آئیں گی (۵) طلبہ کو سات سال کی عمر میں اِن مدارس میں شریک کیا جائے اور سات سال تک تعلیم دینے کے بعد انھیں ہر مضمون میں (بجز انگریزی کے) میٹرک کے معیار کے مساوی کر دیا جائے۔

اس کے بعد کانفرنس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی تاکہ ان اصُول کے پیش نظر وہ اس نظام تعلیم کے لئے ایک نصاب تیار کر دے۔

اس نظام تعلیم پر مختلف نقاط نظر سے اعتراضات کئے گئے جن میں سے اہم یہ ہیں۔

(۱) تعلیم کو خود مکتفی کرنے کی پالیسی ہندوستان جیسے تعلیمی لحاظ سے پست ملک میں بہت خطرناک ہے (۲) اگر کم عمر بچوں کو اپنی تعلیم کے لئے کام کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس سے نہ صرف اُن کی تعلیم کا نقصان ہوگا بلکہ اُن کی صحت پر بھی اس کا مضر اثر پڑے گا اور مزید یہ کہ کیا وہ اس قابل ہو سکیں گے کہ وہ ایسی اشیا تیار کر سکیں جن کی بازار میں مانگ ہو اور لوگ جن کو خریدنا پسند کریں۔ کیا اُن کے اس طرح کام کرنے سے یہ اندیشہ نہیں کہ اُن سے معمولی مزدوروں اور غلاموں کی طرح کام لیا جائے گا۔ (۳) سب لڑکے بافندگی یا

زراعت کا پیشہ تو اختیار نہ کریں گے اُن سے تین سے پانچ گھنٹوں تک چرخہ کاتنے کا یا زراعتی کام لینے کا مقصد کیا ہے (۴) اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا اور اخلاقی تعلیم پر بھی کافی توجہ نہیں کی گئی۔ (۵) یہ میکانی زمانہ ہے ایسے وقت دستی کاموں پر ضرورت سے زیادہ زور دینا اور مشینوں کو بالکل نظر انداز کر دینا موجودہ زمانے کی ضروریات کو صرف نظر کرنا ہے۔

اس اسکیم پر فن تعلیم کے نقطۂ نظر سے حسب ذیل اعتراضات عائد ہوتے ہیں۔

(۱) اس کمسنی میں طلبہ کو کسی خاص پیشہ کی تعلیم کی طرف رجوع کرنا بڑی اُصولی غلطی ہے۔ انہیں صرف دستی مشاغل کی طرف رجوع کرنا چاہیئے تاکہ اُس سے وہ اپنے اصلی رجحان کا پتہ لگا سکیں (۲) کافی پیشوں کی سفارش نہیں کی گئی۔ چرخہ سب نہیں کاتیں گے اور چھ یا سات سال کی عمر کے بچوں سے تین یا اُس سے زیادہ گھنٹوں تک کسی کھیت میں زراعتی کام لینا اُن پر بڑا ظلم ہوگا۔ (۳) ادبی تعلیم کی طرف بہت کم توجہ کی گئی اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر کم توجہ کرنے کے باوجود سات سال کی مدت میں کسی طرح طلبہ میٹرک کا معیار حاصل کر سکیں گے (۴) میٹرک تک تعلیم یافتہ اساتذہ کی جبری بھرتی سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ان عارضی مدرسین سے بجائے فائدے کے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے۔ تجربہ کار اور تربیت یافتہ مدرسین کی ضرورت لابُدی ہے۔

گاندھی جی کی صدارت میں مذکورہ وردھا کانفرنس میں جو بحث مباحثہ ہوا تھا اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا کہ طلبہ کی حالت غلاموں کی سی ہوگی اور اُستاد غلاموں کو ہانکنے والے بن جائیں گے۔ پروفیسر کے۔ ٹی۔ شا (بمبئی) جنھوں نے اس بحث میں نمایاں حصہ لیا کہا کہ بغیر معاوضہ کے مدرسین کا ملنا محض خیالی شئے ہے۔ اگر آپ انھیں تنخواہ نہ دیں تو کسی اور جگہ سے اس کی پابجائی ہوگی۔ بہر حال قوم کو اُس کا بار اٹھانا پڑے گا۔ موجودہ زمانہ مشینوں کا زمانہ ہے علاوہ ازیں لڑکوں کے کام کرنے اور خراب کرنے کے لئے آپ مفت چیزیں کہاں سے دیں گے۔ اُن کے ہاتھ کی بنی ہوئی بھونڈی اور بھدی چیزوں کو کون خریدے گا۔ کیا اُن کے ہاتھ کی بنی ہوئی اشیا غیر ممالک کے اشیاء کے مقابلہ میں ٹک

سکیں گی اس تحریک کو چلانے کے لئے ان اشیاء کی حد تک آپ کو غیر ممالک کی اشیا کا بائیکاٹ کرنا ہوگا۔ اور سب صنعتوں کو قومیانہ ہوگا اور یہ بچوں کا کھیل نہیں۔

سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کی جانب سے ڈنکر دیسائی نے (اپنی کتاب ابتدائی تعلیم میں) اس اسکیم پر سخت اعتراض کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وردھا اسکیم کے مصنفین بچوں سے صرف محنت و مشقت ہی لینا چاہتے ہیں۔ اس اسکیم کے مطابق تحتانی تعلیم کی نوعیت ایک ایسی فنی تعلیم کی ہو جاتی ہے جس کی بنیاد کسی عام تعلیم پر نہ ہو۔ اور اس لئے ہم اس کو مزدوری اطفال کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ان اعتراضات کے جواب مرکزی مشاورتی بورڈ (Central Advisory Board) کی ایک کمیٹی میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دئے اس کمیٹی کے صدر مسٹر کھیر سابق کانگریسی وزیر اعظم (صوبہ بمبئی) تھے اور اس میں بہت سے ماہران تعلیم شریک تھے چنانچہ حیدرآباد کی جانب سے جناب خان فضل محمد خان صاحب سابق ناظم تعلیمات و معتمد صنعتی تعلیم وغیرہ نے اس میں شرکت کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ خیال کہ وردھا اسکیم مزدوری اطفال کے مساوی ہوگی غلط ہے اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ اس اسکیم کو محض اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا ہے کہ استادوں کی تنخواہیں ان اشیاء کی فروخت سے ادا کی جائیں جو لڑکے تیار کریں گے۔ پیشوں کو دستی مشاغل کی طرح تعلیمی اغراض و مقاصد کے آگے بڑھانے میں استعمال کرنا اس کا اصل مقصد ہے معاشی مقصد محض ذیلی ہے۔ وردھا اسکیم محض پیداوار اور آمدنی کے خیال سے میکانی مشقت نہیں چاہتی اور صحیح معنوں میں ان مدارس کو فنی یا پیشہ کے لئے تربیت دینے والے مدارس بھی نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے اس دعویٰ سے انکار کیا کہ وردھا اسکیم بیکاری کو دور کردے گی۔ مذہبی تعلیم کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا کہ گو وردھا اسکیم نے اس کے لئے کوئی نصاب تیار نہیں کیا مگر وہ موجودہ صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہتی۔ اگر کسی فرقے یا مذہب کے لوگ اپنے ہم مذہب بچوں کو مذہبی تعلیم دلانا چاہیں تو وہ اپنے خرچ سے ایسا کر سکتے ہیں۔ مزید اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وردھا اسکیم مخلوط تعلیم کو جبری نہیں بناتی اس کے متعلق اس نے کوئی رائے نہیں دی۔

ذاکر حسین رپورٹ نے یونیورسٹی کے متعلق کچھ نہیں کہا اس لئے یہ کہنا کہ یونیورسٹیوں کا کام صرف امتحان لینا ہوگا بیجا ہے۔ مختصر طور پر وردھا اسکیم۔ (۱) صرف عمل کے ذریعہ تعلیم دینا چاہتی ہے اور اشیاء کی تیاری اور فروخت سے اُس کو کوئی مطلب نہیں۔ (۲) دھاگا کاتنے اور بُننے ہی کو وہ بنیادی پیشے نہیں قرار دیتی بلکہ وہ اپنی اسکیم میں ہر ایک پیشے کو شامل کرنے اور جگہ دینے کے لئے تیار ہے (۳) اس کا یہ مقصد نہیں کہ اساتذہ کی تنخواہیں مدارس کی تیار شدہ اشیاء سے دی جائیں (۴) وردھا اسکیم کے تیار کرنے والوں نے بتایا ہے کہ ہندوستان کی زیادہ آبادی دیہات میں ہے۔ اس لئے کمیٹی کی رائے میں مناسب ہے کہ اس کو فی الحال دیہات کی حد تک ہی محدود کیا جائے اور شہری آبادی میں اس کا نفاذ فی الحال عمل میں نہ آئے۔ آخر میں کمیٹی نے جو نتائج اخذ کئے (اور جو تحریکات کی شکل میں منظور ہوئیں) وہ مختصراً یہ ہیں:—

(۱) یہ اسکیم فی الحال دیہاتی آبادی تک محدود رہے۔ (۲) جبریہ تعلیم ۶ تا ۱۴ سال رہے مگر ۵ سال کے بچوں کو بھی شریک کیا جا سکتا ہے (۳) بنیادی مدارس سے دوسرے قسم کے مدارس میں طلبہ کو پانچویں جماعت یا ۱۱ سال کی عمر کے بعد منتقل ہونے کی اجازت دی جائے (۴) ذریعہ تعلیم طالب علم کی مادری زبان ہو (۵) ہندوستان کے لئے مشترک زبان کی ضرورت ہے اور یہ ہندوستانی ہونی چاہئیے اور اس کے لئے دیوناگری اور فارسی رسم الخط استعمال کئے جائیں اور ان کا استعمال طلبہ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے اور ہر ایک مدرس کو ان ہر دو رسم الخطوں سے واقف ہونا چاہئیے۔ بعض اراکین کے خیال میں رومن رسم خط کا استعمال طلبہ اور مدرسین کی بہت سی مشکلوں کو آسان کر دے گا۔ (۶) یہ اسکیم مسٹر ایبٹ اور ووڈ کی رپورٹ سے اس حد تک پوری طرح متفق ہے کہ تعلیم عمل کے ذریعہ دیجانی چاہئیے۔ یہ عملی مشاغل مختلف قسم کے ہونے چاہئیں خصوصاً ابتدائی اور بعد کی جماعتوں میں اور وہ ایسے ہوں جو کسی فن کی بنیاد بن سکیں۔ اور جو چیزیں تیار ہوں اُن کو فروخت کر کے اُن کی آمدنی کو مدرسے کے اخراجات میں لگایا جائے۔ (۷) بعض ثقافتی مضامین جن کو بنیادی پیشوں کے ساتھ مربوط نہیں کیا جا سکتا اُن کی تعلیم الگ دی جائے۔ (۸) مدرسین کو تربیت دی جائے

اور اُن کی وقعت بڑھائی جائے (۹) کسی مُدرس کو ماہانہ بیس روپیوں سے کم تنخواہ نہ ملے۔ (۱۰) معلمات کی زیادہ تعداد میں فراہمی کی طرف توجہ کی جائے اور اچھی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو اُستانی بننے کی ترغیب دی جائے۔ (۱۱) ان بنیادی مدارس کا صرف اُس وقت آغاز کیا جائے جب تربیت یافتہ مدرس فراہم ہوں (۱۲) تجربہ کے مدنظر نصاب میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ (۱۳) انگریزی کو بطور زبان زائد کے ان بُنیادی مدارس میں شریک نہیں کیا جاسکتا حکومت کو ہر فرقے کے لئے یہ سہولت بہم پہونچانی چاہئے کہ وہ اپنے خرچ سے اپنے مدارس میں اپنے ہم مذہب لڑکوں کے مذاہب کی تعلیم کا انتظام کرے مگر حکومت ان اخراجات کا بار نہ اُٹھائے گی۔ (۱۵) کوئی بیرونی امتحان نہ لیا جائے۔ نصاب کے ختم پر ایک خانگی امتحان کی سند دی جائے۔ (۱۶) پانچویں جماعت یا گیارہ سال کی عمر کے بعد جو لڑکے دوسرے مدارس میں منتقل ہونا چاہیں اُنھیں صداقت نامہ ترک مدرسہ دیا جائے۔ (۱۷) جماعتی درجہ بندی مدرسہ ہی کے ذمے رہے گی۔ البتہ خانگی امتحانات کی جانچ ایک معائنہ کنندہ افسر کیا کرے گا۔

اس رپورٹ پر مسٹر پی جی۔ کھیر۔ سید محمود صاحب۔ مسٹر آر شکلا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین۔ فضل محمدؐ خاں صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے دستخط ہوئے اسی اسکیم کے تحت اساتذہ کی تربیت کے لئے چند مراکز قائم ہوئے اور کام بھی شروع کر دیا گیا۔ مگر سیاسی نشیب و فراز کے باعث اس کو پوری طرح روبہ عمل نہیں لایا جاسکا۔ البتہ کشمیر میں وہاں کے ناظم تعلیمات خواجہ غلام السیدین صاحب نے اسی اُصول پر متعدد مدارس قائم کئے ہیں اور مدراس اور شمالی ہند میں بھی چند مدارس ان اصول پر چلائے جا رہے ہیں۔ مگر ان سے نتائج اخذ کرنا قبل از وقت ہوگا۔

صوبہ متوسط و برار میں مسٹر آر وی شکلا نے جو پہلے وزیر تعلیم تھے اور بعد میں وہاں کے وزیر اعظم بن گئے ودیا مندر اسکیم کی بنا ڈالی۔ مقاصد اور نظام تعلیم میں یہ اسکیم دراصل واردھا اسکیم ہی کا ایک جزو ہے۔ البتہ اس میں زراعتی تعلیم کو اہمیت دی گئی تھی اور حکومت کی جانب سے اراضیات کے فراہم کرنے کی تجویز تھی۔ اُس کی آمدنی سے اساتذہ کی تنخواہیں اور مدارس کا خرچ نکالنا مقصود تھا۔ اس اسکیم کو ایک حد تک نافذ کرنے کی کوشش کی گئی اور چند مدارس بھی

قائم ہوئے اور گو ان کی طرز تعلیم اور طریق عمل پر بعض فرقوں کی جانب سے سخت اعتراضات بھی کیے گئے پھر بھی مسٹر شکلا نے اُن کو چلانے کی کوشش کی۔ مگر جب کانگریسی وزارتیں مستعفی ہوگئیں تو اس اسکیم کا بھی وہی حشر ہوا جو واردھا اسکیم کا ہوا۔

حیدرآباد بھی ان تحریکات میں دوسروں سے پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح عثمانیہ یونیورسٹی قائم کرکے ہم نے ہندوستان کے ایک پیچیدہ مسئلہ کو حل کر دیا اسی طرح صنعتی تعلیم کی ایک اسکیم کو نہ صرف منظور کرکے بلکہ اُس کو ایک حد تک روبہ عمل (تدریجی طور پر) لاکر ہماری ریاست نے بقیہ ہندوستان کی رہبری کی ہے۔ اس اسکیم کو پہلے میکنزی اسکیم کہا جاتا تھا اور اس میں بعض تبدیلیوں کے باعث بعض اُسے اب فضل محمد خاں اور ابٹ اسکیم کہتے ہیں اس موضوع پر اب تک کافی کہا جا چکا ہے اور اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو سال گذشتہ ہی جناب مولوی سید علی اکبر صاحب نے اس کانفرنس کے ورنگل کے اجلاس میں اس پر ایک سیر حاصل تقریر فرمائی اس لئے میں اس کی تفصیلات میں جانا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

اب تک جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ملک کا رجحان کس طرف ہے یعنی مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا اور دوسرے صنعتی تعلیم کو ترقی دینا۔ یہ ہر دو رجحانات نہایت مبارک ہیں اور ہم اِن کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ کتابی مدارس کو عملی مدارس میں تبدیل کرنا ایک مستحسن کام ہوگا اور ہم اس نفسیاتی اُصول سے بھی آگاہ ہیں کہ بچے عملی کام کو کتابوں کی بہ نسبت زیادہ پسند کرتے ہیں اور دلچسپ مشغلے اُن کی طبیعت کو اپنی طرف متوجہ رکھتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کی احتیاط کرنی ضروری ہے کہ ہمارا یہ رجحان ہمیں ضرورت سے زیادہ آگے نہ لے جائے۔ ورنہ ہماری آئندہ نسلوں کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچے گا۔

ہندوستان کو بعض اجانب نے مختلف قوموں اور تہذیبوں کی سرزمین کہا ہے اور وہ اکثر اس بات کو دُھراتے رہتے ہیں کہ یہ ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ یہ بیان مبالغہ آمیز ہے مگر پھر بھی اس ملک کے مختلف فرقوں میں جو یکجہتی اور اتفاق ہونا چاہئے وہ ابھی تک ایک خوش آیند خواب بنا ہوا ہے۔ اور جیسا کہ

ہر ایک جانتا ہے اِن آپس کے اختلافات کی وجہ سے ملک کی سیاسی ترقی رُکی ہوئی ہے
ملک کے دور اندیش اور زیادہ روشن خیال افراد اس گُتھی کو سُلجھانے کی فکر میں ہیں بعض
چاہتے ہیں کہ طلبہ کے نصاب میں ایسے مضامین شریک کیئے جائیں جن سے اُن کی نظر وسیع
ہو یا بالفاظ دیگر وہ تنگ نظری اور آپس کے اختلافات کو بھول جائیں اور ایک دوسرے
سے قریب سے قریب تر ہو جائیں اور اس طرح ایک متحدہ ہندوستان کی تخلیق ہو۔
بعض کا خیال ہے کہ وردھا اسکیم سے مذہبی تعلیم کو خارج کر کے گاندھی جی نے اس مقصد
کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مذہبی تعلیم کو ابتدا میں وردھا اسکیم سے خارج کرنے
میں گاندھی جی کا اگر در اصل یہی مقصد تھا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ طریقہ عمل کے اختیار کرنے
میں انھوں نے سہو کیا اور بڑے سے بڑے آدمی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ اس کے عوض
اگر وہ محض مختلف مذاہب کے ان اجزا رکی تلقین پر زور دینے کی کوشش کرتے جو ایک دوسرے سے
محبت کرنا ایک دوسرے کی مدد کرنا اور بقول حضرت سعدی بنی آدم اعضائے یک دیگر ند کے
زرین اُصول کو سمجھنا اور اُس پر عمل کرنا سکھاتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ انھیں مقابلتہً زیادہ کامیابی
ہوتی بہرحال ہیں اس سے اس رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ نصاب میں انسیتی مضامین
Humanistic Subjects کو شریک کیا جائے تاکہ اس سے طلبہ میں روشن
خیالی اور وسیع النظری پیدا ہو اور ملک فرقہ واریت کی لعنت سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے۔
ان کے علاوہ اور بھی بعض تحریکات ہیں جن سے ضمنی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔
مثلاً کئی سال سے بعض جگہ ثانوی جماعتوں کے لئے اور اکثر جگہ جامعاتی جماعتوں کے لئے
ایک چھوٹے پیمانہ پر فوجی تربیت کا انتظام ہے۔ جسے یو۔ ٹی۔ سی۔ کہتے ہیں۔ چند سال
سے بعض فرقے بھی اپنے نوجوانوں کو فوجی تعلیم دینے پر اصرار کر رہے ہیں اور بعضوں نے
تو فوجی مدارس تک قائم کر لئے ہیں جیسے ڈاکٹر مونجے کا فوجی مدرسہ۔ گو اس تحریک پر فرقہ وارانہ
رنگ چھایا ہوا ہے مگر پھر بھی اس سے ملک کے ایک علانیہ رجحان کا پتہ چلتا ہے۔
ایک اور تحریک ہے جسے پوری طرح محسوس نہیں کیا جا رہا ہے مگر جس کا مطالبہ اکثر
کیا جاتا رہا ہے اور اکثر ذمہ دار افراد نے اس کی تائید بھی کی ہے۔ اور وہ یہ کہ لڑکیوں کا

تعلیمی نصاب لڑکوں کے نصاب سے بالکل الگ ہو تاکہ موجودہ غیر موزون تعلیم کی سب برائیاں دور کرکے لڑکی کو شریف بیوی۔ اچھی ماں، سلیقہ مند، خود پر اعتماد کرنے والی، خوددار اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنے والی عورت بنایا جا سکے۔ نہ صرف عورتوں کی کانفرنسوں میں بلکہ مردوں کی کانفرنسوں میں بھی اس قسم کی تحریکیں منظور ہوئی ہیں اور یہ بھی محسوس کیا جا رہا ہے کہ عورت کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ معاشی حیثیت سے مرد کے لئے ایک بوجھ نہ بنی رہے بلکہ اس قابل ہو کہ حسب ضرورت کچھ کما سکے اور اس طرح گھر کے اخراجات کی بابجائی میں مرد کا ہاتھ بٹائے۔

اِن کے علاوہ ایک اور تحریک بھی ہے جو قدامت پرست طبقوں کی سخت مخالفت کے باوجود برابر ترقی کر رہی ہے اور وہ یہ کہ طالبات کو حسب ضرورت موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کی بھی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ بعض زنانہ کالجوں اور ثانوی مدارس میں (خصوصاً مشنری اداروں میں) تو ان کے باضابطہ تعلیم کا انتظام ہے اور بعض جگہ ڈراموں اور موسیقی کے جلسوں وغیرہ کی شکل میں اس شوق و ضرورت کو پورا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اکثر ریڈیو پر اعلان کیا جاتا ہے کہ فلاں مدرسہ کی لڑکیوں نے اس موسیقی کے یا اس ڈرامے کے پروگرام میں حصہ لیا۔ بعض علٰحدہ تحریکات کے اور مراکز بھی ہیں جہاں سے ان خیالات کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ مثلاً بنگال کی بھرت چار کی تحریک اور مسز سوکھی معروف بہ مینا کا، مسٹر اُودے شنکر، اور مسز آ کمنی ارنڈیل کے مراکز رقص اور اس کے متعلق ان تینوں کا پروپگنڈا۔

زہریلی گیسیں اور جنگ[1]

از

مولوی عبدالحکیم صاحب ایم ایس سی۔ ال۔ ٹی۔

گزشتہ آل حیدرآباد ٹیچرس کانفرنس میں میں نے ایک تقریر زہریلے سانپ، اُن کے اقسام، زہر کے اثرات اور مار گزیدہ کی اولیں امداد پر کی تھی۔ موجودہ تقریر کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ یہ تقریر جس زہریلے قسم کے مادہ سے متعلق ہے وہ دو پیر رکھنے والے سانپ کی دماغی کاوش یا تباہ کن حماقت کا نتیجہ ہے۔ یہ دو پیر والا سانپ انسان ہے۔ افسوس کہ انسان نے صلح و آشتی کے سبق کو یاد نہ رکھا جس کو چرند، پرند حتیٰ کہ درندوں نے بھی نہیں بھلایا۔ اگر آج یہ کہا جائے کہ انسان کا بدترین دشمن انسان ہے تو بالکل صحیح ہے اس بیان کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں دنیا جس دیوانگی کے دور سے گذر رہی ہے اُس سے ہم سب واقف ہیں اگر آج انسان کو یہ فخر ہے کہ وہ سائنس کی عجیب و غریب ایجادات میں ماضی کی قوموں سے بڑھا ہوا ہے تو یقیناً اس کے لئے یہ امر باعث ننگ و عار بھی ہے کہ وہ حقیقی تہذیب اور اخلاقی ترقی میں اپنے پیش رو انسان سے بہت پیچھے ہے۔ سائنس کی ان عجیب و غریب ایجادات کو انسان کی اخلاقی کمزوری نے اُس کے لئے اس قدر خطرناک بنا دیا ہے جس طرح ایک ناسمجھ بچے کے ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پستول ہو اور وہ اُس سے کھیل رہا ہو۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی معیار جو اُنس و محبت، حق و انصاف اور باہمی رواداری پر مشتمل ہے بلند ہونا اشد ضروری ہے ورنہ انسان اپنے ہاتھوں خود تباہ ہوگا۔ بنی نوع انسان کو اس

---

[1] یہ مقالہ آل حیدرآباد ٹیچرز کانفرنس کے پانچویں سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا۔ ۱۲

تباہی سے بچانا ہر شخص کا فرض ہے لیکن اس فریضہ کی اہم ترین ذمہ داری اُس گروہ پر عائد ہوتی ہے جو اپنے آپ کو مصلحان قوم اور معلمین بنی نوع انسان کہتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں وہ دن نہایت منحوس ہوگا جس دن کسی انسان نے دوسرے انسان کو کسی محفوظ فاصلے سے پتھر پھینک کر زخمی یا ہلاک کیا ہوگا۔ اس اصول پر گوپھن اور تیر و کمان کی ایجاد ہوئی۔ بعد میں تیروں کے پھلوں کو زہر میں بجھایا گیا۔ یہ گویا زہریلے مادہ کو انسان کے خلاف استعمال کرنے کی اولیں شکل تھی۔ منجنیق کی ایجاد پر وزنی پتھر اور لکڑی کے جلتے ہوئے کندوں سے جن کو رال، روغن اور گندھک سے تر کر لیا جاتا تھا دشمن کے قلعے اور شہر پر آتشباری کی جانے لگی۔ گندھک کے جلنے سے دم گھٹنے والی گیس خارج ہوتی تھی چنانچہ ساتویں صدی میں جب عربوں نے سمندری راستہ سے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو یونانیوں نے گریک فائر کے ذریعہ جو اسی قسم کی آتشباری پر مشتمل تھی عربوں کے بیڑے کو تباہ کر دیا۔ بارود کی ایجاد نے جنگ کی تباہ کاریوں میں بڑا اضافہ کیا۔ بارود دراصل بشکل ٹھوس گیسوں کے ضخیم مجموعہ کا نام ہے۔ جو آگ لگتے ہی نکل پڑتی ہیں اس موقعہ پر ایک امر قابل غور ہے کہ انسان جوں جوں کثیف مادہ سے لطیف مادّہ پر قادر ہوتا گیا وہ قوی سے قوی تر بنتا گیا۔ جب اس نے پانی کی بجائے اُس کی بھاپ اور بھاپ سے بھی لطیف تر پیٹرولیم کے بخارات کو اپنا ذریعہ کار بنایا تو اس کے کام کی افادیت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اسی اصول کی بنا پر کاش اگر انسان مادہ پرست بننے کی بجائے اُس اعلیٰ لطیف ترین ہستی کا پرستار ہوتا جو عارف کل اور رب کل ہے تو اُس کی مسرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔

تاریخ جنگ کے مطالعہ سے کوئی ایسا وثیقہ نہیں ملتا جس سے ثابت ہو کہ قدیم اقوام نے جنگی اغراض کی خاطر زہریلی گیسوں کا استعمال کیا ہو۔ بجز اُن صورتوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ پندرھویں اور سولھویں صدی تک گیسوں کے متعلق انسان کے معلومات بالکل سطحی اور محدود تھے وہ معمولی گیسوں سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھا چنانچہ خشک کوؤں، قدیم تہ خانوں اور نشیبی زمینوں پر

بعض اوقات کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس ہوا سے بھاری ہونے کی وجہ سے جمع ہوجاتی تھی اور اُن میں کوئی جانور زندہ نہ رہ سکتا تھا ایسی جگہوں کو جن آسیب اور اِسی قسم کی دوسری پُراسرار قوتوں کا آماجگاہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ جزیرہ جاوا کی زہر کی وادی اور اٹلی میں شہر نیلپیز کے قریب گرد ٹوڈیل نامی غار جن میں ۱½ یا ۲ فٹ بلندی تک کاربن ڈائی آکسائیڈ جمع ہوگئی ہے اس قسم کے پُراسرار مقامات سمجھے جاتے تھے۔ گروٹوڈیل غار سے اگر کوئی مُسافر گذرے تو صحیح و سالم بخیریت گذرجاتا تھا لیکن اگر کوئی چھوٹے قد کا جانور مثلاً کتا یا بلی وغیرہ گذرے تو ہلاک ہوجاتا تھا۔ اس ہلاکت کے ذمہ دار بھوت یا جن سمجھے جاتے تھے۔ ہمدان اور اُس کے اطراف نہ بجھنے والی شعلہ زن گیسیں صدیوں جلوۂ خدا سمجھ کر پرستش کی گئیں۔

وسیع پیمانے پر پہلے پہل جرمنوں نے ۲۲ اپریل ۱۹۱۵ء کو وائی پریس کے میدان میں گیسی جنگ کا آغاز کیا۔ یہ گیس کلورین تھی جو معمولی کھانے کے نمک سے تیار کی جاتی ہے۔ یہ ہلکے سبزی مائل زرد رنگ کی ہوتی ہے اور ہوا سے ۲½ گنا وزنی ہوتی ہے اس لئے اگر زمین کا نشیب اور ہوا کا رُخ دشمن کی جانب ہو تو اس گیس کا استعمال نہایت کامیاب رہتا ہے۔ یہ حلق کی لعابی جھلیوں اور پھیپھڑوں پر حملہ آور ہوتی ہے اور اگر ہوا میں ارتکاز بڑھ جائے تو ۱۰ منٹ میں مہلک ثابت ہوتی ہے۔

اس زہریلی گیس کے استعمال سے ایک ہفتہ قبل ایک جاسوس نے اطلاع دی کہ جرمن گیسی حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں مگر چونکہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا کسی نے توجہ نہیں کی۔ جرمنوں نے کلورین مائع کے بھرے ہوئے استوانوں کو اپنی اگلی خندقوں میں ایک ایک گز کے فاصلے سے لگادئے۔ اور گیس خارج کرنے والی نالیوں کو خندقوں کے باہر کردیا۔ جرمنی مورچوں نے غیر معمولی شدت کے ساتھ متحدین کی فوجوں پر ۲۲ اپریل کی صبح ہی آگ برسانا شروع کردی اور یکایک ۵ بجے شام کے قریب گولہ باری بند کردی۔ اس متضاد کیفیت کو متحدین کی فوجیں نہ سمجھ سکیں اور حیرت زدہ تھیں کہ یکایک سبزی مائل زرد رنگ کے دل بادل جرمنوں کی خندقوں کی طرف سے اُن کی جانب

حرکت کرتے دکھائی دے۔ مغرب کی طرف غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں نے اس منظر کو اور بھی دلفریب بنا دیا۔ فرانسیسی فوجیں اپنی خندقوں سے سر اٹھا اٹھا کر ان سنہرے بادلوں کو دیکھ رہی تھیں کہ یکایک ہوا کے ایک جھونکے نے ان کو اس گیس میں لپیٹ دیا۔ اب تک جس چیز کو وہ ابر رحمت یا غیبی مدد سمجھ رہے تھے آن کی آن میں ایک بلا ثابت ہوگئی اُن کا دم گھٹنے لگا وہ اپنا اپنا گلا دبائے خندقوں سے نکل بھاگے۔ بہت سے وہیں گر کر ہلاک ہو گئے۔ جرمنی فوجیں اسی اثنا میں آگے بڑھیں اور ان خندقوں پر قابض ہوگئیں۔ آفریقی سپاہ اِس حملے سے ایسی خائف ہوئی کہ دوسرے دن اُس نے محاذ پر آنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ ساحروں اور جادوگروں سے نہیں لڑ سکتی۔

کلورین گیس کے استعمال میں ایک بڑی دقت یہ تھی کہ اگر ہوا کا رُخ بدل کر دشمن کی جانب سے اپنی طرف ہو جائے تو خود ہی اس کا شکار ہو جائے۔ کیونکہ کلورین گیس دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کر سکتی۔ اس لئے اب کوشش یہ کی گئی کہ کوئی ایسی زہریلی مائع معلوم کی جائے جو آسانی سے معمولی حرارت پاکر بخارات میں تبدیل ہو جائے۔ اس قسم کی مائع بم میں بھر کر اپنے محاذ سے دور دشمنوں پر پھینکی جا سکتی ہے اس طرح ہوا کے بہاؤ کے رُخ کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

مثل مشہور ہے کہ جوئندہ یابندہ، اس مقصد کے لئے فاسجین نامی گیس جلد معلوم کر لی گئی۔ یہ معمولی تپش پر مائع میں تبدیل ہو جاتی ہے اور آسانی سے بم میں بھر کر پھینکی جا سکتی ہے۔ فاسجین کلورین اور کاربن مانو آکسائیڈ دو زہریلی گیسوں کے اتحاد سے پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح دو شیطانوں کے اتحاد سے جو تیسرا شیطان پیدا ہوتا ہے وہ اپنی شیطنت میں دونوں سے بڑھا ہوتا ہے اسی طرح یہ گیس اپنے زہریلے اثرات میں ہر دو سے بڑھی ہوتی ہے۔ ہوا کے دس ہزار حصّوں میں اس کا ایک حصّہ بھی مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اس گیس کا دوسرا جزو کاربن مانو آکسائیڈ ہے جو بند محدود ہوا میں کوئلہ وغیرہ جلانے سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ بند کمروں میں آگ وغیرہ جلا کر سونا خطرے سے

خالی نہیں۔ بعض اوقات اس قسم کے حادثات سننے میں آتے ہیں کہ بند جگہوں میں سونے والے اس گیس کا شکار ہو گئے۔ فاسجین گیس کلورین اور کاربن مانو آکسائیڈ کی مساوی مقداروں کو ملا کر اس میں سورج کی شعائیں گذارنے سے حاصل ہوتی ہے لیکن جنگی اغراض کی خاطر ان دونوں کے آمیزہ کو نامیاتی مسامدار گرم کوئلوں سے جو فولادی استوانوں میں بھرے ہوتے ہیں گزار کر تیار کرتے ہیں۔ یہ بے رنگ گیس ہوتی ہے۔ اس کا نقطہ جوش ۸ ہوتا ہے۔ اسے تین حصے کلورین کے ساتھ بم میں بھر کر کے استعمال کرتے ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم میں زہریلی گیسوں کی وجہ سے جتنی اموات واقع ہوئیں ان میں ۸۰ فیصد کی ذمہ دار یہی گیس تھی۔ اس گیس کا ابتدا میں بہت آہستہ آہستہ اثر ہوتا ہے یکایک مریض کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ اور قلب کی حرکت بند ہو جانے سے موت واقع ہوتی ہے۔

تیسری زہریلی گیس جو بڑے پیانہ پر گذشتہ جنگ میں استعمال ہوئی رائی گیس تھی۔ چنانچہ دس دن کی ایک گولہ باری میں جرمنوں نے ۷ ہزار من اس گیس کے استعمال کئے۔ یہ کلورین، الکوحل اور گندھک سے تیار کی جاتی ہے۔ ابتدا میں الکوحل کو ایتھلین گیس میں تبدیل کرتے ہیں۔ پھر کلورین کو پگھلی ہوئی گندھک سے گذار کر سلفر مانو کلورائیڈ بناتے ہیں۔ ایتھلین اور سلفر مانو کلورائیڈ کے تعامل سے رائی گیس حاصل ہوتی ہے۔ رائی گیس کو رائی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی بو رائی سے مشابہ ہوتی ہے۔ یہ ایک تیل نما مائع ہے جس کا نقطہ جوش ۲۱۷ ہے۔ بم کے پھوٹنے پر یہ ادھر اُدھر بکھر جاتی ہے۔ اور مٹی، کپڑا غرض کہ جس چیز پر پڑتی ہے جذب ہو جاتی ہے اور دھوپ کی تمازت سے آہستہ آہستہ بخارات میں تبدیل ہو کر اپنا کام کرتی رہتی ہے اس میں کوئی خاص بو بھی نہیں ہوتی اس لئے اس کی موجودگی کا پتہ نہیں چلتا اس گیس سے بدن پر چھالے پڑ جاتے ہیں، آنکھ، حلق، پھیپھڑے، متاثر ہوتے ہیں کھانسی آتی ہے جو بڑھ کر نمونیا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس گیس سے متاثر ہو کر انسان ۲ تا ۲۴ گھنٹوں میں اور کبھی کبھی ۴ دن میں مرتا ہے۔

رائی گیس کو متحدین کے خلاف جرمنوں نے پہلے پہل ۱۲ جولائی ۱۹۱۷ء میں استعمال کی تھی۔ اس اثناء میں ہر دو جانب سے مختلف گیسوں کا استعمال ایک دوسرے کے خلاف آزادی سے شروع ہو گیا۔ خیال ہے کہ کم از کم تیس مختلف گیسیں جنگ عظیم میں استعمال ہوئیں۔ ان گیسوں میں قے آور، اشک آور، چھینکیں پیدا کرنے والی، کھانسی لانے والی، وغیرہ گیسیں تھیں۔ فینائل کاربائیل امائین کلورائیڈ (Phenyl carbylamine chloride) سے بہادر سے بہادر سپاہی میدان جنگ میں بچہ کی طرح زار و قطار روتا ہے۔ ڈائی فینائل کلور و آرسین سے چھینکوں پہ چھینکیں آنا شروع ہوتی ہیں۔ کلورو پکرن قے آور گیس ہے۔ یہ کلوروفارم (بیہوش کرنے والی دوا) اور نائیٹرک ایسیڈ کے تعامل سے حاصل ہوتی ہے اس طرح اس کی ساخت میں نائیٹروجن پراکسائیڈ کے ساتھ کلوروفارم کا مخصوص اصلیہ شامل رہتا ہے۔ No یا نائیٹرک ایسیڈ اصلیہ اکثر بھک سے پھٹ جانے والی اشیاء کا جزو ہوتا ہے۔ کلوروپکرن ایک مائع ہے جو ۲۰ فیصد ٹن کلورائیڈ کے ساتھ ملا کر بم میں بھرتے تھے۔ ٹن کلورائیڈ ہوا میں نہایت کثیف دھواں پیدا کرتا ہے۔ کلوپکرن کے بخارات ٹن کلورائیڈ کے دھوئیں کے ساتھ ملکر گیسی نقاب سے گذر جاتے تھے۔ سپاہی کو کھانسی اور قے شروع ہو جاتی تھی اور وہ گیسی نقاب اتارنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ فوراً ہی فاسجین اور دیگر زہریلی گیسوں سے بھرے ہوئے بم سپاہی کو نقاب اتری ہوئی حالت میں آدبوچتے تھے۔ قے آور اور چھینکیں والی گیسوں کے استعمال کا اصل مقصد سپاہی کو بے نقاب کر کے ہلاک کرنا ہوتا تھا۔

گیسی نقابوں کے تھیلے میں ایسے مرکبات رکھ دئے جاتے تھے جو مختلف گیسوں کو یا تو جذب کر لیتے تھے یا اُن کی تحلیل کر دیتے تھے مثلاً سوڈا لائیم، سوڈیئم تھایوسلفیٹ کلورین اور فاسجین کو جذب کرنے کے لئے بلیچنگ پاوڈر، پوٹیشم پرمنیگنٹ رائی گیس اور کلوروپکرن کو تحلیل کرنے کے لئے کوئلہ خصوصاً ناریل کے چھلکوں سے تیار کیا ہوا کوئلہ اپنے حجم سے سینکڑوں گنا گیس جذب کر لیتا ہے نکل کے نمکیات، کاسٹک سوڈا اور دیگر مرکبات مختلف گیسوں کو جذب کرنے کے لئے نقاب کے ڈبوں میں کاربن کی جالیوں کے

ذریعہ تہ بہ تہ جما دئے جاتے ہیں۔ نقاب سر یا چہرے کے چاروں طرف ربر کے تسموں سے کس کر باندھ دی جاتی ہے۔ سانس منہ کے ذریعہ لی جاتی ہے اور ہوا نقاب کے تھیلے سے گذر کر ایک سونڈ نما نلی کے ذریعہ زہریلی گیسوں سے پاک ہو کر پھیپھڑوں میں داخل ہوتی ہے۔ گیسوں کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف قسم کی نقابیں ایجاد ہوئیں۔ رائی گیس چونکہ صرف سانس ہی کے ذریعہ حملہ آور نہیں ہوتی بلکہ اوپری جلد سے مس ہو کر خطرناک آبلے ڈال دیتی ہے اس کے لئے تمام جسم کو ڈھک لینے والی نقاب کی ضرورت ہے۔
یہ نقاب گو بہت ہلکی ہوتی ہے لیکن تھوڑی دیر پہننے کے بعد انسان پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے
ان گیسی نقابوں کے موجدین نے بنی نوع انسان پر بڑا احسان کیا۔ اور اس کو اس جدید گیسی جنگ کی تباہ کاریوں سے ایک بڑی حد تک محفوظ کر دیا۔ چنانچہ ایک امریکن آفیسر جنرل اے فرائیز کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکن افواج میں زہریلی گیسوں سے متاثر ہو کر ...۱ ہزار سپاہیوں میں صرف ۳۰ یا ۴۰ سپاہی ہلاک ہوئے لیکن دور سے پھٹنے والے بموں کے ذریعہ مجروح ہو کر فوت ہونے والے سپاہیوں کی تعداد فی ہزار ۲۰۰ تا ۲۵۰ تھی متوفین کے علاوہ ہاتھ، پیر، آنکھوں سے محروم ہونے والے سپاہیوں کی تعداد بہت بلند زیادہ تھی اس کے برعکس زہریلی گیسوں سے متاثر ہو کر اس قسم کے ناکارہ ہو جانے والے سپاہیوں کی تعداد تقریباً نفی کے مساوی تھی۔ اب تک موجودہ جنگ میں زہریلی گیس کے استعمال نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ ۱۹۲۵ء کے معاہدہ جینوا کے مطابق زہریلی گیسوں کا استعمال قواعد جنگ کے خلاف ہے لیکن جس قوم پر جنگ کا بھوت سوار ہو اس کے لئے اصول و قاعدہ بے معنی ہے۔ چنانچہ اٹلی نے اہل حبش کے خلاف زہریلی گیس استعمال کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کی اس کے قبل اہل ریف کے خلاف فرانسیسی بھی بے دریغ زہریلی گیسیں استعمال کر چکے تھے اس مرتبہ بھی وقتاً فوقتاً اس قسم کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ جرمنی بڑے پیمانے پر گیسی جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور پولینڈ کے گیس بنانے کے قدیم کارخانے دن رات کام کر رہے ہیں۔ خیال ہے کہ اگر اس مرتبہ گیسی جنگ ہو گی تو نہایت تباہ کن ثابت

ہوگی جو بالکل جدید قسم کی زہریلی گیسوں اور بیماری پھیلانے والے جراثیم پر مشتمل ہوگی

مدافعتی طریقے کسی مقام پر گولہ باری کے دوراں میں مختلف اقسام کے گولے یا بم پھینکے جاتے ہیں۔ مثلاً آگ لگانے والے بم، دھماکے کے ساتھ زور سے پھٹنے والے بم، شور و شغب مچانے والے بم اور زہریلا مادہ چھڑکنے والے بم وغیرہ ایسی صورت میں مدافعت کا کام اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً گیسی حملے کے دوران میں اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند رکھی جائیں تاکہ گیس آزادی سے اندر داخل نہ ہو سکے۔ لیکن دھماکے کے ساتھ زور سے پھٹنے والے بم کے مقابلے میں دروازے یا کھڑکیاں خصوصاً جب ان میں شیشے لگے ہوں تو کھلا ہی رکھنا مفید ہے۔ ایسی صورت میں مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر یکے بعد دیگرے ایک سے زیادہ مدافعتی طریقے اور اصول اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ جاپان سے لڑائی کا اعلان ہونے کے بعد ہندوستان کے مشرقی صوبوں میں ہوائی حملہ کا خطرہ نہایت قریب اور شدید ہو گیا ہے۔ اور بنگال، آسام، مدراس میں ہوائی حملوں سے مدافعت کی عملی تدابیر شروع کر دی گئی ہیں واقعات کی اس رفتار کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر شخص اس قسم کے خطرے اور اُس سے تحفظ کی عملی تدابیر سے واقف ہو جائے تاکہ ضرورت کے وقت اپنی اور اپنے ساتھیوں کی حفاظت کر سکے۔

(۱) ہوائی حملے کے دوران میں گھروں سے نکلکر تماشہ دیکھنے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑے دوڑے پھرنا نہایت خطرناک ہے۔ رنگون میں حالیہ بمباری کے دوران میں جو زبردست جانی نقصان ہوا اُس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ تماشہ بین قابو سے باہر تھے۔ رنگون کی بمباری کے متعلق جو اعلان شائع ہوا ہے اُسی میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے دوسری جگھوں کے لوگ یہاں کے واقعات سے سبق حاصل کریں اور اس قسم کی حماقت سے باز رہیں۔ اس طرح وہ دشمن کی مشین گن سے نکلی ہوئی گولیوں کا راست نشانہ بنتے ہیں۔ نیز اپنی ہی توپوں سے نکلے ہوئے گولوں سے مرتے ہیں اور اگر زہریلی گیس پھینکنے والے گولے استعمال کئے گئے تو گیس کا اولین حملہ انہیں پر ہوتا ہے۔

(۲) اگر ہوائی بمباری کے دوران میں گیسی بم استعمال کئے جائیں اور فضا میں گیس پھیل گئی ہو تو اُس سے تحفظ کا موثر طریقہ تو یہی ہے کہ گیسی نقاب استعمال کئے جائیں چنانچہ امریکہ نے جاپان سے اعلان جنگ کے بعد ہی ایک کروڑ ۵ لاکھ نقابیں صرف ساحل پر رہنے والے لوگوں میں تقسیم کی ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ہر کس و ناکس کے لئے اس قسم کا انتظام محال ہے۔ تاہم اس قسم کے حملوں کے دوران میں ذیل کی ہدایات پر عمل کرنا مفید ہے:۔

(۱) جس جگہ پر گولہ پھٹا ہوا اور زہریلا مادّہ اِدھر اُدھر بکھر کر آہستہ آہستہ بخارات میں تبدیل ہو رہا ہو اگر اس جگہ کو ریت اور بلیچنگ پاؤڈر سے ڈھک دیا جائے تو مزید گیس کا اخراج بند ہو جاتا ہے اگر یہ مرکبات نہ مل سکیں تو ریت، چونا اور گیلی مٹی سے اُس مادّہ کو دفن کر دینا چاہئے۔ واضح رہے کہ بغیر نقاب پہنے ہوئے یہ کام نہایت خطرناک ہے۔ دوسرے مقامات پر یہ کام ٹرینڈ رضا کاروں کے تفویض رہتا ہے۔

(۲) اگر کھلے میدان یا سڑک پر بم گرا ہے اور وہ پھٹا چاہتا ہے تو اُس سے ڈر کر بھاگنا سخت غلطی ہے۔ وہیں پر لیٹ جانا چاہئے۔ بم کے ٹکڑے پھٹ کر ذرا بلند ہو کر اُڑتے ہیں۔ جب بم کے ٹکڑے اڑنا بند ہو جائیں تو اُٹھ کر حتی الامکان دھوئیں اور گیس کی زد سے بچ کر ہوا کے رُخ کے خلاف بھاگنا چاہئے ناک اور منہ کو رومال سے ڈھک لیں۔ اگر رومال پانی سے تر ہو تو بہتر ہے اور جلد کسی قریب کی گلی یا کوچہ میں داخل ہو جانا چاہئے۔

(۳) اگر جسم یا کپڑوں پر کوئی کیمیائی سیال پڑ گیا ہو تو کپڑوں کو جلد سے جلد اُتار ڈالنا چاہئے۔ اُس کو ہاتھ سے ہرگز نہ چھونا چاہئے۔ اگر پوٹیشم پرمنگنٹ کے محلول یا چونے کے پانی سے جسم کو دھو ڈالیں تو مناسب ہے۔

(۴) اگر سر پر دشمن کا جہاز منڈلا رہا ہو تو ہکا بکا اُس کو دیکھنا نہ چاہئے بلکہ قریب ہی کسی پتھر، درخت، جھاڑی، خندق یا نالے میں لیٹ جانا چاہئے۔ مدراس میں اس مقصد کے لئے جا بجا خندقیں کھودنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

(۵) ہوائی حملے کے دوران میں گھر سے باہر نہ جانا چاہئے۔ گھر میں اگر کوئی تہ خانہ ہو تو سب سے محفوظ جگہ وہی ہے۔ بشرطیکہ اس امر کا احتمال نہ ہو کہ اوپر کی چھت گرنے سے تہ خانہ بیٹھ جائے گا۔ اگر تہ خانہ نہ ہو تو گھر کی بالاترین منزل پر جو درمیانی کمرہ ہو وہ بہتر ہے اکثر زہریلی گیس ہوا سے بھاری ہوتی ہیں لہٰذا نیچے کی فضا اوپر کی فضا کے مقابلہ میں گیس سے زیادہ مکدر ہوتی ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی میں وہاں کے لوگوں کا تجربہ یہ ہے کہ ہوائی بمباری میں خصوصاً جب گیس استعمال کی گئی ہو اوپر کی منزل سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ حقیقت میں ہوائی بمباری کے دوران میں سب سے محفوظ وہ تہ خانہ جو کسی موٹی سیمنٹ کے چھت کے نیچے بنا ہو۔ یہ چھت سیمنٹ کے ستونوں پر قائم ہو اور چھت پر ۲ فٹ گہری باریک ریت پڑی ہو۔

(۶) جس کمرے میں آپ نے پناہ لی ہو اگر اس کمرے میں دروازے اور کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوں تو ان دروازوں اور کھڑکیوں کو اس وقت تک کھلا رکھیئے جب تک گولوں کے پھٹنے کی آوازیں آرہی ہو۔ لیکن ان دروازوں اور کھڑکیوں کے پردوں کو کھینچ دیجئے تاکہ گیس آزادی سے کمرے میں داخل نہ ہوں۔ کلورین گیس کو جذب کرنے کے لئے سوڈیم تھایوسلفیٹ۔ فاسجین کے لئے الکوحل اور بنزین کا آمیزہ، رائی گیس کے لئے بلیچنگ پاؤڈر، اگر احتیاطاً ان مرکبات کے چار چار آؤنس خرید کر رکھ لئے جائیں اور وقت ضرورت ان کے محلول سے پردوں کو تر کر دیا جائے تو نہایت مفید ہے اگر یہ مرکبات نہ ہوں تو معمولی پانی میں چونا ملا کر گیسوں سے مکدر فضا میں جتنا چھڑک سکئے چھڑکتے رہیئے۔ واضح رہے کہ بند شیشہ کی کھڑکیاں بمباری کے دوران میں نہایت خطرناک ہیں چنانچہ انگلستان کے ایک مقام پر بمباری کے دوران میں صرف شیشوں کی وجہ سے ۱۱۷ آدمی زخمی اور چار ہلاک ہوئے۔

(۷) بچوں کو چاہیئے کہ اگر اسکول جاتے وقت ہوائی حملہ ہو جائے تو قریب کی کسی عمارت میں پناہ لیں۔ اگر تعلیمی اوقات میں بمباری ہو تو خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگے بھاگے پھرنے سے کوئی فائدہ نہیں، اس قسم کے حملوں سے پناہ لینے کے لئے

اس کالج کی عمارت کی سب سے نچلی منزل کے ایسے مقامات نہایت موزون ہیں۔

(۸) جب بالکل سکون ہو جائے تو اسکول یا گھر کے تمام افراد ایک دم سے باہر نہ نکلیں۔ صرف ایک یا دو شخص باہر آئیں۔ اگر کوئی حصہ جل رہا ہو تو اُس کے بجھانے کا انتظام کریں۔ اگر کسی جگہ سے گیس خارج ہو رہی ہو تو اُسے کیمیائی مرکبات سے دفن کرا دیں۔ اگر نیچے کی فضا گیس سے مکدر ہو رہی ہو تو بالائی منزل میں چلے جائیں۔

(۹) اگر حملہ رات کو ہو تو گھروں کی روشنی بند کر دیں۔ مکان کے سب سے محفوظ کمرے میں چلے جائیں جن مقامات پر بمباری کا خطرہ بڑھ گیا ہے وہاں پبلک کو اس قسم کی ہدایات بھی دی گئی ہیں کہ وہ اپنے سونے کے کمروں میں پلنگوں کے نیچے حوض سے بنا لیں اور بمباری کے دوران میں انھیں حوضوں میں جا چھپیں۔ کھانے پینے یا فرنیچر کے قسم کی کوئی چیز مثلاً کرسی، میز، پلنگ جو باہر صحن میں ہو اور اس پر کوئی سیال مادہ چھڑکا ہوا ملے یا کچھ شک ہو تو اس کو ہرگز استعمال نہ کریں چنانچہ گذشتہ جنگ عظیم میں جنرل جانسن کے ماتحت ۷، ویں ڈویژن رائی گیس سے متاثر ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس فوج نے رات کو لیٹنے کے لئے قریب کے ایک گاؤں سے پلنگ منگا کر استعمال کئے۔ اس گاؤں پر ایک دن قبل بمباری ہو چکی تھی۔

(۱۰) اگر کسی مقام پر ہوائی حملہ کا خطرہ بڑھ جائے تو حتی الامکان ہوائی اسٹیشن، ریلوے اسٹیشن، اسلحات بنانے کے کارخانے، فوجی بیرکس، برقی قوت گاہ، خزانہ آب رسانی ایسی جگھوں سے دور رہے۔ دشمن ذخیرہ آب میں بھی زہر ملا دینے کی کوشش کرتا ہے اُن دنوں اگر باؤلی کا پانی استعمال کیا جائے تو بہتر ہے۔ اپنی خانگی باؤلیوں اور کوؤں کو بہ احتیاط بند رکھا جائے۔

(۱۱) اگر کسی جگہ کی ہوا گیس سے زیادہ مکدر ہو رہی ہو اور اُس جگہ سے نکلنا بھی ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں پھوار کی صورت میں پانی اچھالنے سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ بعض گیسوں کے مقابلہ میں اگر جا بجا آگ سلگا کر دھواں کر دیا جائے تو مفید نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

(۱۲) سب سے آخر میں لیکن نہایت ضروری ایک دوسری قسم کی زہریلی گیسوں سے خاص طور پر احتیاط لازم ہے۔ یہ زہریلی گیسیں بے بنیاد افواہیں ہوتی ہیں اُن پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے جو خواہ مخواہ دماغ کو پریشان کرتی ہیں۔

صدر محترم و معزز حاضرین و خواتین میں آپ تمام حضرات کا تہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے اس ناچیز کی تقریر سننے کی زحمت گوارا فرمائی۔ میری دعا ہے کہ خداوند اپنی نوع انسان کو موجودہ تباہی سے بچا اور جو دنیا میں کشت و خون اور بدامنی کا طوفان بپا ہے اُس کو امن و امان کی نسیم خوشگوار میں تبدیل کر دے۔

بچوں کی ابتدائی تربیت گاہیں

(از مولوی محمد اعظم خاں صاحب ایم۔ اے)

نپولین بوناپارٹ کے متعلق ایک قصہ یہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ ایک عورت اس کے دربار میں حاضر ہوئی۔ اور عرض کیا کہ میرا ایک بچہ ہے جس کو میں نے بہت پیار سے پالا ہے۔ اور چاہتی ہوں کہ آگے چل کر وہ آپ کی طرح دُنیا کا ایک زبردست شہنشاہ اور نامور انسان ہو اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ اس کی تربیت اپنی ذاتی نگرانی میں فرمائیں۔ نپولین اس عورت کی اُولوالعزمی سے خوش ہوا۔ اور پوچھا کہ وہ بچہ کہاں ہے۔ جب اُس عورت نے اس بچہ کو پیش کیا تو نپولین نے دیکھا کہ اس کی عمر پانچ چھ برس کی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ بہت خفا ہوا۔ اور اس عورت سے کہا کہ تم نے اس کی اصلی تربیت کا سارا زمانہ تو گنوا ہی دیا۔ اور اب ایسے وقت میرے پاس لائی ہو جبکہ میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ بس جاؤ اور اس کو اپنے ساتھ لیتی جاؤ"۔

ممکن ہے کہ بعض اصحاب نپولین کی اس رائے کو مبالغہ اور انتہا پسندی کی ایک مثال سمجھیں لیکن جو حضرات موجودہ ماہرین تعلیم اور نفسیات اطفال کے محققین کے خیالات سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ انسانی سیرت و کردار کی تعمیر کے متعلق اس فاتح اعظم نے جو کچھ کہا وہ لفظ بلفظ صحیح تھا۔ اور آج اس حقیقت کو ساری مہذب دنیا نے تسلیم کر لیا ہے کہ بچے کی عمر کے ابتدائی پانچ سال تعلیمی نقطہ نظر سے اس کی زندگی کا اہم ترین زمانہ ہیں۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ انسان اولاد سے زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں رکھتا۔ پس اگر کسی قوم کی تہذیب کا معیار ان کوششوں کو قرار دیا جائے جو وہ اپنی آئندہ نسلوں کی فلاح و بہبود کے لئے اختیار کرتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ چنانچہ آج مغربی ممالک میں بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے لئے ہر قوم دوسروں سے بہتر و برتر انتظامات کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ یہ انتظامات کیا ہیں اس پر ہم آگے چل کر غور کریں گے۔ فی الحال آیئے ذرا ہم اپنے ملک پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ہم اپنی سب سے قیمتی دولت یعنی اولاد کی اولیں تعلیم و تربیت کے لئے کیا کر رہے ہیں۔

عام طور پر ہندوستان میں بچے چھ سال کی عمر میں مدرسہ میں شریک کئے جاتے ہیں۔ اس طرح اپنی عمر کے ابتدائی پانچ سال (جن کے متعلق ہم نے ابھی بیان کیا کہ ماہرین تعلیم اسے اخلاق و سیرت کی تعمیر کے لئے سب سے قیمتی زمانہ قرار دیتے ہیں) وہ گھروں میں گذارتے ہیں۔ بلاشبہ اگر گھر کا ماحول اچھا ہو اور ماں باپ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ تربیت اولاد کا خیال اور وسائل رکھتے ہوں تو بچے کے لئے آغوش مادر سے بہتر کوئی تربیت گاہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہندوستان اپنی جہالت، افلاس اور امراض کی کثرت کے باعث دنیا کے اور ملکوں میں جو ممتاز درجہ رکھتا ہے وہ محتاج اظہار نہیں ادنیٰ طبقہ کو چھوڑئے۔ متوسط اور اعلیٰ طبقوں کی بھی یہ حالت ہے کہ پہلے تو کسی تربیت اولاد جیسے اہم مسئلہ کی اہمیت کا احساس ہی نہیں جس کو احساس ہے اُسے اپنے کسب معاش کے جھگڑوں سے فرصت نہیں۔ جسے فرصت ہے اُسے صحیح طریقہ تعلیم اور اُصول تربیت کا

علم نہیں۔ اور جسے علم ہے اس کے پاس پیسہ نہیں کہ خاطر خواہ اس کا انتظام کر سکے۔ ملک کی عام صفائی اور حفظ صحت کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ غرض عام طور پر ہمارے بچے ایسے ماحول میں ابتدائی نشو و نما پاتے ہیں جو حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے نہایت قابل اعتراض ہوتا ہے۔ گنجان آبادی تنگ و تاریک مکانات متعفن گلی کوچے جہاں نہ کوئی پبلک تفریح گاہ نہ کوئی پارک کہ بچے اس میں تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی جمع ہو کر تازہ ہوا اور خوشنما منظر سے اپنی جسمانی نشو و نما کا سامان بہم پہنچائیں۔ نہ وہاں تعلیم یافتہ اور اصول نفسیات اطفال سے واقف سرپرست یا مدرس ہوتے ہیں جو صحیح اُصول تربیت کو کام میں لائیں۔ بچوں کے ساتھ یا تو بے جا لاڈ و پیار ہوتا ہے جو عمر بھر کے لئے انہیں جسمانی اور ذھنی اعتبار سے ناکارہ کر دیتا ہے۔ یا اس کے برخلاف بے جا سختی اور نگرانی ہوتی ہے۔ جس کے اثرات پہلی حالت سے بھی بدتر ہوتے ہیں بچوں کے مشاغل کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی نظم و ترتیب کے دن بھر گلی کوچوں (یا اگر مکان میں گنجائش ہوئی تو اس کی چار دیواری میں) مارے مارے پھرتے ہیں۔ اگر ماں باپ صاحب استطاعت ہوئے تو انھوں نے انائیں اور آیائیں رکھ دیں جو چار چار پانچ پانچ برس کے بچوں کو گودوں میں لادے لادے پھرتی ہیں اور انھیں کوئی کام خود کرنے کا موقع نہیں دیتیں اس طرح ابتدا ہی سے وہ اپاہج اور نکمے ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی معمولی ضرورتوں کے لئے بھی دوسروں پر تکیہ کرنے لگتے ہیں۔ غرض شاید ہی دنیا کے کسی متمدن ملک کے نونہالوں کو ابتدائے عمر میں اس قدر ناموزون ماحول نصیب ہوتا ہو جو ہماری ان ننھی نسلوں کو میسر آتا ہے۔ اس کے جو اثرات جسمانی، ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے ہمارے پیش نظر ہیں وہ محتاج اظہار نہیں افسوس کہ ہم اس اہم ترین قومی فرض کی حقیقت و اہمیت کا کوئی احساس نہیں رکھتے اور اپنی موجودہ حالت پر بالکل قانع ہیں۔ اس کے برخلاف مغربی ممالک کو لیجئے جو ترقی کی دوڑ میں ہم سے صدیوں آگے ہونے کے باوجود اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کے انتظامات سے مطمئن نہیں ہوتے اور اس میں روزافزوں اصلاح و

اضافہ کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں۔

چند سال قبل لندن کے ایک ماہر تعلیم نے اس مسئلہ پر اپنے ہم وطنوں کو جن الفاظ میں توجہ دلائی تھی اس کا ایک مختصر سا اقتباس درج ذیل ہے وہ فرماتے ہیں کہ ـــــ

"ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر ہماری قوم مالی مشکلات کی بنا پر اپنی آئندہ نسلوں کی خاطر غذا تعلیم سے جی چرائے گی تو اس کا انجام نہایت خطرناک ہوگا۔ تمام قومی ذمہ داریوں میں تعلیم کی ذمہ داری بلاشبہ سب سے اہم ہے۔ چھوٹے بچوں کی شرح اموات دیکھ کر تو ہم کو سخت افسوس ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ اس سے کم افسوس ناک بات ہے کہ جو بچے لقمہ اجل ہونے سے بچ رہیں وہ مناسب تعلیم و تربیت نہ ہونے کے باعث عمر بھر کے لئے جسمانی اور ذہنی خرابیوں میں مبتلا رہیں۔

"پانچ برس کی عمر تک بچے کی ذہنی تربیت اس کی آئندہ ترقی کے لئے بے انتہا اہمیت رکھتی ہے۔ بہت کم والدین اس کا احساس رکھتے ہیں کہ بچے کی بڑھتی ہوئی دماغی قوتیں بڑی حد تک بزرگوں کی امداد و اعانت کی محتاج ہوتی ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کی نشو و نما کا یہ زمانہ نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔ اور یہ کہ اُس کی خوابیدہ قوتیں آگے چل کر خود بخود بیدار ہو جائیں گی۔ یہ خیال سخت مضرت رساں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی ذہنی قابلیتیں باقاعدہ مشق و مہارت سے جلا پاتی ہیں اور اس کے لئے بچوں کی ابتدائی تربیت گاہوں کا قیام نہایت ضروری ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ عہد حاضر میں جبکہ تقسیم کار کی ضرورت ہر شعبہ زندگی میں ناگزیر ہو گئی ہے ہر شخص سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی اولاد کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے لئے خود معلومات، مواقع اور وسائل فراہم کر سکے گا۔ اس لئے مغرب کے ماہران تعلیم نے ایسے مدارس کی بنیاد ڈالی جو اس اہم ضرورت کو پورا کر سکیں۔ چنانچہ مغربی ممالک میں بچوں کی اولین تربیت کے لئے متعدد ادارے مختلف ناموں اور کچھ باہمی تفاوت کے ساتھ وجود میں آئے مثلاً۔ Infant Schools—Day Nurseries—

Nursery schools Kindergarten

وغیرہ ۔۔۔ گو ان میں بچوں کی عمر اور طریق کار کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے لیکن مقصد ان سب کا یہی ہے کہ بچے کی عمر کے ابتدائی زمانہ میں اس کی جسمانی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لئے وہ تمام ذرائع کام میں لائے جائیں اور وہ تمام سہولتیں بہم پہنچائی جائیں جو انسانی عقل و تدبیر کرسکتی ہے۔

ان مدارس کی خصوصیات اور تفصیلات سے یہاں بحث نہیں کیجاسکتی کیونکہ ان میں سے ہر مدرسہ بجائے خود ایک مستقل عنوان چاہتا ہے لیکن مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہاں بچے بہترین مکانات میں رکھے جاتے ہیں، انھیں اُصول صحت کے مُطابق غذا دی جاتی ہے۔ اور ایسے کھیل کود اور دیگر مشاغل میں ان کا وقت صرف ہوتا ہے جن میں انھیں اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کی ممکنہ آزادی دی جاتی ہے۔ اور ان کی رہنمائی و نگرانی ایسے ماہرین تعلیم کے تفویض ہوتی ہے جو اس کام کے لئے بطور خاص موزون اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں ۔۔۔ وہاں ان کا باقاعدہ طبی معائنہ ہوتا ہے اور اس بات کی ممکنہ کوشش کی جاتی ہے کہ نہ صرف کوئی متعدی مرض پھیلنے نہ پائے بلکہ جہاں کہیں کسی بچے میں کوئی جسمانی خرابی پیدا ہو اس کا فوراً معقول علاج کیا جائے۔ اس طرح بچے ایسی سینکڑوں بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ جو گھروں میں بروقت توجہ نہ ہونے کی وجہ سے ہلاکت کا باعث ہوجایا کرتی ہیں یا آئندہ کے لئے کمزور، بدصورت و ناکارہ کردیتی ہیں۔ اس طرح ان کی اخلاقی تربیت پر بھی وہاں خاص توجہ کی جاتی ہے۔ اخلاقی تربیت سے وہ محدود مفہوم مراد نہیں جو عام طور پر ہمارے پاس لیا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے سیرت سازی اور عمدہ عادات و اطوار کی تربیت مراد ہے۔ مثلاً ابتدائی تربیت گاہوں میں جس طرح اس بات کی خاص احتیاط کی جاتی ہے کہ بچے کی جائز اور ممکنہ آزادی میں خلل نہ ڈالا جائے اس طرح اس کا بھی بطور خاص لحاظ رکھا جاتا ہے کہ انھیں خود اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو وہ اپنی تمام ضروریات خود ہی پوری کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں صفائی کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ جس میں جسم، لباس اور

گرد و پیش کی اشیاء کی صفائی شامل ہے۔ باہمی میل و جول اور ہمدردی کے عملی سبقوں سے انھیں سماجی تربیت دی جاتی ہے اور مختلف پودوں اور جانوروں (Pets) کے ذریعہ ان میں مظاہر قدرت سے دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔

اسی طرح ابتدائی تربیت گاہوں میں بچہ کی ذہنی تربیت پر بھی خاص توجہ کی جاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے لکھنا پڑھنا اور حساب وکتاب شروع کرا دیا جاتا ہے۔ اور اس کے ننھے سے دماغ میں خشک معلومات کا ناقابل برداشت انبار ٹھونسا جاتا ہے۔ بلکہ طرح طرح کے خوشنما کھلونوں پودوں جانوروں راگوں اور تصویروں کے ذریعہ ان کے ذہنی قوی اور جمالیاتی ذوق کی تربیت کی جاتی ہے۔ وہاں بچوں کا نظام الاوقات اور نصاب تعلیم اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے فطری رجحانات کے عین مطابق ہو۔ اس طرح بچے ہر وقت کسی نہ کسی مفید و دلچسپ مشغلہ میں مصروف رہتے ہیں اور کھیل ہی کھیل میں بہت سی ضروری معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔

یہ مشاغل چونکہ بچوں کے لئے صد درجہ دلچسپ اور خوش گوار ہوتے ہیں اس لئے وہاں ان پر کسی طرح کی سختی کرنے یا بیجا لاڈ و پیار کر کے انھیں بہلانے پھسلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بلکہ وہ بالکل قدرتی طریقہ پر طرح طرح کے کھیلوں میں نہایت شوق وانہماک کے ساتھ حصہ لیتے رہتے ہیں اور غیر محسوس طور پر ہر لمحہ ان کے حواس کی تربیت، سیرت کی تعمیر، اور اظہاری قوتوں کی نشو و نما ہوتی رہتی ہے۔ کہیں تو بچے چھوٹے چھوٹے مزیدار قصوں کہانیوں کے کہنے اور سننے میں مصروف ہوتے ہیں تو کہیں گانے اور ناچنے میں کوئی خوشنما پالتو جانوروں کے دانے چارہ کی فکر میں لگا رہتا ہے تو کوئی اپنے ننھے سے باغیچہ کی آبیاری کرتا ہے۔ کبھی وہ پیاری صورتیں نقلوں اور تمثیلوں کے ذریعہ اپنے سادہ جذبات و خیالات ادا کرتی نظر آتی ہیں تو کبھی تخیلی کھیلوں اور مشغلوں کے ذریعہ عالم خیال کی سیر کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی ننھا سورما چھوٹی سی تلوار لے کر جنگ کو چلا ہے تو کوئی موہنی صورت چھوٹی سی گڑیا کو گود میں تھپک تھپک کر سلا رہی ہے اس طرح یہ بھولی بھالی معصوم جانیں عالم خیال میں اپنے آئندہ مشاغل حیات کی

تیاری کر رہی ہیں۔ اور ان کی اُستانی کھڑی اس دلفریب منظر کا لطف اُٹھا رہی ہے۔ غرض اس طرح وہاں بچوں کی ذہنی تربیت کی وہ بنیاد ڈالی جاتی ہے جس پر آئندہ ایک عظیم الشان عمارت قائم ہو سکے۔

ہندوستان کے لئے ایسے اداروں کی جس قدر شدید ضرورت ہے وہ محتاج بیان نہیں جس ملک کی اکثر و بیشتر عورتیں زیور علم سے محروم ہوں، جہاں کے مرد سینکڑوں میں ایک بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ ہوں جہاں کے شہروں اور دیہات کی غلاظت ضرب المثل ہو اور جہاں افلاس کی وجہ سے ماں باپ کو اولاد کی تربیت کی نہ صلاحیت ہو اور نہ استطاعت، وہاں ابتدائی تربیت گاہوں کی ضرورت و اہمیت کا کیا پوچھنا۔

فی الحال ہماری ریاست میں اس قسم کا ایک ادارہ قائم ہے۔ بلدہ حیدرآباد کا ماڈل پرائمری اسکول اپنی نوعیت کا واحد سرکاری ادارہ ہے اور گو اس کا معیار اور ماحول نہایت بلند ہے پھر بھی وہ ملک کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس اہم ترین فرض کی ادائی میں پبلک بھی حکومت کا ہاتھ بٹائے۔ اور ملک کے صاحب ثروت اور ارباب ہمت اپنی مقدور بھر اس کام میں حصہ لیں اور جا بجا ابتدائی تربیت گاہیں قائم کر کے ملک کی آئندہ نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام کریں۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ملک کے اکثر نونہالوں کے ذہنی قوا، اپنی اصلی بہار دکھانے سے قبل ہی گھروں کی نا مساعد فضا میں کھلا کھلا کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے نرم و نازک دل و دماغ سرپرستوں کی ناواقفیت، عدم صلاحیت یا عدم توجہی کی باد صرصر سے سوکھ کر غارت ہو جاتے ہیں اور ان کی وہ پوشیدہ قوتیں جو آگے چل کر ایک عالم کو تہ و بالا کر سکتی تھیں گھروں کی چار دیواری میں ٹھٹر کر رہ جاتی ہیں۔

رات دن ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں تو بچے اندھی محبت کا شکار ہو رہے ہیں۔

کہیں بے جا نازبرداریاں انھیں ابتدائے عمر سے اس قدر نکما ضدی، خود غرض اور راحت طلب بنا رہی ہیں کہ آگے چل کر وہ اس دنیا میں رہنے اور کشمکش حیات کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ کہیں اُن پر ایسی بے جا سختیاں ہوتی ہیں کہ ان کے جوش و امنگوں اور طفلانہ مسرتوں ہی کا خون ہو جاتا ہے۔ کہیں بے پروائی اور عدم صلاحیت کے سبب ان کی عمر کا یہ بہترین زمانہ برباد ہو رہا ہے تو کہیں جہالت اور عدم استطاعت کے سبب۔ غرض اس افسوس ناک صورت حال کی اصلاح کی اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ ملک کے گوشے گوشے میں دیہات کے ہر حصے اور شہروں کے ہر محلہ میں بچوں کی ابتدائی تربیت گاہیں قائم کی جائیں جو صاف ستھرے مکانات، دلکشا باغات، جدید آلات تعلیمی اور تربیت یافتہ اسٹاف سے بخوبی مزین ہوں اور وہاں قوم کے یہ انمول موتی اپنی زندگی کے ابتدائی چند سال میں ایسی آب و جلا پائیں کہ آگے چل کر ایک عالم ان کی ضو فشانی سے منور ہو جائے۔

رپورٹ ذیلی کمیٹی

(۱) جدید تعلیم

جدید تعلیم کی سب سے نمایاں خصوصیت وہ رجحان ہے جو بچہ کی خود کارانہ اور تخلیقی فطرت کو اُجاگر کرنے کے سلسلے میں پیدا ہوا۔ اس کے ذریعہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ جدید تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ فرد کی مفید مطلب اور تعمیری توانائیوں کو محفوظ کرکے ان کی نشوونما کرے تاکہ وہ ایک خود مختار اور ذمہ دار شخصیت بن جائے۔

اس خصوص میں ہندوستان بہت پیچھے رہا ہے اور اب تک بھی اس پر مدرسیتی روایات کا اثر غالب ہے جن میں بچے کی فاعلانہ اور تخلیقی فطرت کو سرے سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اگر تعلیم کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ میکانی طور پر چند جامد معلومات بچے کے دماغ میں ٹھونس دی جائیں، اور اگر تعلیم کا منشا بچے کے تخلیقی میلانات میں تہیج پیدا کرنا اور تعمیر عالم میں اسے ایک متحرک اکائی کے طور پر حصہ لینے کے لئے تیار کرنا ہے تو پھر ہمیں اپنے تعلیمی نظام میں بڑے شدومد کے ساتھ تنظیم کرنی ہوگی۔

اس نئی تنظیم میں ہمیں بچہ کی فاعلانہ اور تعمیر فطرت کا احترام کرنا ہوگا اور اس کے آزادانہ اور مسرت آمیز اظہار کے لئے وسائل تلاش کرنا پڑیں گے اور ہاتھ و دماغ، اصول و عمل اور علم و فعلیت میں ایک نتیجہ خیز، مضبوط اور لقریبی رشتہ جوڑنا ہوگا۔ اس کے لئے چاہئے کہ ہم اپنے نصاب اور مدرسہ کے سارے کام کو مسرت آگیں فعلیتوں اور مصروفیتوں سے مالامال کریں اور موادِ مضمون کو کتاب زندگی سے فراہم کریں۔ جدید تعلیم، کام اور فرصت میں ایک زندہ دلچسپی پیدا کرنے کا موجب ہوگی، وہ ایک ایسی تعلیم ہوگی جو صنعتی نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے علاوہ، فرد کو ایک ایسے کام کے لئے تیار

کرے گی جو اس کے فطری لگاؤ سے قریب تر ہو۔ اس طرح سے جدید تعلیم کا نصب العین خود کار، شخصی اور تخلیقی فعلیت ہوگا۔

جدید تعلیم کا مطمح نظر یہ ہے کہ بچہ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرے، خود اپنی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ چلے اور اپنے اس ماحول کا ساتھ دے جو مختلف النوع فعلیتوں سے مالا مال ہے۔

بچے ایک مرئی اور محسوس حقیقت میں بستے ہیں۔ ان کی فعلیت اس حقیقت کے تابع ہے اور ان کا تجربہ اس میں پرورش پاتا ہے۔ علی العموم بچہ مقرون چیزوں کو اچھی طرح حافظہ میں محفوظ رکھتا ہے اور مجرد خیالات سے نبٹنے کی صلاحیت اس میں کم ہوتی ہے لیکن ہم عام طور پر دیکھتے ہیں کہ آج کل مدارس میں بہت ہی شدومد کے ساتھ نوخیز دماغوں میں ایسے لفظی استدلال اور مجرد خیالات ٹھونسنے کی کوشش کی جاتی ہے جو ان کی سرحد ادراک سے پرے ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نصاب کے اس بے پناہ مواد کو رٹتے رٹتے جسے انھیں امتحانات میں اگلنا پڑتا ہے، نو عمر بچوں کا ذہنی ارتقا رُک جاتا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ بچہ ایک مقرون دنیا میں رہتا ہے اسے موقعہ ملنا چاہئے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کام کرے خصوصاً ۱۲ تا سال کی عمر والے بچوں کے لئے دستی کام، تعلیم کی اساس ہونی چاہئے۔ اس سے جہاں اس کی آبائی ضروریات پوری ہوتی ہیں، نفسیاتی ضروریات بھی پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہیں اور رفتہ رفتہ اس کا نفس مقرون سے مجرد کی طرف مائل ہوتا جاتا ہے اور اس میں ایک بالغ کے انعکاسی تفکر کی سی جلد بازی اور خام کاری نہیں ہونے پاتی۔

۲- آزادی

آزادی حقیقی معنی میں ایک چیستان ہے۔ دنیا اس کے وجود سے عاری ہے۔ جب ہم کسی خاص آزاد ریاست یا مدرسہ کے لئے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا منشاء صرف یہ ہوتا ہے کہ اس ریاست کے شہری یا اس مدرسہ کے طلباء ان چند قیود سے آزاد ہیں جو

جو ان ریاستوں کے شہریوں یا ان مدرسوں کے طالب علموں پر عائد ہیں جہاں نام نہاد آزادی مفقود ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ آزادی ایک اضافی اصطلاح ہے جس کے بموجب آزاد اعمال پر حتی الوسع کم از کم قیود عائد ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے اس کا ہر قسم کے قانونی، اخلاقی اور سماجی بندھنوں سے آزاد ہونا ممکن نہیں۔ اگر ہم میں سے ہر ایک کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی دیدی جائے تو دنیا کا سارا اخلاقی اور سماجی ڈھانچہ بالکل بدل جائے گا اور ہم بہت جلد اپنے آپ کو ایک ہڑبونگ اور ایک ہنگامہ کے درمیان پائیں گے۔

فطرت نے خود ہماری صلاحیتوں کی حدبندیاں کردی ہیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنھیں ہم کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں سکتے اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنھیں ہم کر تو سکتے ہیں لیکن کرنا نہیں چاہتے۔ یہ حدبندیاں ہم پر یا تو خود ہمارے نصب العین کی وجہ سے عائد ہوتی ہیں یا سماج اور قانون کی وجہ سے۔ ہم ان تمام قیود کو بلا کسی شکایت کے تسلیم کرتے ہیں۔ ہم کبھی اس بات کی شکایت نہیں کرتے کہ ہمیں کیوں ہمسایہ کی جایداد پر ڈاکہ ڈالنے کی اجازت نہیں دی جاتی یا کیوں ہمارا شعور ہمیں جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن ہم شکایت اس وقت کرتے ہیں جب کوئی شخص ہمیں اپنے من بھاتا کام کرنے سے روکتا ہے اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اس کی کوئی اخلاقی یا سماجی وجہ بھی بیان نہیں کرتا۔ اس چیز کو ہم اپنی شخصی آزادی پر ایک طرح کا ڈاکہ سمجھتے ہیں۔

اس طرح سے آزادی کی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک داخلی اور دوسرے خارجی۔ یہی داخلی آزادی تعلیمی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے کیونکہ اخلاقی تعلیم کا قیمتی مقصد یہ ہے کہ ہر طالب علم میں داخلی آزادی پیدا کی جائے۔ اگر تمام بیرونی جبر ہٹا لئے جائیں تب بھی ہر انسان میں دو داخلی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ ایک جبلی اور دوسرے منطقی۔ کہیے ایک حیوانی اور دوسری انسانی۔ یہ دو قوتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے ٹکرانے کی طرف مائل رہتی ہیں۔ اس بنا پر ہم کہتے ہیں انسان حیوان اور فرشتہ کا ایک عجیب آمیزہ ہے۔

اس میں درندوں کے سے چند میلانات اور رجحانات ہوتے ہیں جو بعد کو فنا ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے دیوتاؤں کے سے میلانات اور رجحانات بھی ہوتے ہیں۔ اگر وہ زندگی بسر کر رہا ہے تو گویا شیطان سے دور اور ولی سے قریب ہوتا جا رہا ہے اور اخلاقی اور روحانی نقطۂ نظر سے نمو پذیر ہے۔ یہی انسانی طاقت کی حیوانی طاقت پر فتح کی دلیل ہے۔

حیوانی طاقت پر انسانی طاقت کی یہ فتح یابیاں عادت سے استوار ہو سکتی ہیں اور زندگی پر ان کا اثر مستقل ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ روحانی ترقی صرف اسی تصادم کے نتیجہ کے طور پر ہوتی ہے۔ محرکات میں جب تک ٹکر نہ ہو اور نیکی اور بدی میں تمیز و انتخاب کا موقع نہ ملے کسی طرح کی بھی اخلاقی ترقی ممکن نہیں۔ اس لئے طلباء کو اس طرح تربیت دی جانی چاہئے کہ وہ اچھائی کو اختیار کریں اور برائی کو چھوڑ دیں۔ جب تک انتخاب میں آزادی نہ ہوگی اخلاقی نشو و نما ممکن نہیں۔ ایک بچہ جو بیرونی جبر کے باعث صحیح راستہ پر چلنے لگا ہو، اس کے لئے اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ قیود کے ہٹا لئے جانے پر وہ فوراً راستہ سے بھٹک جائے۔

اکثر اساتذہ کا یہ تجربہ ہے کہ جب بچے کو نیک و بد کے درمیان انتخاب کا موقع دیا جاتا ہے تو نوے فیصدی صورت حال میں ہمیشہ نیکی ہی منتخب کرتا ہے۔ اگر ہم مدرسہ میں ضبط شکنی کے حادثات پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ اس میں انحراف بیشتر ان قوانین سے کیا گیا ہے جو مدرسین نے اپنی طرف سے طلباء پر عائد کئے تھے۔ قدیم زمانہ میں استاذ ساختہ قوانین اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ بچے کی آزاد فعلیت کے لئے نام کو گنجائش نہ رہتی تھی۔ آج بھی ہمارے ملک کے اکثر مدارس میں استاد کثرت سے "یہ مت کرو اور وہ مت کرو" جیسے تاکیدی جملے استعمال کرتے ہیں۔ یہ احکامات بچہ میں باغیانہ جذبات پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں حالانکہ صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ بچوں کو امتناعی احکامات دینے سے بدرجہا بہتر ہے کہ انھیں خاص عملی اور معین احکامات

دئے جائیں۔

چند اساتذہ موت کے سے سکوت کو ضبط کا معراج سمجھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بات مدرس کے نقطہ نظر سے اچھی اور عملی ہو تو ہو لیکن سچ پوچھئے تو اس میں کچھ جان نہیں ہوتی۔ نیز اس طرح سے، تعلیم کا یہ مقصد کہ طلباء کے نفس اور اخلاق کی نشو و نما ہو، پامال ہو جاتا ہے اور جیسے ہی بچے کو موقع ملتا ہے وہ اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر بیٹھتا ہے۔ یہاں ہمیں تصویر کے دوسرے رُخ کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے، وہ یہ کہ حد سے زیادہ آزادی بھی بعض دفعہ طلباء کے اعتدال نشو و نما کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے محدود آزادی مناسب ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ بچے کو اس کے اپنے تجربے سے اکتساب کرنے کے لئے چھوڑ دینا قرین مصلحت نہیں۔ ٹھیک اس طرح یہ بھی درست نہیں کہ بچوں کو معلومات حاصل کرنے کے لئے بالکل ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے ہر حالت میں ان کی رہبری و راہ نمائی ناگزیر ہے۔ پروفیسر بیلارڈ کے الفاظ میں "ہمیں بچے کو اتنی رسی دینی چاہئے کہ وہ اس میں اپنے آپ کو الجھا سکے لیکن اتنی نہیں کہ اس سے سولی لے لے۔"

(۳) طفل مرکزی تعلیم

اس امر کو سمجھنے کو کے لئے کہ بچہ کو تعلیم کا مرکز قرار دینے کا خیال کس طرح پروان چڑھا یہ ضروری ہے کہ تعلیم کے اس خیال اور مقصد کو پیش نظر رکھیں جو پہلی صدی میں رائج تھا۔ اس دور کی تعلیم میں بچہ کو چند رسمی اور روایاتی طریق تفکر سے روشناس کرایا جاتا تھا۔ اس کے انسانی میلانات، جبلتوں اور فطری دلچسپیوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا اور صرف قوت استدلال اور حافظہ کی تربیت کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جو مواد فراہم کیا جاتا تھا، اس سے بچے کو کوئی خاص ذاتی دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ روسو نے ۱۷۶۲ء میں اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "ایمیل" کے ذریعہ پہلی دفعہ

اس رجحان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا" مسلمہ طریق کار کے عین خلاف عمل کرو۔ یہی صحیح اور سیدھی راہ ہے" یہی اس کا نعرۂ جنگ تھا۔ چنانچہ ایمیل کی تعلیم میں اس نے مضامین درسی سے زیادہ خود ایمیل پر توجہ دی۔ اس طرح پہلی دفعہ تعلیم ایک ایسا طریق عمل بن گئی جس کا واحد مقصد بچہ کی فطرت، اس کے نشو ونما اور اس کے تجربے کے ذریعہ طفولیت کا نشو ونما تھا۔

اس خصوصیت سے زیادہ اہم غالباً وہ رجحان ہمدردی ہے جو روسو نے ایمیل کی طرف ظاہر کیا۔ اس نے کہا کہ اس کی کوئی پرواہ نہیں بچہ کس قدر سیکھتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ" بات ایسی تو نہیں جس کو اسے اپنی مرضی کے خلاف عمل کرنا ہے"۔ پسٹالوزی ہربارٹ اور فروبل کی تعلیمی اصلاحات روسو ہی کے تعلیمی خیالات پر مبنی ہیں۔ ان میں اصلاحات کے نتیجہ کے طور پر یہ خیال پختہ ہوتا گیا کہ کتابوں سے زیادہ اہم خود بچہ ہے۔ ڈاکٹر اسٹانلی ہال نے اس نقطۂ نظر کو ایک لفظ میں ظاہر کیا ہے، وہ ہے" طفل مرکزیت"۔

اب ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ کتنے مختلف طریقوں سے اصول طفل مرکزیت نے جدید تدریس کے اصول و عمل کو متاثر کیا۔

تدریس کے تمام جدید خاکے طفل مرکزی ہیں۔ مانٹی سوری نظام، ڈالٹن پلان، زیر نگرانی مطالعہ، گیری اسکیم، پلے وے، منصوبی طریقہ —— ان سب میں بچہ کی شخصیت پیش پیش ہے حتیٰ کہ آزمائشات اور امتحانات میں یہ خیال ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ان کے ذریعہ طلبار کی خامیاں معلوم کر کے، ان کی اصلاح کی جائے۔ کیونکہ بچہ ہی ہماری تعلیم کا مرکز ہے اور اس پر توجہ دینا ہمارا عین مقصد ہے۔

فرانس میں اس تحریک نے" تکمیلی تدریس" کے خیال کی تخلیق کی۔ بالفاظ دیگر فرانسیسی ماہران تعلیم نے محسوس کیا کہ طلبار متعدد مضامین پڑھتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ ان میں کیا ارتباط ہے۔ بنا بریں انہوں نے چاہا کہ نصاب کی اس طرح تنظیم کی جائے کہ مواد مضمون میں ایک نامیاتی تسلسل پیدا ہو جائے۔

امریکہ میں مضامین کے ارتباط باہمی کے مسئلہ میں ایک اور قدم آگے بڑھایا گیا اور کوشش کی جارہی ہے کہ اساتذہ کے مابین ایک ربط پیدا کیا جائے۔ یعنی یہ کہ مدرسہ کا اسٹاف ایک تعلیمی اکائی کے طور پر کام کرکے فرد کی تعلیم پر اپنا اثر ڈالے۔ اس خیال کی داغ بیل جان ڈیوی نے سب سے پہلے اپنی کتاب مدرسہ اور سماج" میں ڈالی ان امریکی ماہران تعلیم کے خیال کو وسیع معنی میں اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے کہ وہ "مکمل زندگی کی تیاری" کے خواہاں ہیں۔ بچہ کے لئے مدرسہ ہی وہ جگہ ہے جہاں اس کو دنیا میں رہنے کے لئے تیار کیا جانا چاہیئے۔ اس طرح سے مدرسہ ایک سماجی ادارہ بن جاتا ہے جہاں صرف مدرسہ کے باقاعدہ کام پر ہی زور نہیں دیا جاتا بلکہ ضمنی تعلیم پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ اور ہر قسم کے سماجی تعلقات کے تعلیمی اثرات پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے مدرسہ سماج بن جاتا ہے کیونکہ گو بچہ کی انفرادیت قابل احترام ہے۔ تاہم فرد کی خودشناسی صرف سماج ہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔ پس اس طرح مدرسہ چھوٹے پیمانے پر ایک سماج ہے جس میں متعلم کے تجربات کو ممکنہ بہتر طریقہ پر کام میں لایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر فرانکلن جونس کے الفاظ میں" مدرسہ اصل میں تجربے سکھانے والا ایک ادارہ ہے اور اگر وہ بچوں کو ان تجربوں کے علاوہ جنھیں وہ دنیا میں کسی جگہ بھی حاصل کرسکتے ہیں اور زیادہ تجربے نہ سکھلا سکے تو پھر اس کے وجود کا مسئلہ معرض بحث میں آجاتا ہے" اس طرح سے حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

(۱) ماحول کن اجزاء پر مشتمل ہے۔؟

(۲) ضروری تدابیر کونسی اختیار کی جائیں؟

(۳) تعلیم کے اس جدید تصور میں مدرس کی حیثیت کیا ہے؟

ڈاکٹر ایڈیسن کا خیال ہے کہ ماحول فطری دنیا، سماجی دنیا، اور اخلاقی دنیا پر مشتمل ہے۔ پس کسی مدرسہ کے مضامین مطالعہ ان تینوں دنیاؤں کے حقیقی تجربات پر مبنی ہونا چاہیئے۔ پروفیسر فرانکلن جونز کے مطابق "مواد مضمون کسی نسل کے ان غیر شخصی تجربات پر مشتمل ہوتا ہے جو ہماری رائے میں بچہ کی زندگی کے لئے گراں قدر ہیں" وہ کہتا ہے کہ

ہمارے روز کے تجربات کو مضامین درسی کے مختلف عنوانات کے تحت لایا جاسکتا ہے۔ جیسے جغرافیہ، تاریخ، ریاضی، السنہ، طبعیات وغیرہ لیکن موجر " Employers " کے لئے صرف مدرسہ کی تربیت یافتہ پیداوار ہی کافی نہیں اس کو ایسے کام کرنے والے درکار ہیں جو اس کے دفتر یا دکان پر کام کر سکیں۔ پس ماہرین تعلیم کا یہ اصرار ہے کہ تربیتی نصاب کے اختتام پر مزید ضروری معلومات فراہم کی جائیں اسی بنا پر موجودہ زمانہ میں مدارس کے نصاب میں آرٹ اور کرافٹ کی کچھ تربیت دی جاتی ہے۔ یہ اضافہ نفسیاتی اور افادی نقاط نظر سے ضروری سمجھا گیا ہے "بچے اپنے خصوصی طریق تفکر کے مالک ہوتے ہیں اور کوئی بچہ اس طریق عمل کا اہل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ دیکھے اور محسوس نہ کرے۔ آرٹ اور دستکاری کی ہی بدولت اسے اپنی آنکھوں اور اپنے ہاتھوں کے استعمال کا موقع ملتا ہے۔ اب جب کہ بچے کو خود اظہاری اور مشاہدہ کا موقع حاصل ہے اور جب کہ اسے خود کے پسندیدہ کام کو روبہ عمل لانے میں مسرت ہوتی ہے تو بس کسی ایک حرفہ میں بچہ کی یہ دلچسپی اس کے آئندہ پیشہ کے تعین و تصفیہ میں مدد پہنچانے کے لئے مدرس کی رہبری کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس قسم کی تعلیم پر ۱۸۸۲ء سے زور دیا جانے لگا اس سال کی انڈین ایجوکیشن کی رپورٹ میں تحریر ہے " تمام صوبوں میں یہ محسوس کیا گیا ہے اور مختلف شہادتوں سے پتہ چلا ہے کہ ثانوی مدارس میں طلباء کا رجحان جامعاتی تعلیم کی طرف بہت زیادہ ہے اور اس رجحان کو ترقی دینے کے لئے انہیں وہ مواقع حاصل نہیں ہیں جو یورپ میں جدید طرز کے مدارس کو حاصل ہیں۔"

ہندوستانی تعلیم کو اس جدید رجحان سے روشناس کرانے کی وقتاً فوقتاً کوشش کی جاتی رہی ہے۔ لیکن حال حال میں اس مسئلہ پر ذرا سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا ہے۔ اس موقع پر بنیادی تعلیم یعنے واردھا اسکیم کا ایک سرسری خاکہ غیر موزون نہ ہوگا۔ ساری اسکیم کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) ابتدائی تعلیم (۷) سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک جاری رہے اس میں سوائے انگریزی کے میٹرکیولیشن کے جملہ مضامین شامل ہوں۔ اس میں کسی ایک پیشہ کی تعلیم

شامل کی جائے تاکہ ہر شعبہ علم لڑکے اور لڑکیوں کی دلچسپی کو بیدار رکھنے میں محرکہ کا کام دے اور یہ تعلیم آج کل کی تحتانی، اور وسطانی اور فوقانی تعلیم کی قائم مقام بنے۔

(۲) ایسی تعلیم بحیثیت مجموعی خود مکتفی ہونی چاہئیے دراصل اس کا خود مکتفی ہونا ہی اس اسکیم کی جان ہے۔

اس اسکیم میں حسب ذیل خامیاں پائی جاتی ہیں۔

(۱) یہ تعلیم کم عمری میں کسی ایک پیشہ میں تخصیص کی طرف مجبور کرتی ہے۔

(۲) اس اسکیم میں ۵ تا ۷ کی عمر والے بچوں کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے۔ حالانکہ یہ اسکیم ۳ اور ۷ کے درمیانی عمر والے بچوں کی ماقبل مدرسہ تعلیم کے لئے انتظام کی ضرورت کو محسوس کرتی ہے۔

(۳) نصاب سے انگریزی زبان کو خارج کر دیا گیا ہے۔ مذہبی تعلیم کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے۔

حیدرآباد میں ہم ایک درمیانی راہ اختیار کر رہے ہیں جس میں نہ تو واردھا اسکیم کی طرح بالکلیہ تعلیم حرفہ ہی پر زور دیا گیا ہے اور نہ قدیم طرز کی کتابی تعلیم پر ہی تکیہ کیا گیا ہے۔ آرٹ اور دستکاری کی تعلیم کے لئے ہم نے نصاب میں پارچہ بافی، خیاطی، بخاری، بید بافی اور بدری کام وغیرہ کو شامل کر دیا ہے۔

حال حال میں ڈرائنگ، آرٹ اور کرافٹ کے نصاب میں ہلکی تبدیلی کی جا کر اسے طفل مرکزی نقطۂ نظر کے قریب لایا گیا ہے۔

اس توسیع نصاب کی بڑی خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) بچہ پر کسی قسم کا جبر عائد نہیں کیا جاتا۔ اس کو اظہار کی مکمل آزادی دی گئی ہے۔

(۲) بچہ کی نفسیات سے نصاب کا ارتباط کیا گیا ہے۔

(۳) مقصد یہ ہے کہ طلباء میں جدت، قوت مشاہدہ اور صلاحیت تحسین پیدا کی جائے۔

(۴) مدرسہ اور دنیا سے اُسے روشناس کیا جاتا ہے تاکہ طالب علم ان خیالات کا اظہار کر سکے جو اس کے دل میں سب سے زیادہ موجزن ہیں۔

(۵) خاکوں پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے۔

(۶) مدرسہ میں تیار کیا ہوا سامان کارآمد ہونا چاہئے کیونکہ اس سے ایک تو طالب علم کی ہمت افزائی ہوگی اور دوسرے خیالی اور تصوری کام کے نہ کرنے سے متعلق اس کی رہبری ہوگی۔

(۷) بچے اور مدرس کو کافی مواقع دینے پر یہ نصاب بچے میں کسی خاص حرفہ سے متعلق دلچسپی پیدا کرے گا اور اس طرح سے بچہ اپنے روزمرہ مشغلہ سے زیادہ اس میں دلچسپی لے گا۔

(۴) ضبط

مدارس خدمت گذار ادارے ہیں۔ مدرس کا فرض یہی نہیں ہے کہ طلباء کی جسمانی و دماغی نشوونما کی طرف متوجہ ہو بلکہ ان میں ایسی صفات پیدا کرے کہ دنیا میں قدم رکھنے کے بعد وہ کامیاب ہوسکیں۔ یہ تربیت اس صورت میں کامیاب اور کارگر ثابت ہوسکتی ہے جبکہ معلم اور متعلم دونوں کے درمیان خلوص اور ہمدردی کی فضاء پیدا ہو جائے۔ طلباء کمسن ہوتے ہیں اور ان کا نفس فطرتاً غیر تربیت یافتہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا زیادہ رجحان شرارت، بدنظمی اور شوروغل کی طرف ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تدریس کے دوران میں ضبط، امن اور خاموشی پیدا کرنے کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں بالفاظ دیگر کمرۂ جماعت میں ضبط قائم رکھنا ضروری ہے۔

مختلف زمانوں اور مختلف ممالک میں ضبط قائم رکھنے کے لئے سزا کے مختلف طریقے تجویز کئے گئے۔ ان میں سب سے زیادہ سخت جسمانی سزا کا طریقہ ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں، ہر متمدن و غیر متمدن ملک میں سزا کا یہی طریقہ رائج تھا۔ مدرس کا نصب العین یہ تھا کہ سرزنش سے اغماض بچہ کی تباہی کا باعث ہے" ہندوستان میں بھی مدرس کی تسکین و تسلی کا واحد ذریعہ چھڑی ہی تھی۔ درخت کی ٹہنی سے پتے نکال کر یا کسی لکڑی کے چھوٹے سے ٹکڑے سے سزا دی جاتی تھی اور بعض

دفعہ تو طمانچہ بھی رسید کر دیا جاتا تھا۔ اب بھی ہمارے ملک میں ایسے مدرسین کی کمی نہیں ہے۔ آج بھی دیہات کے مدارس میں ڈاکٹر ایکیٹ کے ہم خیال مدرسین موجود ہیں جو چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر ایسے معصوم بچوں کو جسمانی سزا دیتے ہیں جنھیں کھانے کو کھانا تک نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے نتائج پر اگر آپ تھوڑا سا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اکثر صورتوں میں صرف سزا کا مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ اس سے الٹی نفرت اور تکلیف ہوتی ہے۔

تصویر کے دونوں رخوں کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ہم سزا جسمانی کو بالکلیہ نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں کچھ نہ کچھ خوبی ضرور موجود ہے۔ ساتھ ہی اس کے اس کی وجہ سے طالب علم پر خطرناک اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ اس کی خودداری کو ٹھیس لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ سنگ دل اور بے رحم ہوتا جاتا ہے اور استاد کی اتباع میں اپنے ننھے ساتھیوں کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھتا ہے اس طرح اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کی سزا مدرس کی طرف سے طلبا کے دلوں میں نفرت پیدا کرتی ہے اور رفتہ رفتہ کمرۂ جماعت میدان جنگ بن جاتا ہے جس میں مدرس کے اقتدار اور بچوں کی مکاری و نافرمانبرداری کے درمیان زبردست تصادم ہوتا ہے۔ اس طرح سے کمرۂ جماعت کا ماحول تدریس کے مناسب حال نہیں رہ سکتا۔

نیز اس قسم کی سزا بچوں میں خوف و دہشت پیدا کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس خوف کے تحت جو کچھ بھی لکھا پڑھا جائے گا عارضی ہوگا اور جلد حافظہ سے محو ہو جائے گا۔ بچوں میں اپنی غلطیوں کو چھپانے کی بڑی عادت پڑ جائے گی اور کبھی وہ کھل کر اپنا ما فی الضمیر بیان نہ کر سکیں گے۔

تعلیم کے باب میں حالیہ رجحانات کے تحت مدرس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے فرائض سے بخوبی واقف ہو، جابر و جلاد ہونے کی بجائے اس سے فرشتۂ محبت بننے کی توقع کی جاتی ہے۔ یہ بات موثر اور ہمدردانہ تدریس سے حاصل ہو سکتی ہے

بچے خوش خوش اکتساب علم کرتے ہیں اور متعلم اور معلم میں ایک خوشگوار رشتۂ اتحاد و محبت قائم ہو جاتا ہے۔

بچہ آخر انسان ہی ہے، اس میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے۔ مدرس کا فرض ہے کہ وہ اس کی مخفی صلاحیتوں کو پہچاننے اور صحیح راہ نمائی سے اس کے نشو و نما میں مدد دے مدرس کو خزینۂ معلومات ہونا چاہیئے تاکہ وہ طلبار کو صحیح راستے پر گامزن کر سکے۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اپنے ملک کی حالت پر غور کریں اور اس پران اصولوں کے اطلاق کی کوشش کریں تو ایک الجھن سی پیدا ہو جائے گی۔ یہاں امتحانات کی کامیابی فیصد بہت زیادہ ہے جس کے باعث ہم عجلت و خلوص کے اساس پر تعلیم نہیں دے سکتے۔ بچوں میں صحیح و غلط کا ادراک بہت کم ہوتا ہے۔ شرارت اور بدنظمی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے جس کے ارتفاع کے لئے انہیں سزا دینی پڑتی ہے۔ امورِ متذکرۂ بالا کے پیشِ نظر ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ عام طور پر سزا کے معمولی اور سادہ طریقے استعمال کئے جائیں اور جسمانی سزا کو ناگزیر مواقع کے لئے اٹھا رکھا۔

جیسا ابھی اوپر کہا گیا ہے وہ تعلیم تعلیم کھلانے کی مستحق نہیں ہے جو بچہ کو حسن کا شیدائی، برائی کا نافر اور اچھائیوں کا پرستار نہ بنا دے۔ اس طرح سے اخلاقی تربیت بچہ کی تعلیم کا ضروری جزو ہونا چاہیئے۔ اب دنیا ایک ایسے نقطہ پر پہنچ چکی ہے جہاں طاقت کا ذرا سا اختلاط، اسے ایسے قعرِ مذلت میں ڈھکیل دے گا جہاں اجنبی طاقت کا پنجہ اس کو دبانے کے لئے تیار ہے۔ آج کا حال تو یہ ہے کہ جس کی لٹھ اس کی دیگ "۔ مذہب اور اخلاق تو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ صلحناموں کی وقعت کاغذ کے پرزوں سے زیادہ نہیں جنہیں عدم ایفار معاہدہ کی کسی صورت میں بھی جلا یا یا پھینک دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں تعلیم کے معاملہ میں بہت ہی محتاط ہونا چاہیئے اس کے لئے ضرورت ہے کہ مغرب کے علوم و فنون کے خزینوں کو اخلاق کے اساس پر اپنے ملکی ماحول کی مناسبت سے اپنی تعلیم میں سمو لئے جائیں

اخلاقی تعلیم ہر ہندوستانی جامعہ کے نصاب کا جزو ہے۔ طلبار تمام اخلاقی اُصولوں کو اچھی طرح ازبر کر لیتے ہیں اور امتحانات میں موزون مثالوں کے ساتھ اسے پیش بھی کرتے ہیں لیکن اگر کوئی ان سے یہ پوچھے کہ کیا تم انھیں اپنی روزمرہ زندگی کے صورت حال میں استعمال کرتے ہو تو جواب ملے گا نہیں۔

ان تمام نقائص کے باوجود اگر اخلاقی تعلیم صحیح اُصول پر دی جائے تو یقیناً وہ طالب علم کو فرمانبردار اور پابند قانون شہری بنا دے گی۔

مدرس طلبار کے لئے ایسے مواقع فراہم کر سکتا ہے جن میں وہ مکسوبہ اخلاقی ہدایات کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ زائد از نصاب مصروفیات اس کے لئے ایک خوش گوار میدان پیدا کرتی ہیں کشافہ، تنظیم کھیل، تعلیمی تفریحات، مُباحثے، مدرسے کے جلسے، مراکز مطالعہ، بزم تمثیل جیسی مصروفیات سماجی خدمت، سچائی اور تحمل کی تربیت کے لئے موزون ہیں۔

اس سلسلے میں صدر مدرسین اور مدرسہ کے اسٹاف کے درمیان جو باہمی اخلاقی فرائض ہیں ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جس طرح مدرس طلبار کے لئے نمونہ ہوتا ہے اس طرح صدر مدرس کو بھی اسٹاف کے لئے نمونہ بننا چاہیئے۔ ہر مدرس اپنی جگہ خود داری کا ایک نمونہ ہوتا ہے اس لئے صدر مدرس کو چاہیئے کہ پہلے خود وہ خدمت گزاری اور فرض شناسی کی بہترین نمونہ بنے اور اپنے قول و فعل سے دوسروں کی خود داری کو ٹھیس نہ لگائے۔ بحیثیت مجموعی مدرسہ کی بہبودی کا خیال رکھے اور ایک طرف خود میں اور اسٹاف میں اور دوسری طرف اسٹاف اور طلبار میں ارتباط قائم رکھے۔ اس طرح سے مدرسہ ایک اعلیٰ اخلاقی معیار کا مرکز بن جائے گا اور فطری طور پر طلبار اس اخلاقی ماحول کو محسوس کریں گے اور اس کے منفعت بخش اثرات سے بہرہ اندوز ہوں گے۔

اخلاقی اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اقامت خانوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ خود کمرۂ جماعت، جس میں خلیفائی نظام سے کاروبار چلتے ہوں، ایک مفید چیز ہے۔ اس طریقے سے حقیقی طور پر اہل طلبار قیادت کے لئے تیار ہو سکتے ہیں یہی طلبار اپنے

ساتھیوں کے لئے اپنے نیک کردار اور برتاؤ کا نمونہ بن سکتے ہیں۔

۵ — "تعلیم بطرزِ کھیل"

بچے کی نفسیات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ بچہ اب ایک خام نارسیدہ ہستی نہیں بلکہ سماج کی ایک ترقی کناں اکائی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تعلیم میں اس کی شخصیت کو اس کے فطری رجحانات، میلانات، جبلتوں اور دلچسپیوں کو مناسب جگہ دی جانی چاہیئے۔ تعلیم بچے کے لئے ہو نہ کہ بچہ تعلیم کے لئے۔ نفسیات کے رجحان کی اس تبدیلی نے اصول اور طریقۂ تعلیم دونوں کو سرے سے بدل دیا ہے اب ہم علم کو بچوں کے دماغوں میں ٹھونستے نہیں بلکہ ایسے انتظامات کرتے ہیں کہ جن سے ان کی ان فطری دلچسپیوں اور میلانات کی نشوونما ہو سکے، جو ہر وقت بے نقاب ہونے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مدرسوں کے نصاب بچوں کی دلچسپی کے اطراف ترتیب دئے جاتے ہیں۔

یہ تو اصول ہوا۔ اب طریقۂ تعلیم میں ہم بچے کی اس جبلت سے مدد لیتے ہیں جو اس خصوص میں ہماری بہت زیادہ مدد کرتی ہے۔ اور جس کی بنیاد پر بچہ عمدہ اکتساب کر سکتا ہے۔ یہ جبلت کھیل ہے۔ چنانچہ مختلف ماہرین تعلیم کے جدید طریقہ ہائے تعلیم میں یہی عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے مانٹی سوری۔ ہیلن۔ پارکرسٹ، ڈکرالی۔ ڈیوی وغیرہ جیسے ماہران تعلیم کے تعلیمی نظامات کا مطالعہ کریں تو ان سب میں ہمیں کھیل کی روح کار فرما نظر آئے گی۔ نفسیات جدید نے یہ نکتہ ہم پر واضح کر دیا ہے کہ موثر اکتساب کا واحد ذریعہ کھیل ہے۔ اس میں بچے کی دلچسپی بیدار رہتی ہے۔ اور مشکل سے مشکل کام جبر نہیں بلکہ مسرت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ بنا بریں طریقۂ تعلیم کی تنظیم ایسی کرنی چاہیئے کہ اس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طریقے پر کھیل کا عنصر شامل رہے۔ اس کو ہم "تعلیم بطرزِ کھیل" کہتے ہیں۔

اب ہم ان چند طریقوں کو پیش کریں گے جن سے یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

سب سے پہلے ہم خود انتظامی یا حکومت خود اختیاری کو لیں گے۔ مدارس میں خود انتظامی کے طریقے کی تربیت کا بڑا مقصد طلبہ کو نفسی آزادی دینا ہے۔ تاکہ

(۱) طلبہ میں داخلی ضبط پیدا ہو

(۲) بچے آگے چل کر زندگی کے کاروبار میں بلا تکلف حصہ لے سکیں۔

(۳) انھیں اپنے نفس پر قدرت وقابو حاصل ہو جائے تاکہ اکتساب علم کی ذمہ داری کو محسوس کر سکیں۔

ابھی ہم نے بتلایا ہے کہ طلبہ میں بیرونی نہیں بلکہ داخلی ضبط پیدا کرنا چاہئے مدرس کا جبر ان کی نفسی الجھن کا باعث ہوتا ہے۔ جب مدرسہ کے بیشتر کام کاج طلبہ کے ہاتھوں میں دے دئے جاتے ہیں اور ان کی اچھائی اور برائی کا انھیں ذمہ دار گردانا جاتا ہے تو وہ اسے غیر کا نہیں اپنا کام سمجھنے لگتے ہیں۔ اور سارا کام اس عمدگی سے انجام پاتا ہے کہ کسی بیرونی ضبط کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ بالعموم اس مقصد کی تکمیل کے لئے جماعت واری نمایندے مقرر کئے جاتے ہیں۔ پھر ان سب نمایندوں کا صدر مقرر ہوتا ہے۔ مختلف کاروبار کا تجزیہ کیا جا کر تقسیم کار کے اصول کی پابندی کی جاتی ہے۔ ایسے کاموں میں جماعت واری کتابوں کی داد و ستد کرنا، جرمانے وصول کرنا، کھیل کے میدان کے سارے انتظامات کرنا، اداب و اخلاق پر نگرانی رکھنا اور مدرسہ کے لئے ایک خاص اخلاقی معیار قائم کرنا۔ ساتھیوں کی بیرون مدرسہ مصروفیات پر نگاہ رکھنا۔ انفرادی کام کی جانچ کرنا، باہمی حقوق کی حفاظت کرنا۔ ڈراموں، جلسوں۔ اور مباحثوں کی ساری کارروائیوں کو باہمی مشوروں سے انجام دینا، دیگر مدارس کے مقابلوں کے لئے تیاریاں کرنا۔ مدرسہ کی عام صفائی اور ساتھیوں کے جسمانی صفائی کی دیکھ بھال کرنا وغیرہ امور شامل ہیں۔ مختلف تجربوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مدارس میں ایسا طریقہ ہمیشہ کامیاب رہا ہے اور یہ سارے کام طلبہ کی انتہائی دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ مدرسہ خود گویا ان کی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا ہوتا ہے جس کے سارے کاروبار وہ اپنی مرضی سے چلاتے ہیں۔ اس طرح کی زندگی انھیں ایک ذمہ دار ایک کارآمد اور ایک فرض شناس شہری بنانے میں مدد دیتی ہے۔ جب وہ اس تعلیمی دنیا کو چھوڑ کر

بیرونی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو سماجی کاروبار کو چلانا ان کے لئے بچوں کا کھیل ہو جاتا ہے۔

اقتصادی نقطۂ نظر سے ایسا انتظام مدارس کے لئے کسی طرح بار نہیں ہوتا ہمارے مدارس میں یہ چیز تقریباً مفقود ہے۔ حالانکہ ذرا سنجیدگی سے اس کی تنظیم کر دی جائے تو مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسباق کی میکانیت کو دور کرنے کے لئے طلبہ کو مدرسہ میں اپنی اپنی پسند کے موضوعات پر تقریریں کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مدرسہ کے وقت نامہ میں چند گھنٹے طلبہ کی تیار کردہ اور فی البدیہہ تقاریر کے لئے مختص کر دیئے جائیں۔ اور ہر طالب علم کو اس میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔ ساتھ ہی اس کے سامعین کو یہ موقع دیا جائے کہ تقریر ختم ہونے کے بعد وہ اپنے شکوک رفع کرلیں۔ غلط بیانات کو درست کریں اور اپنی معلومات سے اس تقریر میں اضافہ کریں۔ مدرس بھی ایک سامع کی طرح جماعت میں بیٹھے۔ اور ضرورت پر خود بھی حصہ لے۔ دیکھا گیا ہے کہ ایسی تقریروں میں طلبہ مسلسل چار چار گھنٹے تک بلا کسی تکان کے حصہ لیتے ہیں۔ اور ان کی معلومات میں درسی میکانی۔ اسباق کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ طلبہ کی اپنی دلچسپیوں کی چیزیں ہیں اور ان کا حل ان کی مسرت کا باعث۔

جملہ مضامین تدریسی کے ساتھ یہ طریقہ کار اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ان تقاریر کو کسی ایک خاص مضمون سے متعلق کرنا مناسب نہیں۔ بلکہ عام طور پر مدرسہ کے نظام الاوقات میں اس کے لئے مناسب جگہ نکالنی چاہئے تاکہ مختلف موضوعات پر خیال آرائی ہو سکے ہمارے مدارس میں اس کے لئے کافی مواقع موجود ہیں۔ چنانچہ بعض مدارس نے اس کام کو (Study Circles) کے طور پر شروع کیا ہے۔ لیکن یہ کام بالعموم اوقات مدرسہ کے بعد ہوتا ہے۔ جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے غلط ہے اس لئے کہ اسے مدرسہ کے کاروبار کا ایک حصہ نہ سمجھنا خود اس کی اہمیت کو گھٹا دیتا ہے۔ بعض مدرسین اسے ہرج کار مدرسہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ تدریس کو کامیاب بنانے اور کسی مضمون سے متعلق معلومات میں اضافہ کرنے کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہے۔

مدارس کے بعض مضامین میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ان کے اکثر حصوں کو آسانی کے ساتھ کھیل کے طریقے پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ اور ادب کو اس خصوص میں بہت سے مواقع حاصل ہیں۔ اس سلسلہ میں قصہ گوئی تمثیل نگاری۔ اور نظم خوانی سے بڑی مدد لی جاسکتی ہے۔ اگر طلبہ کو موقع دیا جائے کہ وہ تاریخ و ادب کے زیر مطالعہ دلچسپ حصوں کو دھرائیں پھر خود طلبہ آپس میں زبان اور مواد مضمون کی تصحیح کرتے جائیں اور قصے کی صورت میں اسے موثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کریں تو اس سے کافی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح سے ایسے حصوں کو جن میں بات چیت کا عنصر شامل ہو ڈرامائی انداز میں پیش کیا جائے تو سبق میں خاصی جان پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ مدارس میں شکسپیر کے ڈراموں کی تدریس کے وقت بعض ہوشیار مدرسین اکثر مناظر کو طلبہ سے باقاعدہ ڈرامے کے طور پر پیش کرواتے ہیں۔ جس سے طلبہ ڈرامہ کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ محض رسمی طور پر اہم فقروں کی تشریح و تفہیم غیر دلچسپ اور جامد ہوتی ہے۔

اچھی نظموں کو دھرانا بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ طلبہ کو اس بات کے لئے اکسانا چاہئے کہ وہ اپنی پسند کے منظوم حصوں کو اچھے لحن میں دھرایا کریں۔ اور اگر گا سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔ ہمارے ملک کے بعض مدارس میں ان باتوں پر توجہ کی جانی لگی ہے خصوصاً علی اکبر مقابلہ۔ اور نظم خوانی کے مقابلے نے محرکہ کا کام دیا لیکن اس میں خامی یہ ہے کہ یہ کام زیادہ تر مقابلہ کی اسپرٹ میں کیا جاتا ہے۔ اور صرف چند بچے اس کے لئے تیار کئے جاتے ہیں یہ غلط طریقۂ کار ہے۔ اسے مدرسہ کے لائحۂ عمل کا ایک جزو ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے نہ تو نظام الاوقات میں کسی خاص جگہ کے مہیا کرنے کی ضرورت ہے اور نہ زائد از نصاب مصروفیات میں شامل کرنے کی، بلکہ جو مدرسین اس کی اسپرٹ کو سمجھ جائیں اور اس سے فائدہ اٹھانے کے ڈھنگ سے واقف ہوں وہ اسے اپنی روزمرہ تدریسی کام کا ایک جزو بنا سکتے ہیں۔

مدرسہ کے باغ کی نگرانی بھی ایک اچھا ذریعہ تعلیم ہے۔ لفظ باغ ہی بچہ کی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ اگر مدرسہ میں باغ ہو اور اس باغ کی نگرانی اور کام کاج کے سارے انتظامات طلبہ کے ہاتھ میں دے دئے جائیں تو اس سے مختلف مضامین کی تدریس میں جان پڑ سکتی ہے

خصوصًا سائنس۔ جغرافیہ۔ اور دست کاری کے کاموں میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور بچے کھیل کھیل میں بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔

مدارس کی تعلیمی تفریحات بھی اپنے اندر خاص وصف رکھتی ہیں بشرطیکہ وہ اس انداز میں کی جائیں۔ سب سے اول ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی تفریحات میں مختلف مضامین کے مدرسین اتحادِ عمل کریں۔ اور تفریح میں مدرسین بھی طلبہ کے ساتھ رہیں۔ طلبہ پر تفریح کی غرض و غایت نہ صرف واضح کی جائے بلکہ یہ بتلایا جائے کہ ایسی تفریحات کے ضمن میں حالات و واقعات کے مطالعہ کا صحیح طریقہ کیا ہوتا ہے۔ تفریح کے دوران میں مدرسین کو چاہیئے کہ اپنے اپنے موضوع سے متعلقہ چیزوں پر طلبہ سے تبادلۂ خیال کریں ان کی دلچسپیوں کی تشفی کریں۔ تفریح کے بعد اس کی روئداد یں لکھیں۔ مضمون اور زبان کے لحاظ سے ان کی جانچ کی جائے اور مدرسہ میں مختلف مضامین کے گھنٹوں میں علیحدہ علیحدہ ان پر گفتگو کی جائے۔ اس طرح سے مدرسہ کے مختلف مضامین سے متعلق موضوعات معرضِ بحث میں آجائیں گے۔ اور مختلف مضامین کے درمیان ارتباطِ باہمی کا ایک وسیلہ ہاتھ آجائے گا۔ یہ چند بنیادی طریقے مختلف طریقوں سے کام میں لاکر ہم تعلیم کو کھیل کے طور پر جاری رکھ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ جملہ زائد از نصاب مصروفیات اس کام میں ہاتھ بٹا سکتی ہیں۔

شذرات

روئداد مدرسہ تحتانیہ نیکل پلی تعلقہ کلبگور ضلع میدک بتاریخ ۲۴ خورداد ۱۳۵۱ف جلسہ سالانہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ مدرسہ تحتانیہ نیکنکہ و اننت ساگر اور مومن پیٹھ کے مدرسین و طلبہ نے اس میں شرکت کی اساتذہ صاحبان نے علم کے فوائد بیان کئے اور طلبائے مدرسہ نے مختلف کھیلوں میں حصہ لیا اور انعامات حاصل کئے۔

روئداد جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ درجہ اول مستقر تعلقہ ملک۔ بہ صدارت تحصیلدار صاحب تعلقہ ماک بتاریخ ۱۵ خورداد ۱۳۵۱ف جلسہ سالانہ منایا گیا۔ مرکزی مدارس کے اساتذہ صاحبان و طلبہ بھی شریک تھے صدر مدرس صاحب مدرسہ نے سالانہ رپورٹ پڑھی من بعد طلبا نے مختلف عنوانات پر اردو و تلنگی زبان میں تقریریں کیں۔ طلبا کے پیش کردہ ڈرامہ کا حاضرین پر اچھا اثر پڑا صدر جلسہ نے تقریر صدارت کو ختم کرنے کے بعد اپنی ذات سے مبلغ (۱۵) روپیہ کے انعامات طلبہ میں تقسیم فرمائے۔

روئداد جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ درجہ اول مانجرم تعلقہ بلولی ضلع ناندیڑ۔ بتاریخ ۲۶ و ۲۷ خورداد ۱۳۵۱ف جلسہ سالانہ منعقد کیا گیا طلبہ و اساتذہ صاحبان نے مختلف عنوانات پر تقاریر کیں۔ نمونے کے اسباق چہارم و صغیر کو دئے گئے۔ مرکزی مدارس کے جملہ اساتذہ صاحبان شریک جلسہ تھے۔

روئداد جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ مری کنڈلہ ضلع ورنگل۔ جلسہ بتاریخ ۲۲ خورداد ۱۳۵۱ف منایا گیا۔ طلبائے مدرسہ نے مختلف عنوانات پر مضامین پڑھے مولوی محمد افضل صاحب نے کشافوں کی تربیت اور ہوائی حملہ سے بچاؤ کے تدابیر پر کافی روشنی ڈالی۔

روئداد جلسہ ہائے انجمن اساتذہ مدرسہ تحتانیہ یلدرتی ضلع میدک۔ (۱) بتاریخ ۳۰ اسفندار ۱۳۵۱ف جلسہ کا آغاز سابقہ روئداد کی توثیق کے بعد ہوا۔ جماعت دوم کے طلبا کو مطالعہ قدرت پر نمونے کا سبق نہایت کامیاب طریقہ پر دیا گیا۔

(۲) بتاریخ ۲۵ فروردی ۱۳۵۱ف سابقہ روئداد کی توثیق کے بعد جلسہ کا آغاز ہوا مدد گار صاحبان

مدرسہ ہذا نے حسب پروگرام سابقہ مقرر کردہ، طلبا رمیں تعلیمی شوق پیدا کرانے کی تدابیر سے متعلق عمدہ خیالات کا اظہار فرمایا۔

(۳) بتاریخ ۲۹ اُمرداد بہشت ۱۳۵۱ف جلسہ منعقد ہوا مدرسین صاحبان مدرسہ نے امتحان کی اہمیت سے متعلق اپنے عمدہ خیالات کا اظہار فرمایا۔ صدر مدرس صاحب مدرسہ نے گشتیات کی تفہیم فرمائی۔

روئداد جلسہ سالانہ مدرسہ تحتانیہ قصبہ کنگ گری ضلع رائچور۔ بتاریخ ۱ خورداد ۱۳۵۱ف سالانہ جلسہ منایا گیا۔ صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں اولیائے طلبہ کو اساتذہ صاحبان سے تعاون عمل کی نسبت توجہ دلاتے ہوئے اس کے مفید نتائج پر روشنی ڈالی۔ طلبائے مدرسہ نے ایکٹنگ کے ساتھ نظم سنائی اور مکالمے ہوئے۔

روئداد مدرسہ تحتانیہ احمدی پور تعلقہ سدی پیٹھ ضلع میدک۔ بتاریخ ۱۲ اُمرخورداد ۱۳۵۱ف جلسہ سالانہ منایا گیا۔ معلومات دیہی پر نمونے کا سبق دیا گیا طلبا اور اساتذہ صاحبان نے علم۔ زراعت۔ تجارت وغیرہ پر تقاریر کیں شرکائے جلسہ نے اسپورٹس و نمائش گاہ کا معائنہ فرما کر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔

تنقید و تبصرہ

بیسک انگلش:۔ مولوی سید خیرات علی صاحب زیدی مددگار مدرسہ فوقانیہ میدک نے بنیادی انگریزی کی وضاحت کے لئے اردو داں حضرات کے لئے ایک مضمون لکھا تھا جسے اب "بیسک انگلش" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔ کتاب بڑی تقطیع کے ۸۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور طباعت صاف ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے ہندوستان کی سب قومی زبان اُردو میں یہ مضمون لکھ کر بیسک انگلش کی خصوصیات معلوم کرنے اور نیز قطع نظر انگریزی کے کسی غیر زبان کی تدریس سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے بیسک کے نئے طریقۂ تعلیم سے واقف کرنے کا ایک ذریعہ

بہم پہنچا دیا ہے۔ مولوی صاحب اس کوشش کے لئے لائق مُبارکباد ہیں۔

لیکن ساتھ ہی بیسک انگلش کی عمارت کے تیار کرنے والوں کی محنت اور مقبولیت سے انکار کئے بغیر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کو مدارس کی جماعتواری تعلیم کے لئے موزون قرار دینا گوناگوں پیچیدگیوں کو مول لینا ہے۔ بیسک انگلش کی تعلیم بلاشبہ موزون ہوسکتی ہے لیکن صرف اُن اشخاص کے لئے جو کارخانوں کے ملازم ہوں یا فیکٹریز میں کام کرتے ہوں جن کے یہاں الفاظ کا ذخیرہ پہلے ہی سے کچھ نہ کچھ موجود ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ انگریزی کو ضرورتاً سیکھنے کے لئے مضطرب سے رہتے ہیں اُن کا یہ ذاتی شغف اور پھر انگریزیت کا کچھ رنگ یہ ہردو عوامل بیسک انگلش کے ذریعہ قلیل عرصہ میں انہیں انگریزی کچھ لکھنے پڑھنے اور بولنے کے قابل کردے سکتے ہیں۔ لیکن کم سن طلباء کا سوال اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ نہ ان پر کسی انگریزیت ہی کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے اور نہ وہ کوئی خاص ذخیرہ الفاظ ہی رکھتے ہیں اور نہ انگریزی کی افادیت کے مدنظر اس کے تحصیل کے لئے کچھ مضطرب سے ہی ہوتے ہیں۔ لہذا ان علمی دقتوں کے مدنظر دیکھنے کے لئے Havea look at تلاش کرنے کے لئے Have a look for بیوی کے لئے A woman that has been married اور سینے کے لئے Make a stitch کی مہارت کرائی گیا ایک مہارنی رٹانے کے مماثل ہے۔ جس سے بچوں میں ایک طرح کی بیزاری پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جو ممکن ہے کہ تعلیم سے تنفر کی صورت ہی میں منتج ہو۔

قطع نظر اس کے اس عام کساد بازاری کے زمانہ میں ہندوستان جیسے مفلوک الحال ملک میں یہ ممکن نہیں کہ بیسک انگلش کے کارن تعلیم انگریزی کے لئے ایک طالب علم کے واسطے متعدد کتابیں مثل 'Reading Books' Wider English Seat Work Language Books اور ایک سطحی مشق دور کے لئے کوئی ۱۴ کتابیں خرید کی جاسکیں۔ والدین کی جیبوں کے لئے یہ بار یقیناً ناقابل برداشت ہے۔

لیکن اس کے باوجود بھی طلبا جب ۸۵۰ الفاظ کی مدد سے بہ شمول ۱۸ افعال کے ہر چھوٹی چیز کے لئے ایک طولانی طرز بیان سے جوں توں اظہار خیال کرنے لگتے ہیں تو انہیں

بیسک انگلش کی مختصر دنیا سے نکل کر نارمل انگلش شروع کرنی پڑتی ہے۔ جہاں انھیں ہر قدم پر بیسیوں نئے افعال سے سابقہ پڑتا ہے۔ بیسک انگلش کا طالب علم جب اس نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو افعال کا یہ روپ اس کے لئے از بس حیرت انگیز ہو جاتا ہے۔ اگر جماعت سوم ہی سے طالب علم نارمل انگلش کی تعلیم پاتا رہے تو دوران تعلیم کے کسی بھی اسٹیج پر اس کے لئے یہ بوکھلاہٹ نمودار نہیں ہو سکتی۔

قطع نظر ان دقتوں کے تجربہ شاہد ہے کہ نارمل انگلش کی تعلیم پانے والا ایک تھرڈ فارم کا طالب علم ایک زیادہ ذخیرہ الفاظ کا مالک ہونے کے سبب جس اطمینان کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کر سکتا ہے۔ بہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ایک بیسک خوان اپنے محدود ذخیرہ الفاظ کے سبب اپنے حریف سے اس دوڑ میں لامحالہ پیچھا رہے گا۔

بہر حال کم سن طلبا کے مسئلہ سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ بیسک انگلش قطعی غیر مفید ہے۔ اسی لئے ضرورت مند مولوی صاحب موصوف کی کوشش سے استفادہ کرتے ہوئے بیسک انگلش کے طریق کار کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

تہذیب کا مستقبل، جنگ اور عہد نامے: یہ دو مختصر رسالے عالمی مسائل پر آکسفورڈ کے رسالوں کے سلسلہ کی انگریزی تصانیف کا اردو ترجمہ ہیں جو علی الترتیب سر آلفرڈ زمرن اور آرنلڈ ڈ میک نیر کی افکار علمی کا نتیجہ ہیں وسیع النظر مصنفین نے موجودہ عالمگیر سیاسی تلاطم کے متعلق رائے عامہ کی رہبری کے لئے عنوانات صدر کے تحت ایک بصیرت افروز معقول بحث پیش کی ہے ترجمہ بھی تصانیف کی طرح کافی رواں اور سلیس ہے۔ لائق مترجم نے حسب ضرورت فٹ نوٹ کے اضافوں سے ترجمہ کی افادی حیثیت کو دوچند کر دیا ہے عوام کو موجودہ سیاسی رو کی انقلاب آفرینیوں سے باخبر رکھنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس قسم کے پر از معلومات مضامین دنیا کی مختلف زبانوں میں طبع و شائع ہوں۔ قیمتیں بھی موزوں ہیں۔ قارئین انھیں پڑھ کر معلومات میں وسعت محسوس کریں گے۔

تعلیم اور دیہات سدھار: آئی ڈبلیو موما صاحب ایم۔ ایس۔ سی پرنسپل اوکیشنل ٹریننگ اسکول انکلیسور صوبہ بمبئی کی تصنیف Education and Village Improvement

سے مولوی اے عزیز فاروق صاحب ام۔اے نے کتاب زیر نظر کو آزادانہ تصرف کے ساتھ جیسا کہ مترجم دیباچہ میں بیان کرتے ہیں اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ مشکل اصطلاحات عمداً ترک کردی گئی ہیں۔ ترجمہ صاف ہے۔ موقعہ بہ موقعہ مترجم نے ضروری فٹ نوٹ بڑھا دئیے ہیں۔ کتاب مصور ہے۔

لائق مصنف نے دیہات سدھار جیسی تحریک پر قلم اُٹھایا ہے۔ جو باوجود بیس سالہ کوشش کے ہندوستان میں آج تک خاطر خواہ کامیاب نہیں ہوسکی مصنف نے اس خصوص میں ایک صحیح نبض شناسی یہ کرتے ہوئے کہ دیہاتی زندگی کی اصلاح دیہاتی ذہن اور ارادے میں تبدیلی کئے بغیر ناممکن ہے اس تحریک کو کامیاب بنانے کی عملی تدابیر تجویز کی ہیں اور اس کے لئے مدرس کو مرکز قرار دیا ہے تاکہ طریق تعلیم میں بعض صحت بخش تبدیلیاں کی جاکر اسکول کے اسباق اور عملی زندگی کے مسائل میں یکسانیت پیدا کی جاسکے جس سے اس امر کی قوی توقع ہوسکتی ہے کہ غیر مقامی بیرونی کارکنون کی بجائے دیہات میں ایک ایسے مستقل مقامی گروہ کی پیدا وار ممکن ہوجائے گی جو اپنی ذاتی تربیت اور پوزیشن کے لحاظ سے دیہاتیوں کے ذہن اور اداروں پر ایک مستقل اور دیرپا اثر ڈال سکے۔ اسی طرح کے صحیح اصول پر اگر عمل کیا جائے تو اس تحریک کا چل نکلنا بعید از توقعات نہیں۔

اس مطلب کے لئے مصنف نے دیہاتی ذہنی تعلیم، حفظان صحت، گھریلو دستکاریاں دیہاتی گھر وغیرہ جیسے مضامین پر محققانہ بحث کی ہے۔ اور تجاویز عملی پیش کی ہیں۔

کتاب چھوٹی تقطیع کے ۳۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی اور مجلد ہے۔ کاغذ اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔

نفسیات اور اصول تعلیم حصہ دوم مولفہ مسٹر ڈبلیو، ام، رائبرن و مترجمہ مولوی عبدالمجید خاں صاحب۔ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ رائل سائز کے ۱۷۶ صفحات۔ طباعت اچھی مجلد قیمت (عہ) کلدار۔

مسٹر رائبرن ام۔اے اور مولوی عبدالمجید خاں صاحب بی۔اے منشی فاضل مددگاران کرسچین ہائی اسکول کھرڑ (پنجاب) کے اشتراک عمل سے فن تعلیم پر درسی کتب کا ایک مفید سلسلہ

شائع ہو رہا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب نفسیات اور اصول تعلیم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ زیر نظر ہے جس میں اصول تعلیم سے بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں تدریس کی ماہیت، اصول اور طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ دوسری فصل میں اکتساب (علم حاصل کرنے) کی ماہیت، اصول اور اس کے طریقوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ آخری فصل میں طبقۂ تحتانیہ کے نصاب سے مختصر سی بحث کی گئی ہے۔ ہر باب کے آخر میں مطالعہ اور بحث کے لئے سوالات دئے گئے ہیں اور کتاب کے آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے۔

طرز بیان موزون اختیار کیا گیا ہے اور مطلب کی وضاحت کے لئے مثالیں بھی اچھی دیگئی ہیں۔ دوسری فصل میں تعلیمی نفسیات کے جدید تجربوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی روشنی میں ایسے اصول بتائے گئے ہیں جن سے تحصیل میں وقت اور سعی دونوں کی کفایت ہوتی ہے۔ اصول تعلیم کی عام کتابوں میں اس طرف توجہ بہت کم کی گئی ہے۔

بعض الفاظ اور اصطلاحات سے ہمیں اختلاف ہے۔ "قانون قریب العہدی" بہت ثقیل ترکیب ہے اس کا آسان اور سادہ مترادف "قانون تازگی" ہے۔ "طریق سعی و سہو" سے صحیح مفہوم ادا نہیں ہوتا اس کے لئے "طریق آزمائش و خطا" زیادہ واضح ہے "کرتے کی بدھیا" ہے تو بہت آسان اور سادہ مگر تحصیل بالعمل جیسی اصطلاح کا پورا مفہوم اس سے ادا نہیں ہوتا۔ "تاثر آفرینی" کی بجائے "اثر آفرینی" بہتر معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ نما کی نئی اصطلاح غیر ضروری معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے لئے اشاریہ پہلے سے عام طور پر استعمال ہے بیجا کی حد تک "اسکول" اور "سٹول" میں الف کی کفایت کچھ بے جا معلوم ہوتی ہے۔

فی الجملہ کتاب دلچسپ اور مفید ہے۔ طبقۂ تحتانیہ کے مدرسین اس کے مطالعے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں خصوصاً اساتذہ زیر ٹریننگ اس سے بطور خاص مستفید ہوں گے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر مدرسے کے کتب خانے میں اس کو جگہ دی جائے۔ (ح ا)

اعلان

ذریعہ ہذا اعلان کیا جاتا ہے کہ دفتر مجلس تعلیم ثانوی کو جماعت پنجم تا ہشتم میں شریک نصاب کرنے کے لئے حسب ذیل مضامین میں کتب درسی کی ضرورت ہے۔ نصاب مقررہ کے مطابق مطبوعہ کتب یا ٹائپ شدہ مسودات ۳۰ آبان ۱۳۵۱ف تک دفتر ہذا پر پیش کئے جائیں۔ مسودات بالکل مکمل حالت میں مع سوالات وغیرہ پیش کئے جائیں تاکہ ان کے شریک نصاب ہونیکی

صورت میں طباعت کا کام فوری شروع کیا جاسکے۔ مطبوعہ کتب کے تین تین نسخے داخل کئے جائیں۔ جس پر مولف کے نام قیمت اڈیشن اور طابع و ناشر کی صراحت ہو۔ پیش کردہ کتب یا مسودوں میں اگر کوئی مسودہ منظور ہو تو اس کی طباعت اور اشاعت حسب قواعد نافذہ دفتر نظامت تعلیمات ہوگی۔

(۱) کتاب اُردو سرسری مطالعہ برائے جماعت ہفتم (۲) قواعد فارسی برائے جماعت ہشتم۔

(۳) سلسلہ کتب اخلاقیات برائے جماعت پنجم۔ششم۔ہفتم۔ہشتم۔

اعلان

ذریعہ ہذا اعلان کیا جاتا ہے کہ دفتر مجلس تعلیم ثانوی کو جماعت نہم اور دھم میں شریک نصاب کرنے کے لئے حسب ذیل مضامین میں کتب درسی کی ضرورت ہے۔ نصاب مقررہ کے مطابق مطبوعہ کتب و ٹائپ شدہ مسودات یکم آذر ۱۳۵۲ف تک دفتر ہذا پر پیش کئے جائیں مسودات بالکل مکمل حالت میں مع سوالات وغیرہ پیش کئے جائیں تاکہ ان کے شریک نصاب ہونے کی صورت میں طباعت کا کام فوری شروع کیا جاسکے۔ مطبوعہ کتب کے سات سات نسخے داخل کئے جائیں جن پر مؤلف کے نام۔ قیمت۔ اڈیشن اور طابع و ناشر کی صراحت ہو۔ پیش کردہ کتب یا مسودوں میں اگر کوئی مسودہ منظور ہو تو اس کی طباعت اور اشاعت حسب قواعد نافذہ دفتر نظامت تعلیمات ہوگی۔

اُردو۔ نویں جماعت۔ درسی کتاب غائر مطالعہ (۱۷۵) صفحے مطبوعہ (۱۱۵) صفحے نثر اور (۶۰) صفحے نظم

دسویں جماعت۔ ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،،

ریاضی لازمی۔ نویں اور دسویں جماعت کے لئے بروے نصاب منظورہ۔ دونوں جماعتوں کے لئے ایک ہی کتاب مطلوب ہے۔

ریاضی اختیاری۔ نویں اور دسویں جماعت کے لئے۔ بروے نصاب منظورہ دونوں جماعتوں کیلئے ایک ہی کتاب مطلوب ہے۔

جغرافیہ۔ نویں اور دسویں جماعت کے لئے۔ ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،،

علم خانہ داری۔ ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،،

مرہٹی۔ تلنگی۔ کنڑی۔ نویں اور دسویں جماعت کے لئے ،، ،، نہم اور دہم کیلئے علحدہ علحدہ کتابیں ہونگی

اخلاقیات۔ نویں اور دسویں جماعت کے لئے ،، ،، دونوں جماعتوں کیلئے ایک ہی کتاب ہوگی

فارسی۔ نویں جماعت درسی کتاب ،، ،، نثر (۱۰۵) صفحے مطبوعہ نظم (۲۰۰) اشعار

دسویں جماعت ،، ،، ،، ،، ،، (۱۲۵) ،، ،، ،، (۳۰۰) ،،

قواعد۔ نویں اور دسویں کے لئے ،، ،، دونوں جماعتوں کے لئے ایک ہی کتاب ہوگی

دینیات لازمی۔ نہم ۔ ″ ″ ″ صرف نہم کے لئے جدید رسالہ مطلوب ہے۔
سائنس۔ نہم و دہم۔ ″ ″ علحدہ علحدہ کتابیں مطلوب ہیں۔

پریس نوٹ از صدر دفتر نظامت تعلیمات ملک سرکار عالی

سال حال وظیفہ یادگار نواب مسعود جنگ مرحوم بہ حساب (۱۰) روپیہ ماہانہ یکم امرداد ۱۳۵۱ ف سے چار سال تک بشرط مسلسل کامیابی بہ امتحان سالانہ سررشتہ تعلیمات کے نان گزیٹیڈ معلمین و معلماۃ واہلکاران کے فرزند یا دختر کو جس نے امتحان عثمانیہ میٹرک منعقدہ ۱۳۵۱ف میں سب سے زیادہ نشانات لے کر کامیابی حاصل کی ہو اور آئندہ کالج کی تعلیم حاصل کرنا چاہیے عطا کیا جائے گا۔

یادداشت

(۱) معلمین و معلماۃ واہلکاران مدارس امدادی بھی بغرض مذکور سررشتہ تعلیمات کے معلمین و معلماۃ واہلکاران میں شامل ہیں۔

(۲) طالب علم یا طالبہ علم کا ملکی ہونا ضروری ہے۔

(۳) ٹکنیکل تعلیم یا بیرون ملک سرکار عالی تعلیم پانے کے لئے وظیفہ نہیں دیا جائے گا۔ پس سررشتہ تعلیمات کے نان گزیٹیڈ معلمین و معلماۃ واہلکاران جن کے فرزند یا دختر امتحان عثمانیہ میٹرک منعقدہ ۱۳۵۱ف میں کامیاب ہوئے ہوں وہ دفتر نظامت تعلیمات سے وظیفہ کا فارم بادائی قیمت ایک آنہ حاصل کر کے درخواست دفتر نظامت تعلیمات میں ختم شہریور ۱۳۵۱ف تک پیش کرسکتے ہیں۔ بیرون بلدہ حیدرآباد کے نان گزیٹیڈ معلمین و معلماۃ واہلکاران کو فارم کی قیمت کے علاوہ ٹکٹ ٹپہ بھی بھیجنے پر دفتر نظامت تعلیمات سے فارم روانہ کردیا جائیگا فقط

(حسب مسودہ دستخطی انچارج ناظم صاحب)

(مددگار ناظم تعلیمات)

H. E. H. the Nizam's Educational Department.

Board of Secondary Education,

No. 2983. *Hyderabad-Dn, Dated 6-10-'51. F.*

Notification.

The Text-Book Committee, Board of Secondary Education, H. E. H. the Nizam's Dominions, will meet in October to consider text books to be prescribed for Classes V to X from June 1943. Books on the following subjects strictly conforming to the syllabus in force may be sent to the Office of the Secretary, Board of Secondary Education, before the 5th October 1943, for consideration by the members of the Committee. Draft books ready for publication will also be accepted and considered. If a draft book is approved it should be printed and published according to the rules issued by the Office of the Director of Public Instruction.

For Lower Secondary Stage.

1. Urdu Supplementary text-book for Class VII.
2. Persian Grammar for Class VIII.
3. Books on Ethics for Classes V to VIII.

For Higher Secondary Stage.

(A)

1. Text books (Prose and Poetry) in Urdu, Telugu, Marathi and Kanarese for Class IX.

2. Text books (Prose and Poetry) in Urdu, Telugu, Marathi and Kanarese for Class X.

3. Theology (Group A, Compulsory) for Class IX.

(B)

For Classes IX and X.

i. Elementary Mathematics. ii. Algebra. iii. Geometry. iv. Geography. v. Domestic Science. vi. Ethics. vii. Persian Grammar. viii. General Science.

Sd/- K. B. Aiyer,
Assistant Secretary.

here that such in formal meetings promote a healthy corporate life and provide ample opportunities for discussion out of class.

Mr. Sajjad Mirza, who was mainly responsible for organizing the refresher courses, deserves to be congratulated on their success. Now that a beginning has been made in the organization of refresher courses, we hope that it will be possible next year to hold similar courses for graduate teachers also. We should also like to suggest the holding of short courses similar to those organized in England every year. These are essentially subject courses, the teachers being divided into groups according to the subject which they wish to study. Here teachers have an opportunity of getting to grips with the problems connected with the teaching of their subject. The value of such short subject courses cannot be overstated, and we hope that arrangements will be made next year to make a beginning with English, Mathematics and Science, which are three of the most important subjects in our school curriculum.

Our New Colleague

We welcome the Rev. S. H. R. James, M. A., to the Editorial Staff of *The Hyderabad Teacher*. Mr. James has been a member of the Staff of St. George's Grammar School since January 1939, after an interesting and varied experience in England and South Africa.

Born in 1901, Mr. James is the eldest son of a late Headmaster of Malvern College, England, who was afterwards Canon of Worcester Cathedral and Archdeacon of Dudley; his uncle was Montagu Rhodes James, late Provost of Eton College, who is famous for his collection of Ghost Stories. Mr. James thus inherits both educational and literary talents, and has in addition wide and diverse interests, which include music (specially community singing and Indian music), philately, tennis, mathematical problems, and railways.

Mr. James won a scholarship at Eton College and later an exhibition at King's College, Cambridge, where he graduated in 1923, with honours in classics and theology later taking his M. A., and being ordained in the Church of England in 1927, after which he held various posts in England and South Africa.

Refresher Courses for Hyderabad Teachers.

Of late the Education Department has been adopting measures to reform the educational system of the State, and as a necessary sequel it has very rightly concentrated its attention on the improvement of the teaching staff in the various schools. The organization of refresher courses in this connection is, we think, a step in the right direction. For the first time in the history of the Department refresher courses lasting in each case for one month were held for the benefit of the undergraduate teachers at Hyderabad, Aurangabad, Warangal and Raichur during the last summer vacation. Elsewhere we have published a brief account of these courses, from which one can get an idea of the work done at the different centres.

The courses were inaugurated by Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, the Hon'ble Member for Education, who in a broadcast talk rightly emphasised the necessity of refresher courses for trained teachers. The inaugural speech of the Hon'ble the Education Member, the talks given by Mr. Syed Ali Akbar, In-charge Director of Public Instruction, by Mr. Sajjad Mirza, Principal, Training College, and Chief Inspector of Normal Schools, and by other senior officers of the Department, proved a source of inspiration and encouragement to the teachers attending the courses.

The syllabus drawn up for these courses was both elaborate and comprehensive We would, however, like to suggest that a refresher course held in the free and healthy atmosphere of the countryside would be far more refreshing than one held in the grim and stereotyped atmosphere of a training institution.

One notable feature of these courses was the organization of study circles, where teachers free from the restricted atmosphere of the lecture room could come together and discuss freely among themselves the various practical problems concerning their profession. It is hardly necessary to point out,

co-workers but enabled her to bring about a tremendous improvement in the tone and efficiency of the schools under her charge, within the all too brief a space of four years.

The formation of the Women Teachers' Association immediately after her assumption of office as Chief Inspectress, the arrangements made for the effective teaching of Domestic Science, the re-organization of the Aided Schools for Girls, and the measures adopted to improve the physique and general health of the girls studying in schools, are some of the outstanding achievements to her credit.

She was ardently devoted to humanitarian activities. She spent a good slice of her salary in providing relief to many a needy girl without distinction of caste or creed. Her part in promoting the War effort was by no means inconsiderable. In the schools under her charge she organized concerts, sales etc., the proceeds of which went to the War Fund. She had a great longing to get herself enrolled as a nurse for active service, but illness intervened and cruelly snatched her away from her varied spheres of activity.

Miss Jessie Nundy joined the Editorial Staff of *The Hyderabad Teacher* in January 1938 and her valued help was not confined to editing the Women's Section. The Editorial Staff has lost a valued friend and colleague, the Education Department an able, energetic and zealous officer, and the social life of Hyderabad a prominent and familiar figure. May her soul rest in peace !

We offer our sincere and heartfelt condolences to Mrs. N. Nundy and the other members of the bereaved family.

that we must from time to time give opportunities to our pupils of recalling the property in one way or another.

All that I have said above is not mere theoretical information but the result of my own classroom experience, and I pass these hints on to my readers, believing that any one who takes the suggestions made herein will not have done so in vain.

Editorial

The Late Miss Jessie Nundy

It is with profound regret that we record the sad and untimely death of our esteemed colleague, Miss Jessie Nundy, on the afternoon of Wednesday, June 10th, at the early age of 36.

She was the daughter of the late Mr. George Nundy, Inspector-General of Registration and Stamps. The Nundy family has been known for its breadth of outlook and culture, and has played a notable part in the social life of Hyderabad.

After taking the M. A. Degree in English Language and Literature at Madras University in 1928, the late Miss Nundy joined the staff of the Mahboobia Girls' School, where she worked till 1930. She then proceeded to England and returned after having taken the Teachers' Diploma of London University. She served at her old school till 1938, when she was appointed Inspectress of Girls' Schools, Hyderabad Division.

She was an officer distinguished for her talents and independence of judgment, for her breadth of view, her sympathetic treatment of her subordinates and her love of school children. Her modesty and suavity of manners not only endeared her to her numerous friends and

state the conditions for the congruence of triangles and find out by themselves which set of conditions fits in. This can be easily elicited from the boys if the constructions be marked in different colours and if the two triangles be drawn again separately.

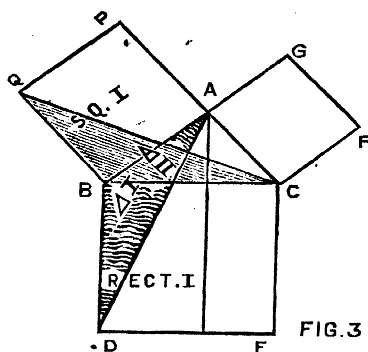


FIG.3

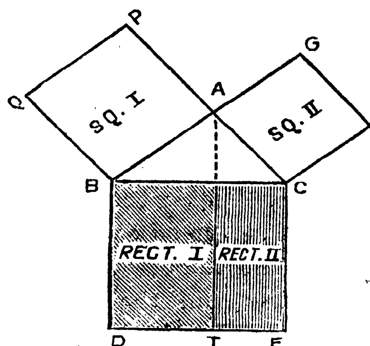
As soon as the boys have proved the two triangles equal in area, question them at once rapidly as to what happens in consequence, and going up step by step arrive at the fact that the square on the hypotenuse is equal to the sum of the squares on the other two sides. All this if done carefully will fit well into just a 40–45 mts period.

The fourth lesson should be the synthetic proof of the theorem, eliciting the reasons for each construction they make. It is a great pity that our modern Geometry text-books are the greatest dictators of all time, in that they never tell us why they join these two points in particular or prove these two triangles in particular congruent. We teachers of Mathematics ought therefore to think about the various constructions, ourselves, and then help our pupils to acquire this questioning habit with regard to the constructions that they may make. I strongly feel that text-books ought never be used by pupils until they have re-discovered the facts themselves under the guidance of the teacher. This is modified Heurism and is an asset to our modern methods of teaching.

The fifth lesson ought to be a test period when the pupils will be questioned not only on the proof of the theorem but on the various constructions, the parts of the proof and simple applications of the property as well.

These five lessons do not certainly bring the study of this famous theorem to an end. The laws of memory demand

that the originator of the proof thought first of dividing the sq. III into two parts and proving one part equal to sq. I and the other part equal to sq. II. Well, tell the boys that the next problem for him was how to divide the square into two parts, i. e. where to draw the parting line. If any boy in the class gives you the right construction, accept it with a good pat on the back and proceed. Otherwise just tell them that the author had perhaps tried at the beginning in some such fashion as they did, but found that those constructions did not take him any further. So he ultimately arrived at *this* construction, viz. Drop a perpendicular from A on to DE, thus dividing the sq. III into two parts. Make this construction in your figure. Elicit from the pupils by suitable questioning that the two parts of sq. III are Rectangles and that if we can prove Rectangle I = sq. I, we may say that similarly we can prove Rectangle II = sq. II and that therefore by adding, sq. III = sq. I + sq. II.

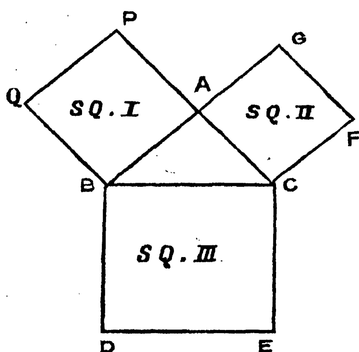


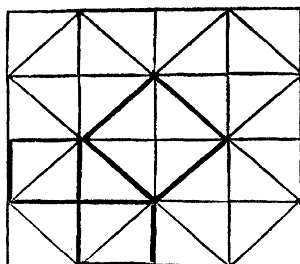
Next ask your pupils if they have so far learnt any method of proving a rectangle equal to a square. The answer of the average boys will be 'No'. Then ask them if they know how to prove two triangles equal in area. 'Yes' will be the spontaneous answer if the teacher has made sure of the previous knowledge beforehand. Then lead the boys to the fact that all that they have to do now is to express the sq. I and rect. I in terms of triangles and prove these two triangles equal in area. Guide the pupils in their search for these triangles into the right construction, and let them prove fully that the triangles they have chosen are halves of the rectangle and square respectively. Then let the class

squaring the sides (numbers) of the triangles they have constructed. If you can procure for your class a good picture of this mighty thinker of Greece, you will make quite an impression on your pupils. It will add to the interest, if the boys be told that Pythagoras was so excited with this discovery that he sacrificed a Hecatomb to his Greek god.

Next let the boys be instructed to draw different rt-angled triangles, complete the squares on the three sides and by proper cutting verify the same property by a third method. This bit of handwork not only serves to free the class from the impression that mathematics, and especially geometry, is a boring and dull subject, but also furnishes the teacher with another instrument, which he may well use, to assure himself that even the backward pupils have grasped the point. Variety of approach is essential to successful teaching, as variety has, apart from its pedagogical utility, many psychological values.

The third lesson should be the Euclidean demonstration, and should be preceded by a very brief introduction to the effect that in Mathematics we explain facts, not by appealing to the senses only but by giving a strictly logical proof as well. Then draw on the B. B. the main figure, viz : a rt-angled triangle with the squares on the three sides completed. Tell the pupils that you have drawn the figure in this particular way for convenience, as they will understand later. Now ask the boys to think with you how they can prove sq. III = sq. I + sq. II. Most probably the class will be silent. Give them time to think (about 1½ mts.) but do not wait too long or you will lose their interest in the lesson. If no answers come forth, tell them





He may not say at once that the square on the hypotenuse is equal to the sum of the squares on the other two sides, but may just tell you that the big square contains 4 triangles and that the two other squares together, also contain 4 triangles. The teacher must accept this crude statement and help the pupil in polishing it to the required degree. It is left to you by judicious questioning, without letting the cat out of the bag, to lead your pupils to the required result.

Let other Rt-angled triangles be taken, the squares drawn and the property demonstrated as before. The boys will now see why you asked them to choose a right-angled triangle in the centre. All this can easily be fitted into one period if the teacher uses well prepared questions.

During the next lesson, let the class be divided into three groups and let them draw triangles with sides as follows :—

1st group	....	6 cm.,	8 cm.,	and 10 cm.,
2nd group	....	9 cm.,	12 cm.,	and 15 cm.,
3rd group	....	3″,	4″,	and 5″.

Let the pupils report to you as to what kind of a triangle they obtain. Most of them will give you the right answer. Write upon the B. B. the three sets of numbers and ask the pupils to find out the ratio of the sides in each case. You will easily elicit the correct ratio. Then tell them that the Egyptians knew about this property, viz. that three lines in the ratio of 3 : 4 : 5 will make a rt-angled triangle, and that long, long ago, Pythagoras, the great Greek mathematician, had most probably remembered this Egyptian construction of a rt-angled triangle (so we read in the History of Mathematics) when he was on the way to his great discovery. Then let the class verify the Pythagorean property by

This having been done, the problem on hand is how to break the ice—how are we to start the whole job? Look carefully into and around your classroom and find out if there is any mosaic with squares and diagonals on the floor or in any other place. Personally, I could not get the mosaic I expected to use, and so used quite successfully the Shahabad stones on the floor of the classroom for this purpose. If even this cannot be found, then construct one on the Black-board, beforehand if possible, and tell your pupils that today they are to play the role of a mathematician, in that they have to discover for themselves, with a little of your help of course, something new. This honour and responsibility you have given them, together with the mosaic which they see in front of them, arouses their interest and makes their intellect keener.

After allowing a pause of about 25 seconds to keep them in anxious suspense, ask one of the pupils to find out any right-angled triangle in the centre of the mosaic. If you are using a floor with Shahabad stones, you will have planned beforehand the necessary number of desks to be moved away to leave enough area for getting the three squares in. Let another boy mark the hypotenuse with a bit of coloured chalk and complete the square on the same. Let two others come forward and complete the squares on the other two sides, using different colours. The use of colours not only helps in understanding the figure better but attracts the eye and draws the attention of the pupils. Then tell the boys that they are to find some relation between these three squares. The boys most probably will not understand what you expect them to do and hence you will have to elicit the meaning of this word "relation" by reference to numbers. Then ask the class to find some such relationship between the three squares. It should not be long before some one in the class will give you the answer, though in his own crude way.

The Theorem of Pythagoras

BY

J. Wellington, B. A. L. T.,

(St. George's Grammar School).

This is a very important theorem having much practical value in everyday life. Most of our boys remember the property of this theorem all right, but the difficulty sets in while proving the same. The reason is chiefly that most of us teachers give the Euclidean demonstration straight away in one lesson, and ask our pupils to learn by heart the general enunciation. Consequently our pupils, not having a proper grasp of the fundamental ideas, fail to retain the proof after they have left the classroom.

We must remember that no theorem as it is enunciated or proved in our modern text-books was so done by the originator. We must therefore take our boys through the laboratory rather than give them the finished product in a summary way. This method of taking pupils through all the stages of a discovery gives pleasure both to the learner and to the teacher. In teaching, Analysis must always precede Synthesis, as the analytic method not only helps the pupil to understand things better but rouses in the learner a spirit of adventure which is the right spirit to be caught by all true lovers of knowledge in any of its aspects.

I give below a few practical suggestions how we teachers of Mathematics could make the study of this theorem of Pythagoras both interesting and easily grasped by our boys.

Before we begin the study of this theorem, we must make certain that our pupils are in sure possession of the necessary 'previous knowledge', that is, know thoroughly the geometrical facts relating to the congruence of triangles and areas of triangles and rectangles.

3. The co-operation of officials of the Wireless, Medical and Co-operative Departments enhanced the usefulness of the course.

4. Mid-summer is a trying time for holding the course.

5. Middle passed teachers should form a group separate from the matriculates, and their syllabus should also be somewhat different, e. g. simpler and with a rural bias.

6. The duration of one month is too short for such a heavy course.

7. Some monetary help might be given to low paid teachers.

---

success. In the study circles, the actual difficulties of the teachers were discussed. In spite of their advanced age, the teachers took a keen interest in the work. While the course was in progress the D. P. I. and the Divisional Inspector paid an inspection visit. The D. P. I. gave an interesting talk on the aims of the course and listened sympathetically to the difficulties expressed by the teachers. During the course the teachers visited a neighbouring rural improvement centre, a visit which proved informative and interesting.

Warangal Centre.—At Warangal the refresher course in Telugu and Urdu was opened by the Divisional Inspector of schools who brought out the need and usefulness of such a course. The conduct of the work in progress was inspected by the D. P. I. and Principal Sajjad Mirza. In a talk they explained the purpose of the course and the special features of the syllabus. Besides the staff of the training school, officers of the Education and Co-operative Departments took part in making the course a success. The Divisional Inspector of Schools kindly awarded two silver medals to the best writers on, "Impressions of the Course" in Urdu, and two more to those in Telugu. This was much appreciated by the teachers. An "At Home" was held towards the close of the course. The D. P. I. was present and expressed his satisfaction at its successful completion.

Significant features of the course.—From the conduct of the refresher courses summarised above, a few points stand out prominently which might be reiterated here.

1. The course proved highly useful in reviving and broadening the knowledge and information of the trained teachers.

2. The Broadcast talks by the high officials of the Education Department proved a source of inspiration and encouragement to all the teachers attending the course.

Hyderabad Centre.—At Hyderabad, instruction was imparted in two separate classes, one for the Matriculation and the Intermediate trained teachers, and the other for the Middle trained teachers with 56 and 57 teachers in the two classes respectively. The majority of these were headmasters of Primary schools. The lecturers were drawn from the staff of the Osmania Training College reinforced by some educational officers at the headquarters. After the completion of the course an examination was held, which was taken by the teachers at the other centres also. The course closed with a farewell party given by Principal Sajjad Mirza, which had the honour of being addressed by the Educational Minister and the officiating D. P. I. The report of the study circle read on this occasion mentioned the difficulties met with by the teachers. The Minister in his impressive speech replied that these difficulties would be considered sympathetically.

Aurangabad Centre.—At Aurangabad the course was given separately in Marathi and Urdu. Opening the course, the Divisional Inspector of Schools made a valuable introductory speech. Various difficulties like the heat of the summer, the lack of the necessary number of copies of the books recommended, a mixed class of middle' and matriculation passed teachers, were surmounted by good preparation on the part of the lecturers and enthusiasm on the part of the teachers. The course ended with a social gathering at which the Divisional Inspector of Schools gave a farewell address. A special feature of the course was a visit to Ajanta and Ellora made possible by a grant of Rs. 150/- which the D.P.I. kindly sanctioned out of his own funds. His visit of inspection was also a source of inspiration to all concerned in the course.

Raichur Centre.—At Raichur the refresher course was conducted in Kanarese and Urdu and was attended by 56 teachers, many of whom were headmasters. The officers of the Education, Medical and Co-operative departments assisted the staff of the Training School in making the course a

3. The Education Code: Circulars.

4. Educational Psychology: Scope; Heredity and environment; Stages of growth; Individual differences; Instincts; Attention and Interest. Fatigue.

5. Methods of Teaching: Aims and value of the subject; Syllabus and Text books; Methods; Correlation; Teaching aids etc.

6. Hygiene: Outlines of Anatomy and Physiology; Personal cleanliness; Posture; Air, water and food. Diseases; Medical Inspection; First Aid. Physical Training: Aims; Syllabus; Games; Tournaments; Playgrounds.

7. Extra-curricular activities: Aims. Activities and their organisation.

Part 11: Practice, comprising model lessons by lecturers, criticism lessons by the teachers, and study circles.

The Conduct of the Course.—The syllabus outlined above formed the object of study in the refresher course for under-graduate teachers held from 21st Khurdad to 20th. Thir, 1351 Fasli, at the Osmania Training College, Hyderabad, and the regional training schools at Raichur, Aurangabad and Warangal. The Superintendents of the Training Schools at Raichur and Warangal and the District Inspector of Schools at Aurangabad were in charge of the arrangements at Raichur, Warangal and Aurangabad, while Mr. Sajjad Mirza, Principal, Training College, Hyderabad, organised and supervised the work at all these centres, besides being directly responsible for the Refresher Course at his own College. On the opening day, the teachers attending the course at the various centres were made familiar with the aim of the course, the syllabus to be studied and the conduct of the work. In the evening they listened with great benefit to the talk broadcast by the Hon'ble Education Member from the Hyderabad Radio Station.

a refresher course the Hyderabad Broadcasting Station also co-operated with the Education Department and made arrangements for broadcasting talks by the Hon'ble Member for Education, the officiating D. P. I. and others.

Broadcast talks by the Hon'ble Education Member and the D. P. I.—In his broadcast talk declaring the refresher course open, the Hon'ble Member for Education stressed the importance of training for teachers. After describing the arrangements made for this purpose in the Dominions, he emphasized the necessity of refresher courses for trained teachers. He suggested that the training institutions should pay more attention to the technique of instruction, and expressed his hope that the newly instituted refresher courses would add to the efficiency of the teachers.

In the other broadcast talk on "The Teaching Profession," Mr. Syed Ali Akbar, the Officiating Director of Public Instruction, set forth the requirements of a successful teacher. He then traced the history of the training of teachers in the Dominions leading up to the institution of the refresher courses. Referring to his visits to the training institutions in the districts, where these courses were being conducted, he expressed his satisfaction at the interest the teachers were evincing in, and the benefit they were receiving from, them.

Syllabus of the Refresher Course.—This Refresher Course for the under-graduate teachers extended over one month and consisted of two parts; I. Theory and II. Practice. The theory part consisted of the following topics:—

1. The School: Its functions; the aims of Infant and Primary schools.
2. School Management: The Headmaster; School and Society; Classification; Time table; Home work; Problem of failures; Examinations; Discipline and its modern conception; Punishments; Training in responsibility; School equipment and furniture; Text books.

The teacher, therefore, who is dealing with normal children, in a homogeneous class (as revealed by there being only one peak in the curve) has in this method a criterion to guide him in setting tests and in marking them. His aim should be the shape of curve as shown in Fig. 1.

Refresher Courses-for Hyderabad Teachers

(Summary of an account published in the special number of the Al-moalim)

On assuming charge of the Education portfolio, the Hon'ble Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur took energetic measures to improve the training and efficiency of the Hyderabad teachers. The Principal, Osmania Training College, Hyderabad, was asked to prepare a report with a view to recognizing the training schools in the districts. This report submitted in 1347 F. made various suggestions, of which the most important was the institution of a refresher course for the trained teachers, so that they could be in touch with the recent educational ideas and practice and solve their own problems. In 1348 F., The All Hyderabad Teachers' Association appointed a sub-committee with the Principal, Osmania Training College, as chairman, and Mr. Prakash Rao, M. A., B T., as secretary, to consider and report on refresher courses for trained teachers. The proposals of the sub-committee were accepted by the conference at Gulbarga. Mr. Syed Ali Akbar, the officiating Director of Public Instruction, took great interest in these proposals and made the necessary arrangements to start a refresher course in 1351 F. Thus for the first time in the history of the Education Department steps were taken to enable the Teachers to improve their methods of teaching, to add to their professional knowledge and to enhance their efficiency. All this was possible because of the interest taken by the Minister, and the efforts of the officiating D. P. I. In popularising the idea of

When these are plotted according to the above scheme, the class distribution curve becomes like that shown in Fig. 2.

The interpretation of such a curve is (*a*) the class is very homogeneous and normal, (*b*) the test was of normal difficulty, and (*c*) the teacher employed a normal standard of attainment in assessing the papers. In fact it is an eminently satisfactory curve, revealing a healthy condition of the class as a unit, judicious selections of the test questions, and correct marking.

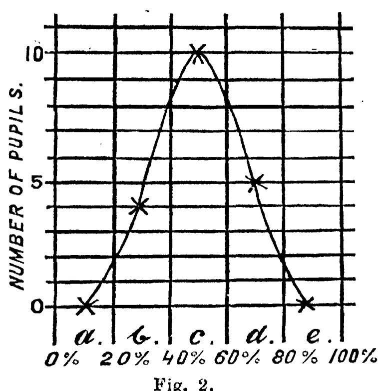


Fig. 2.

Another actual curve contained in the case of a class of 31 students was as shown in Fig. 3.

This curve is abnormal, and reveals a lack of homogeneity in the class, rather than unsuitable test questions or incorrect standards of marking. The two "peaks", one at 40% (average) and the second at 90%, point to the fact that there are two groups of students, virtually two classes at different stages of progress, the weaker group predominating. Such a class is very difficult to teach, and it would be advantageous to do a certain amount of sorting out to obtain greater homogeneity.

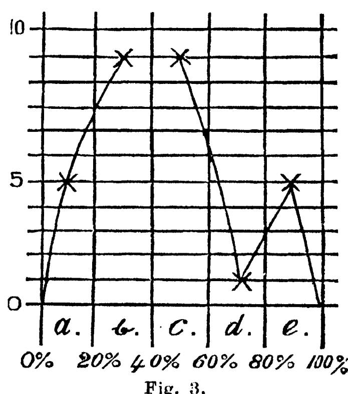


Fig. 3.

It should be remembered that 50% indicates true normality; that the drop in the curve towards the 100% end is normal, and allows for the detection of genius; that the teacher who returns a mark-list with a large proportion of students marked at 90 to 100% has failed either in a wise choice of test material or in his standard of marking.

follows:—2, 22, 52, 22, 2 (Total 100). That is, if we germinate 100 similar fertile seeds, 2 seedlings will appear earlier than the rest; then 22 will appear in the next equal time range, perhaps a day, then 52, later still 22, and finally 2 belated ones. This may not be absolutely true in an isolated experiment, but the larger the number of times it is repeated and the average taken, the closer the results approximate to this law of natural distribution of normality.

If we apply this to a class of children, we should (and do) obtain a similar distribution curve, and the more normal a class is as a sample of humanity as a whole, good and bad mixed with exactly normal ones, the nearer the curve obtained approaches the shape of the true normal.

When plotted, with the 5 classes along a horizontal axis, and the number of individuals found in each class along a vertical axis, the normal curve is as in Fig. 1.

If larger numbers of specimens are being dealt with, say 1000, a more accurate curve can be obtained by using a larger number of groups, say 7, in which case the natural normal distribution becomes 6, 60, 242, 384, 242, 60, 6. (Total, 1000).

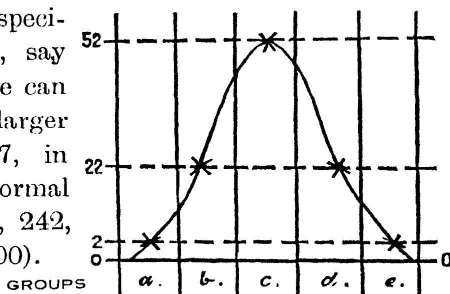


Fig. 1.
Normal distribution curve.

To construct a distribution curve for your class, then, it is necessary first to classify the marks in, say, five groups, viz. percentages lying between 0 and 19%; 20 and 39%; 40 and 59%; 60 and 79%; 80 and 100%.

The following is an actual example, from marks obtained by a small class of 19 students:—

Group	a.	(0— 19%)	0	students.
„	b.	(20— 39%)	4	„
„	c.	(40— 59%)	10	„
„	d.	(60— 79%)	5	„
„	e.	(80—100%)	0	„

(*d*) Irrelevant criteria occasionally sway the assessment, such as spelling errors in science (with the exception of technical words). The test is intended to measure science, not spelling. How far should handwriting determine the mark? Or neatness? What credit should obvious originality obtain?

(*e*) Examiners are subject to "shock" to varying degrees. For some, one "howler" ruins the entire answer. Others pass it over as a slip.

(*f*) And finally what teacher can maintain an unvarying standard throughout a set of class exercises? The effect of a good paper after a very poor one and vice versa, accounts for a considerable variation in marking standards. To minimise this effect, method (4), above, is a great help.

Finally, when all the exercises or test papers have been marked, how is a teacher to know whether his entire standard of marking has been too strict or too lenient? He cannot usually prevail upon the good-nature of his follow-teachers to assess the same work separately, so that he may compare his standard with that of others.

If he will occasionally take the trouble to construct a "distribution curve" of the marks obtained by the pupils of a class, he will discover for himself several important and interesting facts in this connection. It will at once answer his query about his standard of marking, and reveal besides something about the homogeneity of the class as a whole.

The distribution curve is a direct corollary of the Law of Averages, which holds sway throughout nature. In fact it is from natural criteria such as the correlation between two inter-connected variables, like the height and weight of children, time of germination of similar seeds etc., that the ideal, or "natural" distribution curve is constructed. Thus if we take 100 specimens, and classify them in, say, five groups, ***a***, *b*, *c*, *d*, *e*, of equal range, we find the distribution falls as

essay is 45 for subject-matter, 20 for style, 30 for grammar and 5 for writing. This also tends to avoid subjectiveness in marking.

(4) For science, geography and history, where facts, laws, formulae and their application have to be assessed, it is a good plan to draw up a schedule of "markable points" for which the teacher looks in the exercises. This brings home very forcibly to a student a habit some develop of omitting to complete all parts of science questions.

(5) Marking by general impression is about the only adequate method for art subjects. It is good also for essays and is quicker than (3) above, but leaves the learner where he was as regards improvement in future attempts.

If teachers adopt some such methods in marking, there should be less danger of subjectiveness. This may result from a number of causes, such as,

(*a*) The teacher's knowledge of a pupil's reputation in his own, and even in others', experience. This is particularly noticeable in both the best and the worst students. Average ones suffer less from the tyranny of their own reputation.

(*b*) Examiners' own opinions, prejudices, etc., affect them, many becoming unconsciously influenced by the latest book they have read on the subject. Maths suffer least from this type of subjectiveness.

(*c*) Vagueness of what is really being asked in the question leads to wide subjective differences in the marks given to the same work by different teachers. Such subjects as appreciation of poetry and essays suffer worst, as examiners cannot agree upon what points are to be considered important.

teacher and children. It is far better to search for the cause of the errors, and to point this out. This is constructive; meticulous mass corrections may not be. In any case it is essential, however much correction is attempted, *to go over it with the pupils.* No exercise or test question should ever be left without a specimen answer being given when the corrected work is returned, and attention drawn to typical errors, especially as to the scope of the question, the relative value of its various sections, and the sources of error through careless reading leading to misunderstanding.

Should marks be given for homework? Naturally marks must be given for class tests and exercises, in order to gauge the relative progress of the pupils, but such work is performed under conditions very different from homework. No extraneous help can be obtained in the class (provided the teacher is vigilant!), but this is not true in the case of homework. It has been found by careful observers that there is much less urge to cheat if no marks be given for homework, or that at least they should not be counted in fixing a child's class position. A more honest, unaided attempt is then made by the pupil, for his own satisfaction, to prove to himself whether or not he has mastered the work taught; and so dishonesty is minimised.

We may now consider some different methods of assessing test work in various subjects. Very few subjects can be assessed in the same manner.

(1) The work may be compared with an ideal performance, plus bonuses for originality. This is suitable in maths, where the ideal is easily recognised.

(2) For languages, again comparison with an ideal answer may be made, with deductions for errors.

(3) In essay work, a method of much value to the learner, is to use sub-totals in arriving at the value. A suitable distribution, out of a 100 marks, for an

The Marking of Exercises and Examinations

BY

R. S. Hughesdon, B. Sc., C. C. T.,
St. George's Grammar School, Hyderabad-Dn.

Every teacher probably adopts some scheme of his own for assessing exercises, homework and examinations, depending on a number of factors, amongst which may be enumerated subject-matter, size of the class, time available, probable effect on the pupils, and not least, the interest the teacher himself takes in the subject concerned.

There are, however, basic principles which may be profitably followed even in such a thing as marking and correcting students' written exercises.

First of all we should recognise that there is a fundamental difference between exercises such as are set for homework or a part of a lesson, and examinations, especially School Final examinations and the like, the scripts of which are not again seen by the students. For the latter, assessment only is essential; for the former some degree of correction as well.

For the purpose of the practical teacher this matter of correction and marking presents more problems and debatable points, such as, should the exercises be fully corrected, from every viewpoint; e. g. should English (or language) errors be corrected meticulously in science, geography or maths ? May not the total effect of such a mass of corrections stagger the child, causing him to lose sight of the corrections of subject-matter, if not discouraging him unduly ? Would it not be better to concentrate on one or two points at a time, even in language subjects ?

How much time a teacher should spend over corrections is a moot point, but it is coming to be considered, as the result of experience of thoughtful educators, that it can be overdone, and so become a source of waste of time for both

the conditions laid down by H. E. H. the Nizam's Educational Department for such candidates, and the required permission, where necessary, is obtained from the Director of Public Instruction and communicated to the Secretary along with their applications.

(6) An admission fee of Rs. 12/- will be levied from each candidate.

(7) Candidates appearing for the examination for the first time must take their examination in all the six subjects under Group A; and in at least *one* subject under Group B.

(8) Candidates failing to pass the examination in not more than three subjects may reappear at any subsequent examination in those subjects only, provided they are taken together. They will then be declared to have passed the examination in the 3rd Division if they secure the required pass marks in each subject.

(9) The papers set at the Examination will cover the courses prescribed for Classes IV and V except the language papers, in which subjects the examination will be held in the course prescribed for Class X only.

(10) Telugu, Marathi, Kannada or Tamil as an alternative to Urdu may be offered till 1355 Fasli (1946) by pupils whose medium of instruction is English.

Copies of the Examination rules can be had from the Office of the Secretary, Board of Secondary Education, at 4 As. a copy.

Note :—Girls may offer Domestic Science in place of General Science.

Group B Optional.—One of the following subjects. i. A Classical Languge (Arabic, Persian or Sanskrit) ; ii. A Modern Language (Telugu, Marathi or Kanada) ; iii. Algebra and Geometry ; iv. History of England ; v. Domestic Science or General Science (for girls only) ; vi. Theology ; vii. History of Islam.

(2) The Public Examination under these Rules will be held for the first time in 1352 Fasli (1943) and every year thereafter. In Khurdad 1352 Fasli the Examination will be held only for Osmania High School pupils and from 1353 Fasli onwards for all High Schools in the State.

(3) For the present the Examination will be held at the following centres :—

Hyderabad, Aurangabad, Warangal, and Gulburga.

(4) *a.* A candidate who has appeared and failed at the Higher Secondary Certificate Examination of the Board as a pupil candidate from a recognised institution may appear as a private candidate for the Examination in a subsequent year.

b. Candidates who have failed in the Osmania Matriculation Examination will be allowed to appear at the Board's Examination as private candidates till 1354 Fasli and those who have failed in the H. S. L. C. Examination of the H. S. L. C. Board, till 1355 Fasli. They shall for the first time offer all the subjects prescribed for the Examination.

Such candidates should send in their applications through the Head of a recognised High School in the prescribed form, together with the examination fee, so as to reach the Secretary not later than the 15th of Bahman preceding the date fixed for the next ensuing examination.

(5) Teacher candidates will be allowed to appear for the examination as private candidates provided they satisfy

what the piece as a whole means, or, in other words, "they are so much occupied in examining the arches, pillars and windows of a building that they do not know what the building itself is like."

When a piece has thus been thoroughly examined, the pupils may be asked to read it aloud, provided they can do it with skill; but, if they cannot, this will not do them much good. But before this a few general questions bearing on the topic should be asked, as these will enable them to recall and review what they have learnt. Two or three pupils might be asked to give a coherent account in their own words of the important portion of the piece. Thus some of them will get practice in oral expression too, for oral composition with the young should always precede the written.

Rules for the Higher Secondary Examination, Hyderabad Deccan.[1]

A press communique relating to the revised scheme of Secondary Education was issued on 23rd Shahrewar 1350 F. in which it was stated that the Board of Secondary Education would conduct a public examination every year at the end of Class X, to be called the Higher Secondary Certificate Examination. The following are extracts from the rules for the Examination approved by Government.

(1) The following are the subjects of study prescribed for the Examination :--

Group A Compulsory. i. Urdu (Arabic for candidates who take up Theology under Group B); ii. English; iii. Elementary Mathematics; iv. General Science (including Physics, Chemistry and Biology). v. Indian History, Civics and Geography of the World; vi. Religion (for Hanafi boys and girls) or Ethics (for others).

1. We have received this note from the Office of the Secretary, Board of Secondary Education for publication.

It is important to remember that a reader gets out of a piece of prose what he takes to it in the form of experience and ideas. It is quite plain that we cannot think of a new thing or understand it unless it is explained to us in terms with which we are familiar. The material needed for the formation of this mental picture is drawn from the storehouse of our experience and ideas. If we had no experience or no ideas then we should not be able to think of anything at all. Hence the wider our experience, the better are we able to understand a thing. But the children with their scanty knowledge and narrow experience cannot be expected to understand and form a mental picture of things, as do the adults. Whatever experience they have, they do not know how and when to use it. Hence the need for some device on the part of the teacher which may stimulate their ideas and enable them to make the best use of the material they have at their command. This can be done either by showing some picture or pictures relating to the subject, or the map of the place under discussion, or by comparing and contrasting it with things familiar to them. Dramatic narration, too, on a suitable occasion, is of immense use.

One of the best ways of keeping the pupils mentally alert is to keep up their interest in the piece by giving them a chance to recall their own experience and ideas, which will give full value to the vital words and phrases in the passage. This activity on the part of the pupil is quite essential if any good is to come out of their learning their lessons, for it is quite evident that a teacher cannot learn for his pupils, nor can he force knowledge into anybody's mind. It must grow within him out of his own experience and mental activity, and the teacher's main function is to stimulate this activity.

One thing which should be noted is that while going into the details the teacher should not lose sight of the main idea underlying the piece as a whole. Experienced teachers are apt to commit this mistake sometimes, and are so careful in going into every possible detail that they totally forget

(if it is meant to be studied) unless they have thoroughly grasped its meaning, for such reading will divert their attention from it. Again if they cannot read a piece with good, clear enunciation, with phrasing and emphasis to express their appreciation of the meaning and with proper modulation to express their sympathy with the writer, then this reading aloud will be nothing but futile and a sheer waste of time. But as it is necessary to give the pupils a general idea of the piece, without previously taking them into details, the teacher should read it slowly and carefully so that they may not have any difficulty in following him.

When the passage has been read once, then attention should be drawn to the important points in it so that the pupils may think out fully the meanings which they were not able to understand before. But previous to this a wise teacher will try to find out what ideas they have formed from the first reading, and thus will be able to correct the errors in the course of a discussion that will follow.

Next comes the study of words and phrases. The pupils can be asked to refer these to a dictionary, or the teacher can explain them in the course of the lesson. But care should be taken that these words are not dissociated from the text and that the isolation method is avoided. Special care should also be taken in the choice of a dictionary, for those which we ordinarily come across give an epitome of the meanings of words, and that too in an abstract way. We need dictionaries which vividly explain words and phrases in the simplest language possible and illustrate them fully. In case such dictionaries cannot be had, the teacher might be referred to, so thathe may explain either by comparison or contrast, by means of illustrations and sketches, or by reference to roots in the case of cognate words. The aim which should always be kept in view is to make the meaning as clear, as real and as active as possible.

have been condemned, and due emphasis laid on what is called the Demonstration Method of teaching English. This method stands in sharp contrast to the Lecture Method, and, though it does not differ essentially from the Direct Method, yet the fact that it lays sufficient stress on the active participation of the child in the lesson should prove of immense help in effecting a marked improvement in the standard of English in our schools.

The Study of a Piece of prose

BY

Khwaja Md. Yusufuddin, M. A., LL. B. (Alig.), M. A. Ed., (Leeds).

Lecturer, Osmania Training College.

The most important thing which strikes the student of the new method is its stress on the mental activity of the pupils and its abhorrence of allowing them to remain passive absorbers. To attain this object, an interest should be created in the topic from the very start, and this can be best done either by examining the title of the lesson and seeing what thoughts it suggests, or by asking a few questions on those experiences of the pupils which have a bearing on the topic under discussion, or if it happens to be a continuation of the previous lesson, then two or three appropriate questions might be asked to remind the pupils of what they have done before, and make them see that the new is growing out of the old, and both (or all) of these methods of approach might be put together form a continuous whole. Then comes what is called the pattern or model reading by the teacher.

It is quite essential to note that reading with the object of understanding a passage is quite different from reading aloud. We may read aloud a whole passage without understanding anything, or at the most may be able to gather just a vague idea of its meaning. When such is the case with grown-up people, we have to be very careful in the case of children. They should not be made to read aloud a piece

1. The teaching of formal grammar.

2. The method to be used with regard to the teaching of English.

Of late the matter of teaching formal grammar has been receiving serious attention, and even in England the pendulum has swung back in its favour. It cannot be doubted that the deterioration in the standard of English in our schools is due in no small measure to the entire neglect of the teaching of formal grammar. This has been chiefly due to the erroneous belief that the adoption of the Direct Method makes the teaching of formal grammar superfluous. How sadly we have been disillusioned with regard to this is amply borne out by the decline in the standard of correct English in schools. The decision to reinstate formal grammar, therefore, as a regular subject in the school curriculum is indeed welcome. If grammar is taught systematically and on Inductive lines in co-ordination with composition, it must certainly help to improve the standard of English to a considerable extent.

Of no less importance is the question of the method to be used in the teaching of English. The so-called Direct Method has never been used on proper lines, and in ninety-nine cases out of a hundred it has been found to degenerate in actual practice into what we may call the Lecture Method. One has simply to enter any class-room from the Matriculation class to the lowest class to see that our teachers actually lecture the children irrespective of their standard and age, when they ought to be teaching them. The children sit in the class tongue-tied, as mere passive listeners, and are given no opportunity to take an active part in the lesson. This lecturing, which has been going on for years in the name of the Direct Method, has done to our pupils incalculable harm even more than we can attribute to the neglect of formal grammar. It is, therefore, but appropriate that the Lecture Method should

test whether the pupils can use for themselves the language forms presented in their text-books independently of the material through which they are presented.

17. Debates in English should be regularly held in every Secondary school, and minutes be kept.

Method to be used in the teaching of English.—In place of the traditional 'Lecture Method,' the 'Demonstration Method' should be adopted, the salient features of which are as follows :—

1. Use of pictures, illustrations and other concrete devices to make the lesson interesting and impressive.

2. Drilling, more drilling and still more drilling to be done with regard to pronunciation, spelling and the use of words and phrases.

3. Questions and answers should predominate.

4. Dramatisation should be used extensively, wherever and whenever possible.

The advantages of this method are self-evident, and it is to be hoped that every teacher of English will make it a point to adopt it in his day-to-day work in the class room.

There is nothing new in these instructions; they are all old familiar things which have been put together with the specific object of placing the teaching of English on a more rational and practical basis. There can be little doubt that if these instructions are carried out by the teachers carefully they will help to raise the standard of English in schools considerably. Every suggestion embodied in these instructions, it must be recognised, has a definite place the importance of which cannot be overstated; but there are two points which stand out prominently above all others.

8. Marks given in these tests should be entered in the marks register of each class, and should be signed by the headmaster and the teacher concerned.

9. Special attention should be paid to handwriting, and pupils from Class III to VII should be made to transcribe at least two lines daily.

10. Written work should be set in all English classes in accordance with a regular time-table, a copy of which should be hung up in each class. The headmaster should take steps to ensure that all written work is corrected with due care by the teachers concerned.

11. Every pupil should have for home-work at least two exercise books of fairly large size which should suffice him for a whole year.

12. Care should be taken that the home-work books are kept neat and clean, and that neatness in all written work is strictly enforced.

13. The teaching of formal grammar should receive special attention in the Middle and High school stages of instruction, but at the same time the teacher should try to make the grammar taught function in the pupil's English.

14. As far as possible, each class should have a library of well-chosen books suitably graded and within easy access of the pupils. Every student from Class V onwards should be made to read extra books in English, the minimum number of books being fixed for each class and pupil by the headmaster in consultation with the teacher in charge.

15. Every pupil after the Primary stage should be encouraged to possess a suitable dictionary, and should be taught how to use it.

16. The question papers in English should not deal with mere reproduction of summaries or stories, but should

3. The actual work in every class should, as far as possible, follow the detailed scheme laid down for any particular month; but if for any reason the work in any month is not completed, then this should be made clear in the progress report, which should be sent on a printed form to the Inspector of English at the end of every quarter of the academic year. There will be three such reports, to be divided and sent as follows :—

i. Aban.

ii. Isfandar.

iii. Tir.

4. Every class from V onwards should maintain a marks register, in which the marks of each pupil should be set out in the following manner :—

1. Name of the pupil.
2. Prose.
3. Poetry.
4. Reading aloud.
5. Translation.
6. Composition.
7. Grammar.
8. Dictation.
9. Written Work.

5. There should be short and quick tests in all the subjects enumerated above except 'written work,' the marks for which should be allotted by taking a whole month's work into consideration.

6. The tests should be held during the last two or three days of each month, and should be partly oral and partly written.

7. For the sake of convenience 10 marks should be the maximum for each of the subjects in which the pupil is tested.

A Few Suggestions for Improving the Teaching of English

BY

Salim Bin Sayeed, B. A., Hons., M. Ed., (Leeds).

Since Urdu was adopted as the medium of instruction in all schools and colleges connected with the Osmania University, English has been reduced to the position of secondary importance, with the result that its standard has fallen. For some time past the Education Department has been paying close attention to the problem of English teaching, and has not hesitated to adopt measures of even a revolutionary character. To quote one recent example, Basic English was introduced in about 150 selected schools of different grades in the hope that it would help to raise the existing standard by an appreciable degree. But, after the experiment had been conducted for over two years, it had to be abandoned as it did not prove a success. The position, therefore, with regard to English in schools is not too happy. In the majority of the schools where normal English is taught, the standard of attainment is not all that could be desired, while schools which were following the Basic English system, having been switched over to normal English again, have added enormously to the difficulties already existing. The Department is thus confronted with the problem of adopting effective measures which should lead to an all-round improvement in the teaching of English. This it has done by preparing a code of instructions, reproduced below, for the guidance of all the teachers of English in schools.

1. *Instructions to the Teachers of English.*—Teaching notes should be prepared regularly, containing illustrative devices, questions, and any other point which the teacher might like to mention.

2. The work in English pertaining to every class should be planned in detail for the whole academic year. A copy of the scheme of work should be put up in each class, signed by the headmasters and the teacher in charge.

poured out, and the biggest and greediest boy began to push through the group towards it. But some one whispered, "Miss X should have it," and after a little more whispered consultation it was brought to the teacher. When she suggested that all the girls should be served first, a hungry stare was reflected from every boy's face at this upside-down arrangement. At any rate, after the girls the boys' turn came, and the teacher observed that all sorts of awkward manipulations of cups and saucers were going on, while they drank tea with loud and gustatory smackings of the lips such as would never be tolerated in decent society. So they had great fun in practising an easy but firm hold of the china, and a quiet manner of drinking the tea. It was pathetic to see how the rest tried to carry out the instructions given to the previous group. One boy, however, was a real butterfingers, for in trying to hold the handle of the cup as daintily as possible he entangled his thumb, and the cup fell to the ground with a resounding crash. There was instant and complete silence, and the boy who was responsible stood trembling in a corner. They all came to help in removing the broken pieces.

A keen observer will not fail to notice the tremendous amount of social training the group of children received in these weekly tea-parties. By one activity they were trained to be patient, considerate, obedient, industrious and generous. All this is possible only as long as the children are pliable enough to be moulded in whatever way the good teacher likes.

as in the realm of intellect, the teacher must have a definite place and essential functions assigned to him. "He with his superior knowledge and powers and personality is himself a constant and most important element in the environment, and exercises his influence indirectly by suggestion and example rather than by precept and command".

The power of moral and social ideas depends on their being learnt from first-hand experience. Here is the true sanction for the practice of throwing the onus of school government upon the governed.

A simple experiment tried in a class of Indian children in a Primary School will bear testimony to the immense value of the Play-way in social training.

It so happened that the teacher proposed to hold a weekly tea-party if the children did their class work neatly and well. The response was so immediate and uproarious that order had to be restored. The teacher said, "Do you like it so much? Well, to tell the truth, I don't think I could afford it every week, children". "Well," said a leader, "Let us each give something every week, and have a fund. I shall be treasurer, and write it all in a book."

A small sum was agreed upon. The teacher said, "Children, that will be easy for some, but when some of you go home and ask for money your mothers will give you angry answers." It was then suggested that everyone should collect rags, bottles and old newspapers, and sell them; and, if they could pick up stones and papers in the school compound every day, the headmaster would be glad to pay them a little. The class then provided themselves with cups and saucers by selling the product of their carpentry class, and decided to have a weekly social.

The teacher, knowing the custom of many Indian homes that the men and boys be served first, was anxious to see what would happen at their first tea-party. The first cup was

Play-spirit in the Formation of Character

BY

Syed Asaduddin, B. A., LL. B., T. D. (London.)

One of the oft-repeated, but most neglected ideals of education is the formation of character. Teachers of the old school of thought endeavoured to force in good character, as if it were a pill, by administering doses of admonition or by the application of the birch to the pupils' delicate shoulders; but it has now been realised that neither cart-loads of birches, nor volumes of books on ethics can achieve half as much as an hour's practical training in morals and conduct by the personal contact of the teacher in the playground. It is being recognised more every day that for the pupil to become interested in the educative process he must be encouraged to take an active part in it. He should be made to do things rather than read about them. Open-air schools, school journeys, nature study in the fields, and gardening work at school, all exemplify this revolt against bookishness. Training in character can similarly be accomplished by the application of the doctrine of self-activity, with the help of the teacher as a directing spirit. With a view to making education a happy process the teacher should get out of the grim atmosphere of the class-room and come into personal contact with his pupils in a more informal manner on the playground, in the school theatre or at a picnic party, where, by precept and example, he can set the ideal before the boys, who will imbibe it without any conscious effort on their part. But this entails great responsibility on the teacher. If he is idle, unpunctual, irregular, or unmannerly, the contagion will spread among the boys, and personal contact will do more harm than good. The teacher should be an ideal citizen, at least for the sake of his boys, and should try to improve the pupils' conduct without any fussy interference. Of course, home influence cannot be too highly estimated, but outside his home the personal character of the teacher is the most powerful influence brought to bear on a child. In the realm of conduct

University is concerned, the revised scheme for the educational reorganization provided that after passing the Higher Secondary Certificate Examination, students should join the Previous Class to be opened in selected High Schools and then proceed to the University for a three-year Degree course. But as the University is opposed to this idea, it is likely that it will maintain the *status quo* for some more years to come.

It is interesting to note that in the meantime the Delhi University has decided to introduce the three-year Degree course next year. If, in course of time, the example set by the Delhi Univerity is followed by the Madras University, there will be no difficulty in giving effect to the original recommendation of the Mackenzie Committee for lengthening the school course by one year, abolishing the Intermediate Examination and introducing a three-year Degree course in the Osmania University. Such a scheme, if worked on proper lines, will no doubt help to raise University standards, as the students, when they enter the University, will be of a maturer mind and, therefore, be better able to benefit by University education than is possible for them under the existing conditions.

Editorial

Educational Reorganization in Hyderabad.

The process of reorganization of Secondary Education which commenced in the Hyderabad State four years ago, has not been completed yet. The developments which have taken place during this period are briefly as follows :—

The scheme for a four-year Lower Secondary and a three-year Higher Secondary course was introduced gradually in the Lower Secondary stage of the Osmania Secondary schools during the period 1938—1940. This scheme did not affect the English Secondary schools, which continued to follow a three-year Lower Secondary and a three-year Higher Secondary course and to prepare their pupils for the H. S. L. C. Examination. Many difficulties arose in the working in practice of the new scheme as a result of the existence of the dual system of education. Therefore, last year Government sanctioned the proposal of the Board of Secondary Education for amalgamating the two systems of education and introducing uniform courses of study for all Secondary schools with a common examination at the end of Class X or the 10th school year. The idea of holding a public examination at the end of the Lower Secondary stage or Class VIII has also been dropped. Under the revised scheme, Forms I to IV of the English Secondary schools were converted into Classes V to VIII in June 1941, while Forms V and VI will be changed into Classes IX and X in June 1942 and June 1943, respectively. Therefore, next year with the conversion of Form VI into Class X and the disappearance of the H. S. L. C. Board, the entire field of Secondary education will have been brought under the control of the Board of Secondary Education. This Board will hold the first Higher Secondary Certificate Examination in April, 1943 for the students of the Osmania High Schools, while the students of the English High Schools will take this examination in April, 1944. So long as English is permitted to be the medium of instruction, question papers at the examination will be set both in Urdu and English, and candidates from selected English High Schools will be given the option to answer them in English.

The original scheme of a eleven-year school course has been abandoned chiefly because of the imperative need for the abolition of the dual system of education. So long as the Nizam College remains affiliated to the Madras University and so long as that University continues to have a four-year course, it is not possible to introduce a eleven-year course common to all Secondary schools in the State. As far as the Osmania

Review

Suggestions for the Teaching of English Pronunciation and Spelling in India

BY

Henry Martin.

(Oxford University Press—Price Rs. 2/8/–).

The problem of learning English pronunciation and spelling has always presented insuperable difficulties to our students. Mr. Henry Martin, who has considerable experience of teaching in India, has brought out an excellent book on this difficult subject which should prove of great value to all of us. The author has laid down certain well defined principles, both with regard to pronunciation and spelling, which will facilitate the process of learning English to a considerable degree. One helpful feature of the book is that no phonetic alphabet has been used, but instead the author has made use of the alphabet suggested by the English Simplified Spelling Society with a few modifications. This has made the task of learning pronunciation easy, precise and consistent. It is an excellent book and ought to appeal to every student of English.

S. B. S.

Obituary

We deeply regret to announce the death of Lieut. W. B. Philip, son of Rev. F. C. Philip, Warden, St. George's Grammar School. The late Lieut. was killed in action in Malaya while fighting the enemy against heavy odds. May his soul rest in peace !

His death is a stunning blow to his parents but, at the same time it provides, for the youth of our country a very fine example of devotion to duty, courage and sacrifice.

Rev. Philip's colleagues on the editorial staff of *The Hyderabad Teacher* offer to him and Mrs. Philip their heartfelt sympathies, which they are sure will be shared by all the readers of this journal.

13. Develop respect for womanhood and motherhood.
14. Significance of sex and its implications.
15. Fair play between the sexes.
16. Danger of venereal diseases and how they are contracted.
17. Creation of moral stamina.
18. Meaning of love, marriage, home and family.
19. Happiness in marriage and the home based on purity of the family life.
20. Racial and social values of a pure home.
21. The facts of prostitution and of venereal diseases as they bear upon health and personality.
22. Obligation of purity assumed of young men and women alike in marriage.
23. The place of chivalry and respect of boys and men in dealing with women and girls at all times.
24. Prostitution an organised business of indescribable degradation and degeneracy alike to women and men.
25. Problem of self-control before marriage and after marriage.

Special courses in Social Hygiene Education for teachers and parents in Teachers' Training Colleges and Training Schools. No Sex Education in special courses for children, but through nature study and biology and other courses.

No. 17. Social Hygiene Education and *family*. This is the most important point of all the Established 17 points of Social Hygiene Education.

"Conclusion. These 17 points represent the aims and demonstrated results of sex education as it stands after more than 30 years of honest trial. They are firmly established as the accepted guides for the larger sex education (social hy edn) as its leaders are now (1937) planning its further progress. The many years of study and trial have developed the fundamental principles and ideals of sex education. The task for future years is to make its ever necessary lessons available to all young persons of each generation that is to come".

(Out of these 17 points, courses of study for teachers are developed.)

Some further points taken from Sex Hygiene Chart.

1. Parent to answer honestly questions asked by the child.
2. Possession of some fundamental facts necessary for children. These facts can be related through the medium of the story.
3. Establish in the mind of the child the true relationship between mother and Child.
4. Explain the egg and chic relationship.
5. Explain sex organisation of plants.
6. Need for an active and vigorous life of the child.
7. Life histories of animals and plants.
8. Biological explanations or physiological functions.
9. Personal Hygiene.
10. Need for development of self-respect in the child.
11. Moral obligation to self, family, community.
12. Discussions with children on questions relating to standards of morality.

No. 4. *Tasks.* Five in number :

(1) developing respectful and scientific attitude
(2) supplying knowledge for healthful, effective living
(3) developing social, ethical, eugenic aspects
(4) appreciation of home and family life
(5) instruction to adolescents.

No. 5. *Problems* for sex education.

No. 6. *Education* for control by intelligent choice.

No. 7. *Control* of sex conduct—what these controls are.

No. 8. *Instruction,* early and progressive. But given in a natural manner.

No. 9. Opportunity and responsibility of the *Home.*

No. 10. Social Hygiene in *other course of study,* including health education, character development, etc.

No. 11. Starting the actual Social Hygiene Education *in nature study and biology.*

No. 12. Teaching *sex ethics* and *moral standards.*

No. 13. *Literature and Ideals,* stressing moral and aesthetic attitudes for controlling conduct.

No. 14. Emphasis on the *normal* forms of sex expression. Not the abnormal.

No. 15. *Achievements* of sex education. 7 specific achievements listed.

No. 16. Social Hygiene Education *not all-sufficient.* As general education often fails to make good citizens, Social Hygiene Education also has its failures. Social Hygiene Education points the way; it is then up to the individual to decide the way he shall adopt.

If we look under the subject, Blindness on page 732, Vol. 3, 14th Edition, Encyclopaedia Britannica, we shall read a statement by an authoritative ophthalmologist which tells us that of all cases of human blindness, 50 per cent are due to the germs and micro-organisms of venereal diseases, acquired or inherited.

What a calamity for a child to be born blind and have to go through all its life that way! This boy, like innumberable other innocent little children, will never see the light of the shining star, the glow of the evening sunset and his mother's face.

We as educators should lift our eyes to the high heavens and pray for the day of complete eradication of such diseases, the effects of which fall upon the innocent, helpless babes.

But hope and faith are not enough. We must have works. An office clerk was late, as usual, getting to his employer's office. The employer pointed to the office clock. The clerk pulled out his watch and said: "I shall never have faith in this watch again". The employer replied: "It isn't faith you need in that watch but works". The following 17 'Established Points' represent a programme of work in Social Hygiene Education:—

No. 1. *Definition and Scope* of social hygiene. Under this heading we find a group of health and welfare problems (physical, mental and social) which have a direct or indirect origin in the phenomena of sex and which concern the family as the basic unit of society.

No. 2. Deals with the *name* of Social Hygiene Education and tells us that it means the same as Sex Education if we take the latter name in its broadest sense.

No. 3. Gives us the general aim, which is directed towards the best possible development of all physical, mental and social aspects of life. . . . .

Finally, one day, when the mother was tired and foot-sore from so much walking—for the child was more anxious to find the tree than was the mother—the mother took the little girl to her bosom and said: "None of those trees are pretty enough for my little daughter" and then proceeded to tell her the true and sensible answer to the innocent and sensible question.

When the mother finished, the little girl seriously remarked: "I thought so, because if I came off an apple tree, some one would eat me up".

A quite different story is related about a boy of 7. He was overheard telling another boy of similar age. Says he: "Harold, I wonder if you know what I know?" Harold asked what it was, and this 7 year old boy proceeded to say: "Well, my big brother (who was 9), "There ain't no Santa Claus, there ain't no Devil, there ain't no Stork—its only our daddies".

Ladies and gentlemen, there is a real point in telling children the truth. We all know of calamities and tragedies arising out of sex mismanagement and sex impurities.

A medical student in Bombay committed suicide because in his youth his sex life was so mismanaged that his nervous system caved in under the strain of studying for his life work.

A happy wedding took place. Festivity reigned, friends gathered to congratulate the groom and tell the bride how lucky she was. But was she lucky? Several weeks later she was a pitiable sight as a result of a social disease communicated to her by her husband.

The other day, a little boy was brought in from the districts for the famous eye specialist, Dr. Mathra Das, to examine. The boy was blind. The parent had great hopes that their little child would gain his sight. But no, the great doctor could not give the boy his sight. The boy was blinded from birth by inherited syphilis.

child. Of these perhaps the most important is the child for on him depends the future of society. The child is impelled to act by his instincts; but we must remember that an instinct is a stimulus to action and not a guide. The guidance should come from those who are of matured years, and it is here that the importance of teachers comes in.

Short training courses for teachers to learn the right approach, methods etc., have been devised. We have basic courses, the results of which have proved most valuable subsequently to the children. But in Social Hygiene Education there is something more basic than languages; it is basic to life itself, sex and its proper management. The Lord of Creation bestowed upon man and woman the sex instinct for the propagation and perpetuation of the human race.

If this way of propagating the race is good enough for the One who created it, then it must be the best way. Those who are dissatisfied, displeased or ashamed of it perhaps can recommend an improved way. Should one attempt a proposal, what should it be? Grow babes on trees!

Some good mothers' imaginations run that way, when their little children ask their first innocent question about their own origin. But one child—a little girl—was more than a match for her mother. When her mother gave her this kind of an answer, the child gave the mother no rest. She wanted to see the tree. The mother was puzzled what to do. Finally she had to give in to her little daughter's persistence and show her the tree. So through the woods they walked and walked for a part of each day looking for the tree. But mother could never find the tree.

When the little girl pointed to a tree, the mother shook her head "no". But in the meantime she was doing a wise thing. She was studying literature she had sent for and got from the Social Hygiene Society on how to answer little children's questions of such nature.

Social Hygiene Education in Schools [1]

BY

F. Weber, Esqr., M. A., B. P. E., Principal, Government College of Physical Education, Hyderabad-Deccan.

An Australian parliamentarian is credited with having said, "It is more important for a boy to know biology than to know how many wives Henry VIII had."

I interpret this to mean that, however important the knowledge of the facts of history may be, the knowledge of the facts of one's own body is even more important.

Let us look at sex in the broader sense. Each one of us belongs to either one or the other sex; but what is infinitely more important is that we all belong to that noble band of creatures known as the Human Race. Let us further try to dignify it by reaching out a helping hand to those less fortunate than we.

There is but one way for the human race to rise to a higher level. That way is through its individual members. Social Hygiene Education is one way of doing this. It is interested in raising the human race through helping its individual members.

At the outset let this point be made clear: Social Hygiene Education (Sex Education) is definitely not interested in purifying sex life as an end in itself, but rather in the enrichment of life in all its aspects—the physical, the intellectual, the aesthetic, the social, the moral and the spiritual.

In the 11 living religions of the world in the present day, I find nothing restricting children from being taught such things as will benefit and improve them. Rather I find emphasis placed on the need for guarding and guiding children to health, character, piety and respect.

Most endearing words in any language are the result of sex relationships: mother, father, son, daughter, brother, sister, uncle, auntie, nephew, niece, cousin, home, family and

1. A paper read at the 4th Annual Conference of the All-Hyderabad Teachers' Association.

Stage IV. Next Three Months.

1. Story Books (to be studied at home.)
2. Third Book of Civics.
3. Writing of applications to the different departmental officers.
4. Difficult problems in Arithmetic (Problems on Time and Work: Time and Distance, etc.)

At the end of a successful course of the 4 stages, a certificate should be issued to the students. Post-Adult Schools having night classes, library, reading room with a Radio Set, should be established in every village to prevent the literate adult from lapsing into Illiteracy.

A Board appointed by the Department of Education should prepare suitable text-books, written by authors working in different Departments. The end of Adult Education is not literacy but Re-construction of the Village, Town and the Nation.

Boards, and District Boards. The villagers should be taught the true meaning of Democracy and some ways of successfully working it for the welfare of the Community and Nation.

4. *Education for Recreation.*—This should include Bhajans, Kirtans, Khawalies; the evils of drink, debt, litigation and gambling should be sung by them. This naturally helps them to lead sober and healthy lives.

Courses of Study.—The course of study should cover a period of one year of 12 months, divided into four stages of 3 months each.

Stage I. First Three Months.

1. Study of Bhajan or Religious Charts.
2. ,, Word Charts.
3. ,, the language primer.
4. Writing a few exercises.
5. Lectures on (*a*) Revenue System.
   (*b*) Postal System.
   (*c*) Right use of hospitals.

Stage II. Next Three Months.

1. 2 or 3 small story books on ethical topics.
2. A few verses (Recitation) of moral value.
3. Study of easy reading series in Civics.
4. Farmer's or Workman's Arithmetic (Problems on Weights and Measures.)

Stage III. Next Three Months.

1. Fundamentals of Geography (Map pointing)
2. Deccan History (of Seven Asaf Jahis.)
3. General Story Books (to be studied at home; books to be issued from the school library).
4. Second Book of Civics.
5. Writing Practice.
6. Arithmetic (Fundamentals of surveying: field books: Rates and Taxes)

A Workable Scheme.—Education, however, is a wider term and more comprehensive than literacy. It is not mere literacy that is wanted but education that uplifts the nation : an education that ennobles the men to realize God, that makes the social life of the individual happy and pleasant, that elevates the standard of living, and enhances the national income and prestige among other nations.

Aims of Adult Education.—Adult education should aim at giving to the inhabitants of Indian Villages such knowledge of hygiene, agricultural improvements and civics as would be conducive to their better health, wealth and prosperity.

It should aim at giving the people cultural education with a view to enabling them to make the best use of their leisure.

It should aim at creating in them attitudes and habits for social solidarity, pride and love of country life.

It must aim at fostering in the minds of the villagers a spirit of piety, godliness and brotherhood, a contentment combined with love for hard work. That is what is meant by "Folk-spirit" in the schools of Denmark.

The Curriculum.—The contents of the curriculum should include such subjects as are calculated to rebuild the village. The chief features should be :—

1. *Education for the membership of the family.*—This should include personal hygiene, sanitary habits, decoration of home, habits of thrift and the proper balancing of domestic budget.

2. *Education for Economic Efficiency.*—This should include improved methods of cultivation and irrigation. Lessons on the cultivation and rotation of crops should be included. The right use of co-operative societies should be taught by text-books in an adult school.

3. *Education for Social Efficiency.*—This includes knowledge of Civics. The recent Reforms of Hyderabad, include the establishment of village Panchayats, Taluk

the employers and the employees. Both should realize that this work is constructive, patriotic and highly useful for better relations between masters and their servants.

The Village Panchayats should also be entrusted with this work. Under the duties of the Panchayat, Mr. A. B. Mande, Adult Education Inspector, Co-operative Department, Fatehpur, writes thus in his, "A Scheme of Rural Education".

"(1) Make provision for Elementary Education of a lower primary grade for all boys and girls up to the age of 9 in a village.

(2) Make provision for a night school in the village for further education of boys who do not join the middle schools as well as provision for cultural or general eduation of the village population ".

Adult Education in the East and in the West.—There is a difference between the adult Education in the West and in India. In the West it is a movement of the adults keeping themselves abreast of modern knowledge and understanding the latest developments in various fields of human activity. But adults in India have to be introduced to the mysteries of reading and writing. Thus with us the problem is primarily one of spreading literacy. But literacy as such is not likely to attract the average adult, unless he is made aware of the immense vista that can open out before him, once he learns to understand the written word.

We must undertake this work with a definite plan and programme of work as was undertaken by the Government of U. S. S. R. in their 5-year plan. The enthusiasm of the adult masses has to be aroused at first. This can be done only when they are convinced of the great opportunities open to them if they are educated. The mass of illiterate adults in the country should be made to realise that they will be doing something vital and important to the State by acquiring literacy and useful knowledge.

In the evenings mosques, temples, Congress buildings and Muslim League Offices should be utilized for this work. Every one of these organizations has three types of work: (1) Propaganda; (2) Agitation (or awakening work) and (3) Constructive work. The third is generally village uplift and contact with the masses. These organizations should be approached to make this an important item in their programme.

Secondly, there are industrial centres, such as Factories, Railway Workshops and mills. Most of these have efficient trade unions to educate the workmen. In India most of the trade unions have no work but to agitate for more wages, help to reinstate dismissed employees and sometimes to organize strikes. They want something striking and emotional and the leaders are more anxious to appear in the headlines of News-papers or stand before large gatherings of workmen than to educate them. It must be impressed upon them that the work of Trade Unions is not merely to organize strikes and fight for the rights of workmen but also to work for the rise of their intellectual and social status. Literacy among workmen is appallingly low and this is in many cases a serious handicap to their work. To gather the workmen to a class and to educate them is a very easy and convenient work as they are easily available in one place. Being brought up in one place and working under similar conditions, they psychologically form one group.

The Co-operation of masters and the Administration can easily be obtained by the Labour leaders if they want to arrange for a work of this type. But it is a matter for regret that the General Managers of Railways and Mill Owners look at the Trade Union Leaders with suspicion as they have nothing but higher wages and lesser working hours to demand. If they approach at all, they do so, for some impossible request at the threat of a strike. Problems like the adult education should be taken up cheerfully and willingly both by

How to create this group spirit?—The group spirit and a motive for learning have been usually inculcated through religious ideas. There was once in our villages, before the advent of Western thought and system in the Departments, an efficient Panchayat System which administered to all the needs of the Village Community—social, economic and educational. The Kathakars in the villages, through the recitation of Kathas and Puranas, imparted religious instruction which was not literary as understood by us. They imparted adult education then but now we want adult literacy through adult schools. A distinction should be drawn between adult education and adult literacy. It is true, we have to start with literacy for education. It is interesting to note what Prof: Amarnath Jha said at the All-India Educational Conference, Kashmir, September 26, 1941, in this connection:—

"Adult education should aim at continuing education throughout life for all types of adult individuals, for the university graduate, as well as for the peasant, as much as for the landlord and the mill-owner as for the factory labourer, as much for the legislator as for the office-clerk. Education in maturity is of value to all; it recreates and provides new standards of values".

A Scheme of Adult Education.—A Scheme of Adult Education in India should utilize the existing ideological, social and political groups such as the Muslim League, the Hindu Mahasabha, the Aryan League, Sikh Sangh, the Christian Association, the Zoroastrian League, and the Congress Organizations. These groups must be made to understand that Adult Education is a part of their constructive work whether it is for the betterment of their Community, Social Group, Co-religionists or the nation as a whole. We do not quarrel with their ideals or their programmes. All we want is that they should include Adult education in their programme.

In the case of children, the daily experiences are few and so the teacher can deal with the subject in an abstract way. In the arithmetic lesson he may talk of thousands of mango trees and millions of coconuts when in his village there are perhaps no mango groves or coconut palms. To the child arithmetic thus becomes an uninteresting subject whereas to the adult it is an all-important, practical subject. But the task of making the subject touch his daily life is rather difficult for the novice teacher.

Trends of mental growth.—As the adult brain is already developed, it has a tendency to be critical. The adult pupil views the things and lessons, in the midst of which he is placed, from his own angle of vision. Hence the adult at school presents a difficult problem for the teacher. The materials and maxims are not accepted without criticism and resistance by the adult. The value of methods and steps is questioned at every step and so the teacher has a hard time to pass in teaching them. It must be understood very clearly by the advocates of adult education that the elementary school teacher, the enthusiastic office clerk, the practising lawyer and the college student are hardly equipped for answering the questions that are prompted by the spirit of criticism of the adult mind.

Any successful scheme of adult education should try to satisfy not only the wider needs of the adult but provide a strong incentive to learn e. g., when the prospect of enhanced wages are held out to workmen on their passing a literary test.

Among adults of the same locality their experiences and their intelligence quotient (I. Q.) are so different that they rarely form a psychological standard group. The class will psychologically break up into many units each of which will have to be dealt with separately. The teacher's work will then be so multiplied that progress becomes very slow. But even then the formation of a psychologically homogeneous group is possible if only because certain elementary needs are common to all in a group

The mind is always receptive; it gains new experience and new knowledge through apperceptive masses. These shape, reshape, alter or annihilate the incoming ideas. In an adult they are well-formed mental sets and in a child they are feeble and plastic, offering less resistance to new perceptions. With these are closely connected the interests of the individual, his social contacts, tastes, distastes, prejudices and notions. Such sets are like well established social and political organizations in a country. They resist the mechanical aspects of learning such as spelling, writing and simple arithmetical operations. An adult individually builds up some symbols of writing and spelling which the adult school tries to break. Those associations do not easily break for they have occupied the mind for a long time.

Another difficulty is in the conception of the process and meaning. In psychology an experience may be viewed from two angles, that of meaning and of the process. When we observe the action of lifting, in the former sense, we are aware of the weight and of the hand that lifts it. When viewed from the process of sense, we are aware of the tension at the wrist and the factual impressions and the visual images. The latter attitude is implicated in introspection and has specially to be acquired. Of these two attitudes, the former is natural to man in his normal growth and the latter is developed through the instruction methods of the class room. In an uneducated adult, the meaning attitude takes a firmer root before the latter is allowed to set in. The teacher finds it hard to bring home to the adult the latter process.

The adult does not like formal training unless it has a direct relation to actual life. To bring in daily life-contacts is rather a difficult process for a novice teacher or a college student. Teaching in Adult schools is generally entrusted to primary school teachers and student enthusiasts. In many cases, they may curb the enthusiasm of the adults, instead of encouraging them to proceed further.

inseparable aspects of growth; (ii) the sooner are optimal conditions provided for development, the less will be the limitations imposed by nature. The school's function is obvious, but to be effective it needs the co-operation of the home and society as well.

Some aspects of Adult Education

BY

K. Koteswar Rao, B. Sc., Dip. Ed.,

Assistant, Osmania Intermediate College, Aurangabad.

Adult Psychology.—In India the psychological differences between the adult mind and the child mind may be roughly described as follows:—

1. The adult mind, being full of the sense of ego, resists the influence of others in contrast to the susceptible child mind.

2. There is an accentuation of individual differences amongst the adult pupils on account of differences in their personal history, experience, growth and surroundings.

3. The teacher in an adult school is merely a wage earner in the eyes of his pupils. His personality does not inspire awe and respect in the adult mind. To the child, the teacher is next to his father in matters of authority and respect.

4. The school subjects in an ordinary school appear to the adult to be formal. Being often in advance of the knowledge found in the book given to him, he does not feel attracted to the subject-matter of formal instruction.

For adults, therefore, a new technique and new principles of teaching are necessary.

Teachers cannot be expected to be psycho-clinicians ; but they should be able to recognise the symptoms of educational mal-adjustment.

Educational provisions for Individual differences.—Educational devices to provide for individual differences among children are varied and numerous. The common principle is the creation of a school situation wherein each child will be able to proceed at a pace and work at a level commensurate with his abilities. It is necessary, therefore, that children should be classified into homogenous groups, curricula differing in intensity and extensity be framed, and special methods of teaching be adopted for the different grades of abilities. The special abilities viz., musical, mechanical and graphical must be taken into consideration. Individual interests and purposes must also be recognized. Exceptional children will have to be clinically studied and suitable educational provision made for them. Means should be found to discover early any defects of the child's endowment and suitable educational exercises devised to minimise its consequences. When, by suitable tests, we are able to discover the cause of weakness in a subject and to apply remedial training, there will be no excuse for any child not mentally deficient remaining backward in school work. Guidance in education is thus a matter of understanding and utilising our knowledge of variations in intellectual and temperamental traits and the causes of success or failure in school.

Conclusion.—The variations in the endowment of children are too great to be disregarded. They must affect the curricula and organization of schools. Thus the Montessori system has abandoned the use of class instruction. Various forms of individualised instruction like the Dalton Plan and Supervised Study are being tried and found justified in the higher stages of schooling also.

Two significant principles emerge from the scientific study of human variability viz., (i) nature and nurture are

sex so out-weigh the differences between the sexes in intellectual traits, that for practical purposes, sex differences may be disregarded." Meumann suggests that the differences are largely due to the influence of environment and training rather than to sex. Burt and Moore conclude, "With few exceptions, innate sex-differences of mental constitution are astonishingly small. So far as they exhibit any general tendency, they tend to diminish rather than to increase as we pass upwards from simple processes of sensation and movement to the complex processes of reasoning." The difference between the sexes lies not in the average capacity of achivement but in the range of variability. The male sex exhibits a greater variability than the female. Thus there are more geniuses amongst men than amongst women; but there are likewise more idiots.

The factor of physique.—Experimental results are not conclusive as regards the association of intelligence with physique. But such studies have been made mostly with advanced children and the indirect evidence does indicate serious consequences of unhygienic conditions in early childhood on mental development.

The factor of age.—Barring accidental factors, individuals maintain their relative intelligence within a group throughout the school age which makes educational prediction possible. But, as the unit of education is the individual and not the group, these extraneous factors have to be sought for. As a child matures he shows new skills, interests and attitudes which must affect his curriculum.

Variations within the Individual.—There is a high correspondence between an individual's abilities in school subjects. Nevertheless musical, mechanical and graphical seem to be special abilities. Therefore excepting these, educational differentiation must rest on the general intellectual level. There may be exceptions, however, due to early training, emotional difficulties, and sensory and physical handicaps.

The factors of race and nationality.—In respect of elementary mental functions like sensory acuity and discrimination, the differences between peoples of different races are negligible, while in regard to higher intellectual functions they are more marked; which latter are probably the result of culture and education. Another outstanding fact is that within a race the differences are many times more than those between races. The bearing of this on the political treatment of races as e. g., in the immigration laws of the U. S. A. and Australia are obvious.

There appear to be no reliable innate differences between racial groups like Nordics and the Mediteranian races. The manifested intelligence of the Negro and the Red Indian has been found to be lower than that of the White; but because of the disparity in social, economic, cultural, educational, nutritional and hygienic conditions it cannot be said to hold for innate potentialities as well.

Nationality and race are still cultural influences and as such are partly responsible for individual variations. They are primarily environmental and not genetic. It would be unsound therefore to attempt educational differentiation on this basis.

The factor of Sex.—In childhood girls show superior language ability while boys exhibit superior arithmetical and mechanical ability. Physical and physiological differences might partly account for this; but cultural influences beginning from toys and play materials might also be a potent factor. In tests of intelligence, both boys and girls do equally well. So sex membership alone cannot supply a basis for educational differentiation.

The obviousness of the physical sex difference has caused its significance for mental work to be much over-rated. Thorndike remarks. " The individual differences within one

against that for siblings which is ·5; while identical twins show a trait correspondence of ·9. Hence the nearer the genetic relationship, the greater the resemblance.

Studies of foster children reared in different homes also show a significant correspondence between the child's mental development and the quality of the foster home. Burks concludes that the contribution of the home might enhance or depress the intelligence Quotient by about 20 points.

The disparities between indentical twins reared apart depend upon the age at which the twins were separated and the number of years of separation. The extreme hereditarian view would mean that education can merely impart information and develop habits but cannot form individualities. Experiment has proved this view to be untenable.

The role of environment.—The environments of men of science have been studied with the result that areas with better educational opportunities seem to produce more eminent men.

Children's mental ratings have been seen to rise as the level of the parental occupation rises. But this can be interpreted to be in favour of either nature or nurture. Favourable developmental conditions in the nursery school produce lasting effects on the child's mental development.

The conclusion is that individual differences show themselves in infancy but their continued showing will depend on optimal developmental conditions. Recognition of this variability and making educational provisions for it should therefore start in the nursery school.

Whether identical education increases or decreases original differences is a debated question. It is clear, however, that regardless of the level before training, each individual's skill is enormously improved under training. This suggests the importance of systematic and optimal conditions of education.

aptitudes, personality and character, social maturity, educational achievement, and vocational aptitudes.

Range of variability.—The curves of distribution of mental capacities approximate to the normal frequency curve which means that the distribution is continuous and symmetrical, that individuals cluster round the mode or average and that the frequency diminishes as the distance from the mode increases. This goes contrary to the popular opinion that persons fall into types as regards mental traits. Hence the educational problem does not remain simple, viz., to identify the type and adjust teaching accordingly.

The causes of Individual differences.—Experimentation during the last forty years has revealed a number of causal factors. According to Prof. Thorndike they are ancestry, both remote and immediate, sex, maturity and environmental influences, physical, social and educational. Some of these like heredity, environment and age are basic and others like race, nationality, sex, physique and personality are secondary.

The contributions of genetics.—Because of the diversities of germ cells in each parent, it is improbable that any two of their children, except identical twins, will develop from the same gene combination. Hence no two children are entirely alike. Human traits are the product of genetic equipment and the conditions of growth in the environment. The educational implication is that the sooner and longer the optimal, environmental conditions are present, the less will be the hereditary limitation.

The role of inheritance.—From the high frequencies in which eminent persons occured within the same families Galton concluded that the primary factor was inheritance. Cattell and others, however, demonstrated the significance of the environmental factor.

Investigations into twins show that fraternal twins who develop from two separate ova show a correlation of ·75 as

Individual differences and their significance in education.*

BY

Dr. D. D. Shendarkar, Ph. D., (London),

Reader, Osmania Training College.

Introduction.—Recognition of the existence of differences among individuals can be seen in the philosophies and practices of educational theorists from the earliest times on. Their views, however, were based on observations and not on any systematic study. In the earliest stages, psychology in its attempt to discover general mental laws ignored differences among individuals. Now they constitute a seperate section called differential psychology. Similarly in education, the differences among pupils were long overlooked; now the demand is to individualise instruction. It is a problem whether such variations should be reinforced or suppressed. Meumann says, "the problem of typical differences is of paramount interest for pedagogical practice; it can permit us with a basis for classification and treatment of pupils. It is a pre-requisite for the solution of problems of applied psychology like vocational guidance and emotional mal-adjustments. The school hereafter with the help of the psychologist will have to undertake the task of testing the mental capacities of pupils and suggest suitable occupations for them, and thus minimise the loss both to the pupil and the society."

Only towards the close of the 19th century did the problems of human variability begin to be investigated by experimental psychology. With the development of Tests for measuring abilities, the nature and extent of human differences passed from the stage of speculation and opinion to objective study and precise statement. For measuring Intelligence, tests now exist from infancy to adulthood. Tests were then devised for the other aspects of individuality such as performance,

---

* A paper read at the last Conference of The All-Hyderabad Teachers' Association.

attention to this. Ali Akbar Contest and Recitation Contests have lent stimulus to this work but the defect here is that the spirit of competition has the upper hand. The result is that with a view to make a name, only the selected few are trained for such contests, when as a matter of course such activities should form an inseparable factor of the daily routine. Neither does it call for any special arrangements to be made nor is it necessary that it should be included in the extra-curricular activities.

Members of the Sub-Committee

1. Mr. Md. Faizuddin, M. A. (Cantab), Bar-at-Law, Divisional Inspector of Schools, Balda Division .... *Chairman.*
2. „ Syed Nurul Hasan, B.A.,B.T. (Aligarh), Dip. Ed. (Glasgow), Headmaster, Govt. High School, Darus Shifa .... *Secretary.*
3. „ Zulfikar Ali Khan, B.A., Dip. Ed. (Eng.) Inspector of Schools, Sangareddi .... *Member.*
4. „ G. Sundaram, M.A., Principal, Methodist Boys' High School, Hyderabad-Dn. .... „
5. „ Mohd. Yusuf, B.A.,B.T., Headmaster, Govt. Middle School, Kachiguda .... „
6. „ Dinkar Narayan, B.A.,B.T., Headmaster, Govt. Middle School, Mogalpura .... „
7. „ Faiz Mohd., B.A.,B.T.,M.Ed., Assistant, Govt. High School, Nampalli .... „

such contests for hours together without showing signs of fatigue. No wonder that they do so, for it is something which they can call their own, something which they dote upon. It is also clear that such speeches are a source of enriching their store of knowledge. Speeches should, as far as possible, be distributed over a wide range of subjects. Much can be done in our schools in this respect and it is gratifying to note that some have already given the lead in popularising this by way of study circles. But generally this is done after school hours. From a psychological point of view this is a mistake as the very fact that it is not regarded as a part and parcel of the school programme lowers its value considerably and the end is thus frustrated. Some teachers are prone to regard speeches as a waste of time whereas in fact they are perhaps the best means to make any particular lesson a success.

Of the subjects that are taught in a school there are some the portions of which are particularly suited to be presented in the form of "play-way"—History and Literature, for example. Story narration, characterisation and recitation of poems can most profitably be employed to serve this purpose. If the boys are given an opportunity to select interesting portions from their lessons and to narrate them in the form of story before the class, with special attention to correctness of language, accent, expression and presentation, far-reaching results can certainly be obtained. Such portions of lessons as are in the form of dialogues should be narrated in dramatic forms with a view to making the lessons more lively. Some intelligent teachers, while teaching Shakespeare, make the boys actually enact whole scenes, so that the boys may catch the spirit of the play rather than content themselves with merely taking down notes.

Recitation of beautiful poems is a delightful pastime. Pupils should be induced to recite stanzas of their own choice in an impressive tone and if possible, they should be made to sing. Some of the schools in our country are paying

work entrusted to him such as the distribution of books, collection of fines, supervision and management of sports, conduct, and behaviour, and to establish a moral standard making a note of the out-door activities of the boys, paying attention to individual work, safeguard of collective rights, performance of shows, organization of functions and debating societies, school sanitation and the inculcation of a spirit of cleanliness. Past experience has proved this method to be quite successful, one in which the boys take great interest. In other words, the boys are made to live in a limited world of their own where they are at once the ruler and the ruled. When boys are so trained from the outset, there is no doubt they will grow up to be good and worthy citizens. Sooner or later when they enter life, they find themselves fully equipped for shouldering great social responsibilities.

Even from an economic point of view, this kind of school-management is far from being a burden. Unfortunately, however, our schools are yet strangers to this order of things in spite of the fact that it does not call for any special effort on our part.

Another way is to provide opportunities for the boys to speak on subjects of their own choice. This would certainly come as a relief in the midst of the boredom of having to listen as dumb creatures to the vociferous outbursts of a pedant in the class-room. To work out this scheme it will be necessary to devote a few hours in the school time-table to speeches, extempore or otherwise, of students. Care should be taken to see that every pupil takes part in this programme. Arrangements should also be made to see that after the speech is over, the audience get their doubts cleared by a system of questions and answers. Any discrepancy in the speech or any wrong narration of facts should be set right then and there. The teacher's presence on such occasions is also essential. He should watch the speakers carefully and if necessary, give suggestions for improvement. It has been observed that pupils take part in

methods which are based on the recommendations of expert educationists assign a prominent place to the "play-way". A perusal of the educational programmes as chalked out by experts like Montessori, Helen Parkhust and Decroly will show that the spirit of play is ever at work in them. Modern psychology has proved beyond doubt that the "play-way" is the best way of imparting education, inasmuch as the child's interest is always kept alive by this method, and consequently even the most difficult task for a child ceases to be a task and becomes a source of pleasure. According to this method, therefore, the child's educational programme should be so arranged as to make the element of play directly or indirectly its prominent feature. It is this method which we call the "play-way".

We shall give below a few of the methods which ought to enable us to achieve this aim. The object of encouraging self-management or self-government in schools is nothing but to awaken a sense of self-freedom in the children, so that:

(*a*) a sense of internal discipline may be created in the boys;

(*b*) the boys may be well equipped to fight the battle for existence on leaving school, and

(*c*) having gained self-control, they may realise and shoulder the responsibilities entailed in learning.

It has been stated in the foregoing lines that a sense of internal rather than external discipline is preferable in most cases. Anything forced upon the children by the teacher causes their nature to revolt. When most of the school work is left in charge of the children and they are made responsible for it, they soon come to regard the work as their own and the entire show is so nicely performed that the need for an external control ceases to exist. The practice in vogue in schools to fulfil this requirement is the appointment of class representatives. From among the representatives a head is selected who, in collaboration with his colleagues, manages the

unit. So the headmaster should set an example of service and duty, by not wounding the self-respect of others by any of his words or actions. He should aim at the collective gocd of the school and establish a contact between himself and the staff on the one hand, and the staff and the pupils on the other. Thus a high moral tone should prevail in the school and naturally when the pupils notice the existence of this moral atmosphere, they will also come under its beneficial influence.

The other fields of practical application of these moral codes are the Boarding House and the class-room itself, where the monitorial system of administration can be adopted to the greatest advantage. By these means, really capable boys can be trained as leaders who would be an example of good behaviour and good conduct to their school-fellows.

Methods of Play-Way

A study of child psychology has shown that the child is not an insignificant being as he used to be thought once but a progressive unit in Society. Any system of education will therefore be considered incomplete, if it does not take into account the child's natural bent of mind, his tendencies, instincts and interests. Education should be intended for the child and not the child for education. This change in the trend of psychology has wrought a proportionate change in the principle as well as the method of education. Spoon-feeding has given place to such measures as will not only ensure the growth of the latent qualities of the child's mind but will provide opportunities for their full display. For this reason the curricula of studies in schools is nowadays based on the above principle.

So much about the principle. In so far as the method of education is concerned, our object is to take as much advantage as possible of that instinct which warrants perfect assimilation ; and this instinct is "play". Modern educational

a hater of wickedness and a respecter of all that is good. So, ethical or moral training must also form an important part of the child's education. The world has now reached a stage when the only alternative for lack of strength is the acceptance of the vassalage of a foreign power. Might has taken the place of right. Religion and morality are being pushed into the background. Treaties are considered as mere scraps of paper to be burnt and thrown away when a suitable occasion arises for their violation. So, we should be all the more careful while educating the child The best points in the arts and sciences of the west should be well assimilated under a system of moral code suited to the environments of our country.

Moral science forms part of the curriculum of every Indian University. Though pupils learn all the moral codes by heart and even produce them in examination with apt illustrations and examples, yet, if one may dare ask, do they apply them in daily practice to those problems that face them at every onward step of their life ?

Notwithstanding the defects mentioned above, if ethical training is given on the right lines, it must necessarily make the child grow up into an obedient and law-abiding citizen.

The teacher can create opportunities for his pupils for displaying all the virtues that they have learnt in different ways. The extra-curricular activites provide a good field. Such activities as scouting, organised games and excursions, debates, school-day celebrations, study circles and dramatic performances provide occasion for the exercise of social service, honesty and endurance.

In this connection, we would like to dilate on the moral code that binds the headmasters and the staff of a school.

Just as a teacher is a model for his pupils, so should a headmaster be to his staff. Each teacher is a self-respecting

disobedience on the other are the rival parties. Naturally the atmosphere is not, at all conducive to proper instruction in the class.

Lastly, this form of punishment engenders fear and it is needless to say that knowledge gained in this way under the influence of fear can only be transitory and is soon forgotten. The boy also acquires the evil habit of hiding his faults and never gives expression to them fearlessly.

According to the latest developments in the field of education, a teacher is expected to know his duties fully. Instead of becoming a flogger, he is expected to be a personification of love which should draw out the love of his pupils, thereby strengthening the bonds between them by regular, characteristic, and methodical instruction which should be delightfully assimilated by the pupils.

The child is a human being and he has something in him which is capable of improvement; and it is the duty of every teacher to discover this inner being and set it on the path of progress by right guidance. He should be an encyclopaedia of knowledge and be able to assist, advise and guide his pupils in the right path.

If we turn our attention to our own country, and try to apply these theories, we find ourselves in a maze. Here we find stiff examinations with high percentages which do not offer an ideal field for imparting instruction on the basis of love. The children themselves have very little perception of right or wrong. Mischief and disorder are their inherent qualities which must be corrected by deterrent punishment.

Having all the above mentioned facts in view, we can only say that though gentler methods must be adopted as a rule, yet corporal punishment should be kept in the background ready for any emergency.

As was pointed out in the beginning, Education is not worth its name if it does not make the child a lover of beauty,

cordiality prevails between the teacher and the taught. Pupils are young and their minds are naturally undeveloped. So their inclinations tend more towards mischief, disorder and rowdyism. For this reason, various methods have been devised to establish order, peace and calm during instruction hours in the classroom, or, in other words, it is essential to maintain discipline in the classroom.

Now, to achieve discipline, various methods of punishment have been adopted in different countries at different times, the most virulent form of it being corporal punishment. This form of punishment was in vogue in almost every country, whether civilised or otherwise, in the 18th and the 19th centuries. The then motto of the teacher was, "Spare the rod and spoil the child". In India too, the school master's only solace was the cane, the slender branch of a tree bereft of its leaves, a piece of broken wood or sometimes even the palm of the hand. Even now, our country does not lack school masters of this type. Even now the spirit of Dr. Keate can be found in village schoolmasters who zealously apply the rod, even for the slightest fault, to their underfed and undernourished pupils. If you just turn your attention to the results achieved, you will find, in the majority of cases, not only that the object has been defeated but that it has resulted in nothing but suffering and hate.

If we look at both sides of the picture we cannot advocate the total abolition of corporal punishment, as it has its own advantages. On the other hand, it is also fraught with disastrous results for the child. His self-respect being wounded, he tends to become callous and, following the footsteps of his teacher, he treats his younger companions in the same way, and thus himself becomes the cause of deteriorating. Besides this, this form of punishment breeds hatred of the teacher. In course of time, the class room becomes a seat of war where power on one side and cunning and

In Hyderabad we are attempting a *via media* between the craft-centred education like that advocated under the Wardha Scheme and a book-centred education of the old type. We are attempting to teach crafts and arts by the inclusion of weaving, tailoring, carpentry, Bidri work, cane work etc.

Very recently the whole curriculum for drawing, art and craft has been thoroughly reorganised with a view to make it child-centred.

The following are, in short, the characteristics of this expanded course:—

1. Nothing is forced on the child. Complete liberty of expression is given to him.

2. The curriculum is correlated to the child psychology.

3. The aim is to create in children originality, observation, and appreciation.

4. The school and the world are brought into contact by allowing the child to give an expression to those ideas only which are uppermost in his mind.

5. Special stress is laid upon design.

6. The school products have to be useful because the child is encouraged and guided to do nothing that is fantastic in scale or conception.

7. By giving a free scope to the child and the teacher this course creates in the child a love for some sort of craft. Thus the child gets more interested in it than he would be if he only pursued it as a hobby.

Discipline

Schools are institutions of service and a teacher's duty is not only to train the bodies and the minds of the pupils but also to develop in them those qualities which will make their lives successful when they enter into the world. This training will only be successful and efficient if an atmosphere of

It is interesting to note that the need for such a bias in education was stressed as far back as 1882. The report of the Indian Education Commission of that year says, "It has been felt in all provinces and urged by many witnesses that the attention of students in secondary schools is too exclusively directed to university studies and that no opportunity is afforded to develop what corresponds to the 'Modern Side' of schools in Europe".

Attempts have been made to introduce this 'Modern Side' in Indian Education from time to time. It is only very recently that this has been taken up seriously.

It would, therefore, but be pertinent here to refer briefly to the scheme of Basic Education popularly known as the Wardha Scheme. The whole of this scheme is built upon the proposition that

1. Primary education extending over a period of seven years or longer and covering all the subjects up to the Matriculation standard except English, plus a vocation used as a vehicle for drawing out the minds of the boys and girls in all departments of knowledge, should take the place of what passes today under the name of Primary, Middle and High school education.

2. Such education, taken as a whole, can and must be self-supporting; in fact, self-support is the acid test of its reality.

This scheme suffers from the following drawbacks:

1. It forces upon the child specialisation in a vocation at a premature age.

2. The scheme does not make any provision for children from five to seven years, though it realises "the necessity for some organisation of pre-school education for children between the ages of three and seven."

3. It neglects English by eliminating it from the curriculum, and makes no provision for religious instruction.

The points that present themselves for examination are therefore:

(*a*) What factors make up environment?

(*b*) How is the necessary manipulation to be brought about?

(*c*) What place does the teacher hold, according to this conception of education?

Dr. Adamson thinks that environment is made up of the natural world, the social world and the moral world. The course of study in a school must therefore correspond with the actual experience of these three worlds. According to Prof. Franklin Jones, "the course of study is a selection of these impersonal experiences of the race which we believe will be most valuable to the life of the child." He says that our experiences for a day can be counted under the heads of the different school subjects, such as Geography, History, Mathematics, Languages, Physics etc.

But the employer does not want only the cultured product of the school. He wants persons who would be capable of doing work in his office or shop. Hence the insistence of educationists that there should be a 'top-dressing' after a cultured course.

The course of studies in a modern school, therefore, does provide some sort of training in art and craft. This inclusion has been thought necessary because of its psychological and utilitarian aspects. "Childhood has its own ways of thinking," and no child is capable of this process without seeing and feeling. He can get a chance of using his sight and hands only through art and craft. While thus a child has scope for self-expression and observation and can feel the joy of having carried to the end a self-imposed task, this very interest in a particular craft is of great help to the educationist in determining and deciding the future vocation of the child.

All the new plans of teaching are paedo-centric. The Montessori system, the Dalton plan, the Gary Scheme, the Play-Way, the Project Method—in all these the child dominates everything. Even the tests or examinations are to be "used to locate pupils' weaknesses in order that such weaknesses may be corrected", because "the child is the real centre and the true object of consideration."

In France this movement has created the idea of "integral instruction". In other words, the French educationists felt that the pupils learnt a number of subjects without even realising that there was any connection between them. Hence they wanted that the curriculum should be so organised "as to present an organic unity of subject-matter."

In America this tendency to bring about a correlation of subjects has been carried further and attempts are made at the unification even of the teaching forces, i. e., the staff of the school should act as an educational unity in its influence on the individual pupil. John Dewey first sowed the seed of this idea in his "School and Society." To describe it in wide terms, the aim of these American educationists is "preparation for complete living." Given a living child, the school is the place where he has to be prepared for the world. Thus the school becomes a social institution, where emphasis is laid not only upon the systematic work of the school but also upon "by-education" or "educational influence of social intercourse of all kinds". The school thus becomes a society because though the child's individuality is sacred, the self-realisation of the individual can be fully achieved only in and through society. Hence the school has to be a society in miniature manipulating the experience of the educand to the best advantage. To quote Prof. Franklin Jones: "The school is fundamentally an experience-giving institution and if it cannot give more vital experiences than the child can get anywhere else in the world, it has no valid claim upon his time."

words of Prof. Ballard: "Let us by all means give a boy enough rope to entangle himself hopelessly, but certainly not enough for him to hang himself".

A Child-Centred Education

To understand how the present idea of the child as the centre of education has grown up, it is necessary first to outline the prevailing idea of education and its aim in the past. Until the 18th century education forced upon the child the traditional and customary way of thinking, avoided human inclinations, instincts and natural interests and developed the reasoning power and memory. Naturally, the material selected to achieve this had no inherent interest for the child.

Rousseau was the first person to advocate a change of attitude towards the child through his publication of Emile in 1762. "Take the reverse of the accepted practice, and you will almost always do right." Emile was regarded as more important than the subjects which were taught to him. In his case education for the first time becomes a process, the ultimate end of which is the development of childhood, through the nature, growth and experience of the child.

Much more important than this characteristic, perhaps, is Rousseau's attitude of sympathy towards Emile. "How much he learns is of no account but only that he does nothing against his will."

The reforms of Pestalozzi, Herbart and Froebel are all based on the teachings of Rousseau.

Through the efforts of these reformers the idea that the importance of the child is much greater than that of the books came to be recognised gradually. This idea has been summed up in one word by Dr. Stanley Hall—paedo-centricism.

We will now examine in what different ways the underlying principle of paedo-centricism has affected modern teaching, theory and practice.

But it should be remembered that it is only as a result of conflict that spiritual advance is made. Without a clash of motives and a deliberate choice between good and evil there can be no moral growth. Therefore, the pupils should be trained in choosing the good and leaving out the evil deliberately. Without freedom of choice there can be no moral growth; a child used to work on right lines under constraint is bound to go astray as soon as it is removed.

It is the experience of most teachers that when a child is given freedom to select between good and bad, in nine cases out of ten, he will select the right thing. If we study a number of cases of breaches of discipline in schools, we shall find that mostly it is the teacher-made laws. In the old regime, the teacher-made laws were so numerous that the margin of free activity for the child was almost nil. Even now, in most of the schools in our country, the word most frequently used by teachers is "*DON'T*". They usually say "Don't do this"; "Don't do that", which creates a sort of rebellious spirit in the children. Surely it would be more advisable to give definite, positive orders than to tell them not to do this or that.

By some of the teachers, deadly stillness is considered to be the best discipline. Of course, it appears to be charming and good from the teachers' point of view; but there is no life in it. Moreover, the aim of education, to develop the minds and morals of pupils, is frustrated in this way, and as soon as the boys get a chance they begin to revolt against it. But the other phase of the picture should not be neglected. Too much freedom sometimes proves dangerous for the normal growth of the pupils. Hence the need of restricted freedom.

We all know that it is not always wise to let the boy learn by his own personal experience; similarly, it is not enough to leave the pupils to find out things for themselves. It is essential that they should be led and guided. In the

whims and fancies, obviously the whole moral and social structure of the world would be absolutely changed, and we would soon find ourselves in a world of chaos.

Nature has also set limits to our capacities. There are many things that we want to do but cannot do; there are other things that we can do but do not do. These barriers have been imposed on us by our own ideals or by Society and Law. But we accept all these limitations without grumbling. We do not complain when we are not allowed to steal our neighbours' property or when we are not allowed by our conscience to tell lies. But we do complain when somebody further curbs our activities, and curbs them without any moral or social excuse, which we regard as an encroachment upon our personal liberty.

Thus freedom is of two distinct kinds, inner and outer; and it is the inner freedom which is more important from the educational point of view, because the true aim of moral education is to produce in each pupil a kind of inner freedom. Without internal freedom, even though all external restraints may be removed, a man is still unemancipated for he is not free to make his own choice.

In every human being there are two innate forces, the instinctive and rational; or the brutish and the human; and these two forces are continually in conflict with one another. That is why we say man is a strange mixture of brute and angel. He has desires and impulses which he shares with the beasts and which perish; he has other desires and impulses which he shares with the high gods. If he is leading a good life, he is gradually becoming less of a beast and more of a saint. Morally and spiritually he is growing up; and this is the result of the victory of the human force over the brutish force.

These victories of the human force over the brutish force may be consolidated by habit, which may have a permanent effect on life.

The New Education desires that the child live his life naturally in accordance with his interests, and follow an environment, which has been made rich in a variety of activities.

Children live in visible and tangible reality; their activity depends upon this reality, and their experience is nourished by it. The child has in general a remarkable memory for concrete facts, but little capacity for handling abstract ideas. The school of today too often strives violently to stuff the young minds with verbal reasonings and abstractions far beyond their grasp, with the result that the adolescent has his intellectual growth stunted by the need of memorizing endless large doses of material given in the curriculum and demanded back in the examinations. We must see that the child lives in the concrete. Children must have opportunity to work with their hands. Especially for children of 7 to 12 years of age, manual work must remain the corner-stone of education. If this conforms to the child's natural instincts his mind will proceed from the concrete to the abstract by slow stages, without the hasty and premature intervention of the reflective thinking of the adult.

Freedom

Freedom in the real sense of the word is a myth. It is never to be found in the world. When we talk about freedom in a particular free state or school, we only mean that the citizens of that state or the pupils of that school are free only from certain restrictions which are imposed upon the citizens of other states or pupils of the schools where the so-called freedom is not to be found.

Really speaking, freedom is a relative term, according to which restrictions on free activities are minimised as much as possible. But to be free from all sorts of legal, moral and social restrictions is almost impossible. If every person were to be given full freedom to act according to his own

Report of the Sub-Committee*

ON

New Education with special reference to the Play-Way in Education

The most significant feature of the New Education is the inspiration to encourage the spontaneous and creative nature of childhood. It makes the most of his creative abilities. The aim of the New Education is to conserve and develop the useful and constructive energies of the individual with a view to moulding him into an autonomous and responsible personality.

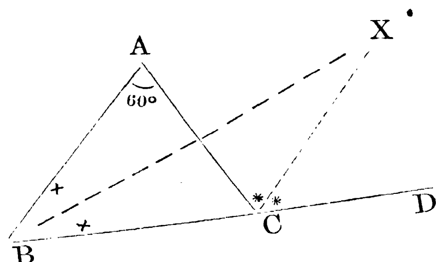
India has been left far behind and continues the old scholastic traditions of teaching, which do not take into account the active and creative nature of the child. If education is to be any thing more than passive assimilation of mechnically imparted information, if it is to release the springs of the child's creative impulses and equip him for a dynamic part in the reconstruction of the world, we must reorganize our education drastically.

In this reconstruction we shall respect the active and constructive nature of the child and make provision for its free and joyous expression ; we shall re-establish the intimate and fruitful relationship of the hand and the brain, of theory and practice, of knowledge and activity. We shall enrich the curriculum and work of the school by introducing into it joyous activities and occupations and significant subject-matter derived from life. The New Education will create healthy interests of work and leisure ; it will be an education which, in close co-operation with the industrial system, will train each individual for some line of work that is congenial to his nature. The ideal of new education is spontaneous, personal, productive activity.

---

* This committee was appointed by the All-Hyderabad Teachers' Association and the report was adopted at the 5th annual conference of the Association held in January, 1942.

the one given for Qn. I (b), Model Paper I. They might have said :



$$\hat{BXC} = \hat{XCD} - \hat{XBD}$$
$$= \frac{\hat{A}+\hat{B}}{2} - \frac{\hat{B}}{2}$$
$$= \frac{\hat{A}}{2} \quad , \text{ for all values of } \hat{A}.$$

This proof takes just 3 lines and the students can see it at a glance when they have the figure before them.

The present day tendency is to bring certain easy and interesting portions of College Mathematics within the reach of School students. For this reason I am definitely of opinion that abbreviations, devices like the broken and dotted lines, marking equal lines and angles, more elegant symbols and even modern terminologies of old mathematical terms—e. g., Right triangle instead of Right-angled triangle—are not only relevant but essential in the teaching of High School Mathematics.

T. A. LINGAM.

The fact that the book is also published in Tamil and Telugu speaks highly of its worth and popularity. It is a valuable contribution to the teaching of geography and I have no hesitation in affirming that our students will be the richer for reading such a book.

K. SAJUN LAL.

Revision Papers in Algebra and Geometry

BY

R. Narasimhachari, M. A., L. T.

And

V. Thiagarajan, B. A., L. T.

Oxford University Press. Price 12 as.

The book under review is not a text-book in any sense. It is only a collection of graded assignments in Algebra and Geometry covering the entire field of Optional Mathematics for High Schools. It will be useful in the hands of students of Forms V and VI for rapid revision just before their examinations.

The authors have worked out certain examples both in Algebra and Geometry. Mathematical truths have not changed but the methods of approach to them have radically changed in recent years. In my opinion, the authors would have done better if they had avoided traditional questions in Geometry which call for the general enunciation of theorems or their converse as well as all cumbrous and inelegant proofs, and given a simpler and more direct proof than, for example,

The reports prepared by the several sub-committees appointed last year were very much appreciated. The women teachers held a sectional meeting of their own at which they discussed problems peculiar to Girls' Education.

Mr. Faizuddin, Chairman of the Reception Committee, and Miss D. Webster, Chairman of the Exhibition Committee deserve much credit for the successful way in which they organized the Conference and the Exhibition, respectively.

Reviews

LIVING AND EARNING A LIVING

BY

Helon T. Scudder, M. A., Geog. Dip.

Book I. South India and the Southern Continents
(Oxford University Press)

The book under review is a refreshing change from the traditional method of approach to the teaching and study of geography. In the selection and grouping of facts the writer has displayed consummate skill and sound judgment, and has also succeeded in placing in the proper perspective the relation between the natural phenomena and human activities.

The language of the book is simple and elegant and the book is copiously and variously illustrated. As the book is primarily meant for Indian Students in the High School stage, she has rightly taken up South India first to make the approach to a study of the Southern Continents natural and rational. She has beautifully woven the observational and local work into the study of India. The items at the beginning of each chapter may serve as brief notes to summarise important points and the exercises at the end provide valuable drill on them.

Apart from his administrative talents and statesmanship, Sir Akbar Hydari was noted for his boundless energy, deep learning, his broad vision and his great versatility. At the critical period through which India is now passing, his death is a heavy loss to the country.

We offer our sincere condolences to the members of his family.

The Fifth Annual Conferenec of the All-Hyderabad Teachers' Association.

The fifth annual conference of the All-Hyderabad Teachers' Association was held at the City College, Hyderabad, on 2nd and 3rd January 1942, under the presidentship of Sir Mohammed Yakub, Reforms Adviser to the Government of His Exalted Highness.

In his welcome address, Mr. Faizuddin dealt with the latest educational developments in the State and also stressed the importance of the role of the teacher. Sir Mohammed Yakub's presidential address was very instructive and showed how carefully he had studied the educational problems of India in general and of Hyderabad in particular. We shall deal in a later issue with some of the important questions to which he invited attention.

Several interesting lectures were delivered at the Conference: one on 'Social Hygiene-Education in Schools' by Mr. F. Weber, one on 'Recent Trends in Indian Education by Mr. Khaja Yusufuddin, one on 'Poisonous Gases and the War' by Mr. Abdul Hakeem, and one on 'Individual differences and their significance in Education' by Dr. Shendarkar. All these addresses were of great practical value to the teachers.

Editorial

The Late Sir Akbar Hydari.

We deeply mourn the death of Sir Akbar Hydari, which took place in Delhi on the 8th January, 1942.

Born in 1869, Sir Akbar was educated in St. Xavier's College, Bombay. His connection with the Hyderabad State began in October 1905 when he came here as Accountant General. He was Financial Secretary from 1907 to 1911 and Home Secretary from 1911 to 1920, when for a short period he went to Bombay as the Accountant-General. He returned to Hyderabad as the Finance and Railway Member. In 1937 he succeeded Maharaja Sir Kishen Pershad as President of the Executive Council and held that office with great distinction till August 1941 when he was appointed to the Viceroy's Executive Council.

The late Sir Akbar Hydari rendered valuable services to the State. He was not only a great financier but also a great educationist. To him goes the credit for founding the Osmania University, with Urdu as the medium of instruction. He was also responsible for the scheme for the expansion of Primary education as well as the scheme for the reorganization of Secondary education in the State, providing for bifurcation of studies at suitable stages. He was an earnest advocate of inter-communal harmony and believed that the foundation of national unity should be laid in our educational institutions. It was due to his inspiration and in accordance with the principles laid down by him that the new History text-books now in use in the Primary and Lower Secondary classes were compiled.

very important part. We talk of unity: Can any work be greater,in present conditions, than to have one common language throughout India? Leave Hindi and Urdu aside for the intelligentsia and let us evolve one common language from north to south, from east to west. What a magnificient opportunity there is in this for Hyderabad to lead the whole of India! Individually, I know there are a few highminded men aiming at this, but let us beg His Exalted Highness for a Firman to that end. I have been absent from Hyderabad, unfortunately, for some months, but I believe an attempt is being made to evolve Basic Urdu on the lines of Basic English. Let that Basic be Basic *Hindustani*, understandable by the man in the street all over India, permitting the use of both Urdu and Devanagri scripts for the present. My suggestion may seem startling, but I feel sure that, in years to come, not only all-India but the world would bless His Exalted Highness, who had the vision thus to bring about the unity of the whole country.

Women of Hyderabad, I would implore you to strive for this and lead the country in the path of peace and progress.

---

as well as sorrows,—one another's social festivities, fasts as well as feasts. Let different communities meet oftener and find out what their several festivals and old customs signify, to be able to appreciate them. Advice of unity has come to us, before, from His Exalted Highness, and his good wishes will surely help us in materialising it. Let us women of Hyderabad make a beginning for all India to follow.

I am sure we would all like every Government official to follow the wide and broad views regarding all sections of the population taken by His Exalted Highness.

Hyderabad was a model of unity not very long ago, and harmony and concord prevailed during the last decade of the last centuary, when I first came here as a bride. Have we since advanced or receded? Materially, we have undoubtedly made great progress, but spiritually we have, I venture to say, no doubt with the world-trend, deteriorated, and particularly there has been a tendency to communalism. We should fight that spirit with all the energy at our command. *Laissez faire* is a common weakness of us, Indians, and the efforts of a generation are required to overcome it.

Dear friends, I feel I can count on your forgiving an old woman fully opening her heart to you today—I would not be true to myself, if I did not tell you what I exactly feel on this subject. During the last ten years, I have noticed a slow but insidious change in the outlook of women in the Dominions, and I, who am for full unity, without any reservations, appeal to your sense of love and justice to make a stand against any selfish views that may obtain amongst men, and render unto Caesar what is Caeser's. I am sure none of us want a civil war in India. Our women can exert their influence to prevent strife and bloodshed, which are raging over the greater part of the so-called civilised world.

Another point, which is very near to my heart, is the subject of Hindustani, in which the Osmania University, with all its material, intellectual and spiritual wealth, can play a

Women have entered the field of social service and politics with high ideals. They have not entered in order to accentuate divisons, factions, inequalities and the like, but to raise politics to a higher and purer level and to use their power to improve the lot of the poor—to give them better housing, sanitation, education, medical relief, and better living conditions all round. Lately, I have had independent testimony of how friends from Australia and New Zealand have deplored the living conditions of the masses in India. The work is so immense that just a few individuals cannot do it; we need hundreds of earnest workers. Health and sanitation need most attention, as poor health means low vitality and poor outturn of work.

We do not wish to work in antagonism with our menfolk, but *with* them towards improvement of the present world conditions, with which, I am sure, they cannot themselves be satisfied. A new mentality and a new method of education are absolutely necessary. Just as Germany could educate its youth to look upon war as a necessity, we, on our part, could educate the future generation to a spirit of brotherhood, love and friendship for all. Let us make a beginning in our own Dominions. Communal schools should be barred, as, in my opinion, they tend to accentuate communal feelings. If all schools were non-communal, I am sure you would have a different India in the course of ten or fifteen years. Young men and women will grow up with a spirit of unity as Indians, admiring whatever is good in every religion, and loving and respecting their own, all the more.

As a practical woman, I venture to put a proposal to you. The All-India Women's Conference and our local Conference have often spoken of unity and passed resolutions to that end, but something more is necessary than an expression of that pious wish. I would urge that your wish should take a practical form. Let us start a Unity League to-day. Let none of us belong to any communal organisation, but let us be one big sisterhood, to share one another's joys

WOMEN'S SECTION

Extracts from the Presidential Address

DELIVERED BY

Mrs. Rustomjee Fardoonji,

At the Annual Conference of the Women's Association for Educational and Social Reform (Hyderabad Branch) held in October 1941.

We know our Government is doing a great deal for education, but, to my mind, it is not enough. We should ask for the grant for the education of women being doubled this year. We might be told that, even if this was done, the grant could not be spent, as there was not a sufficient number of trained teachers. But, I am sure we can soon show to Government the insufficiency of the doubled grant. During the first year, more training centres and on better lines should be started; every High School should have a teacher for Domestic Science; school buildings, with equipment, should be attended to; meagre salaries which are the rule should be raised. Education should be nourished, and not starved. Domestic Science should be a compulsory subject in all Girls' Schools beginning from Middle Schools, and all teachers now being trained in Normal Schools should have some training in this subject. An advanced teacher from each training centre should be sent to receive this training.

Training for citizenship should be given in all schools for both boys and girls. This was a matter on which Walashan Princess Niloufer had laid great stress in her Presidential Address, some three years ago. It is only by each and all doing their duty as citizens that our country can advance.

Active Social Service groups should be formed and students taken out to look after certain areas and villages. I know this is being done in some schools, but it should be a part of the curriculum in every school, and it is only in that way that we can bring about the spirit of unity.

President's Closing Remarks.—In his closing speech the President observed, that the Conference was a great success and that the lectures and particularly the sub-comittee reports were interesting and useful. The reports drawn up by the various sub-committees were bound to be of great practical value to teachers. He appreciated the recommendations of the Primary Education and New Education Sub-Committees. He further remarked that the papers which were read on "Poisonous Gases and the War" and on "Individual differences and their significance in Education" were fit to be printed and distributed, as the former would be of immediate use to people all over India and the latter of practical value to teachers. About the resolutions which had been passed, he humorously remarked that they were based on the policy of 'Charity begins at home'. He said that he had been greatly impressed with the orderliness of the proceedings. The Conference came to a close at 5 p. m.

The Members of the Reception Committee then entertained the guests and delegates to refreshments.



Then Mr. Abdul Kareem, Nazir, Gulbarga, moved the following resolution, which was seconded by Mr. Ali Bin Galib, Assistant, Intermediate College:—

"This Conference recommends that the Education Department should prevail upon the Revenue Department to issue orders to the effect that in the Karnatak area of the State the language of the village offices should be Kannada instead of Marathi so that the obstacle in the way of imparting instruction to pupils of primary schools in that area in their mother-tongue may be removed."

While moving the resolution, Mr. Abdul Kareem pointed out that the children of the villages in the Karnatak Area and their guardians insisted on learning Marathi owing to the practice of village office-records being maintained in that language. Any attempt on the part of the teachers to make pupils learn their mother-tongue according to the curriculum was resented. The existing conditions would continue unless and until it was decided that the village records should be maintained in Kannada, the language of the locality.

The last resolution of the Conference which was moved by Mr. Sheikh Abdul Hasan, Divisional Inspector of Schools, Warangal, and seconded by Mr. Syed Mohamed Jawwad, Inspector of Schools, Nalgonda, was as follows:—

"This Conference recommends that the War Allowance granted to teachers in the Districts should be the same as that granted to those in the City as things are dearer in the Districts than in the City".

All the three resolutions were unanimously passed.

Certificates were then distributed by the President to the winners of prizes in the Educational Exhibition. This was followed by the distribution of prizes and trophies connected with the Balda Division Inter-School Extra-Curricular Activities Competition.

This was followed by another sectional meeting on New Education with Mr. Faizuddin in the chair when Rev. G. Sundaram, Principal, Methodist Boys' High School read a report on 'Play Way Method in Education'. The Play Way advocated spontaneous and productive activity on the part of the children. It recommended freedom of expression for children. The child is to be the centre of education and must dominate everything. Corporal punishment was discouraged. The Play Way, as a method of teaching, made school life enjoyable and profitable.

A discussion followed in which Messrs. Qureshi and Towqir Ahmad took part. The report was duly adopted.

The Sectional Meetings came to a close at 12-45 p. m.

Final Session.—The closing session of the conference began at 2 p. m. The proceedings of the various sectional meetings were read and adopted. A short report of the Exhibition was also read.

Two very interesting lectures were then delivered, one on "Poisonous Gases and the War" by Mr. Abdul Hakeem, Assistant Darul Uloom High School and the other by Dr. D. D. Shendarkar, Lecturer, Osmania Training College, on "Individual differences and their significance in Education".

Three resolutions were then moved. Mr. Marghoobuddin, Assistant, Chaderghat High School, moved the first of these resolutions and it was seconded by Mr. Mahmood Ali Beg, Inspector of Schools, Mahboobnagar. The resolution was as follows:—

"This Conference recommends that the children of the non-gazetted employees of the Education Department, whether in service, retired or deceased, be exempted from paying school fees irrespective of the school which they may attend".

Mr. Mazharuddin moved an amendment that 'Conveyance charges should also be exempted,' which was accepted by the mover.

them to be citizens in the real sense of the term. Considering their ages and the limited time available, early steps should be taken to prepare suitable books. The resolution was unanimously passed.

The sectional meeting on Nursery Schools was held under the chairmanship of Mr. Syed Ali Akbar. In his preliminary remarks, the Chairman explained the aims of Nursery Schools and gave a resume of Nursery School work abroad, particularly in England. He also gave an account of the Miss Rachael McMillan Nursery School, London, which he had visited a few years ago. He then discussed the conditions necessary for the healthy growth of children under 5 and in this connection explained the value of Nursery Schools. Speaking about India, he said that a rapid development of this movement in this country was not possible owing to lack of women teachers. He congratulated Miss Webster on opening a Nursery School in Hyderabad. Miss Webster then read a report on the work which is being done in Hyderabad State. This was followed by a discussion. Mr. Qureshi suggested that unmarried women and married women expecting to become mothers should be persuaded to devote their time to this type of work, as it would give them training in bringing up their own children after their becoming mothers. Another delegate strongly appealed to Government to open more Nursery Schools. Such schools, he said, were far more essential to the poor and the labouring class than to the rich and they should have a greater claim on the Government finances than the construction of huge buildings and of cement roads. Mr. Durrani observed that as environment played an important part in shaping the character of children, they should be taken to Nursery Schools and properly trained before bad habits could be formed. The report was unanimously adopted with a request that a special sub-committee should be appointed in 1943 by the All-Hyderabad Teachers' Association for collecting information about Nursery Schools and exploring the possibility of extending the movement.

in the curriculum for adults and that regular statistics of schools in Balda and Districts should be prepared, so that the work might be well organised. Mr. Sheikh Abul Hasan suggested that copies of the two papers should be distributed, that the Department should issue circulars and sanction amounts, that this work should form part of the rural uplift work and that books used in British India, particularly in U. P. and Delhi, might be introduced in our State. Adverting to the progress of adult education in the Warangal Division, he said that Dornakal was a centre for some Telugu Districts in the State as well as the neighbouring districts in British India, that there were 30 schools in the Warangal District and that Telugu Readers, papers and journals were being published for use in those schools. Mr. Qureshi suggested that factories and mills should be made centres of such an activity with the co-operation of their managers, while Mr. P. V. Subba Rao advocated the institution of Refresher Courses in Adult Education for teachers.

Nawab Mir Ahmed Ali Khan then moved the following resolution :—

"This Conference recommends that special literature for purposes of adult education in all the Mulki languages should be prepared very soon".

The speaker pointed out that the demand for such literature would increase with the opening of more schools. It should therefore be forestalled and the available books and literature should be examined. He deplored that no action had been taken so far in this connection, though a recommendation of this kind had been made in a report on Adult Education, which was drawn up by a Sub-committee in a previous year. He suggested that the books to be prepared should be such as would suit the ages of 16 to 50. While seconding the resolution, Mr. Abdul Azeez, Lecturer, Training College, said that besides giving instruction in the 3 R's to the adults, Adult Schools should endeavour to educate

3. They should prepare their lessons carefully.

4. Two holidays a week—Friday and Sunday—and a longer winter vacation should be given to Government teachers if they are expected to do good work.

5. Financial worries prevent teachers from doing good work. Government should see that payment of leave pay etc. is made promptly.

6. Grades should not be lowered.

All the points discussed were unanimously adopted.

Three sectional meetings were held, one after another, in the forenoon of Saturday, the 3rd January. The first was on Adult Education under the Chairmanship of Nawab Mahdi Yar Jung, the Hon'ble Member for Education and Finance. The meeting commenced at 9-30 a. m. In his opening remarks the Chairman referred to his offer of a prize of Rs. 50/- for the best essay on the subject, "The Psychology of the illiterate adult in its relation to adult education and a method of teaching adults based on that Psychology" open to trained graduates and said that out of the various essays received the one written by Mr. Zahid Husain exhibited a grasp of the technique and principle of teaching, while another submitted by Mr. Mahboob Khan showed vast study. As both the essays were good, two prizes were being awarded, instead of one, the first prize to Mr. Zahid Husain and the second prize to Mr. Mahboob Khan.

Messrs. Zahid Husain and Mahboob Khan read extracts from their respective essays and a discussion ensued.

Mr. Md. Sultan narrated his experiences in connection with an Adult School under his supervision and urged that the public should be persuaded to take up the responsibility for this work. He suggested that adult schools should admit boys and girls who were not able to attend schools during the day, that General Knowledge and Religion should be included

2. School Committees be formed even in places where single teacher schools exist.

3. The power to sanction expenditure be vested in the Committee and not in the President.

The Chairman then explained the viewpoint of the Sub-Committee with respect to some of the proposed amendments. The amendments suggested were accepted and the report was put to vote and adopted.

This was followed by a speech on Basic Hindustani by Mr. Fakrul Hasan, Headmaster Govt. High School, Nirmal. He briefly explained the important features of Basic Hindustani and its value and scope. The meeting terminated at 4-30 p. m.

The Sectional Meeting on Girls' Education.—The work of this meeting was divided into two parts. In the first part the question, "Some difficulties of the Aided Primary Schools and how the Women Teachers' Association can help them," was discussed with Mrs. Raza in the chair. A discussion ensued and the conclusions were that the teachers of Government schools should take more interest in and co-operate more with the Aided Schools and that with regard to the difficulties connected with the syllabus, apparatus and the training of teachers, the Hyderabad Women Teachers' Association should plan its programme to suit the needs of these Aided Schools.

At the second meeting which was presided over by Mrs. Jabbar, the question discussed was, "How Women Teachers can make themselves more efficient". Miss Kirkpatrick opened the discussion and put forward the following suggestions :—

1. Teachers should consider teaching a vocation and not merely a means of livelihood.

2. They must keep abreast of modern educational progress.

Sectional Meetings.—Two sectional meetings were held simultaneously, one on Primary Education at the City College and the other, open to ladies only, on Girls' Education at Husaini Mohalla Girls School. Mr. Abul Hasan, Divisional Inspector of Schools, Warangal, presided over the Sectional Meeting on Primary Education. He was the chairman of the sub-committee which drew up a report on "The formation of School Committees for rural schools and methods of bringing about parental co-operation". After the chairman's opening remarks about the report, Mr. Abdul Jabbar Subhani read the Sub-Committee report and its recommendations. Mr. Zulfikhar Ali Khan remarked that the maintenance of the records and registers relating to the school committees would be too heavy a task for teachers of schools staffed by only one or two teachers. Mr. Syed Ali Akbar was the next speaker. While commending the report, especially that part of it which dealt with the difficulties of village school teachers, he supported Mr. Zulfikar Ali's views. On the question of differentiating the curricula of boys and girls, he expressed the view that as in the primary stage only basic subjects were taught, there was not much scope for such differentiation in that stage except as regards Domestic Science, though he considered it necessary that the detailed syllabuses and books on some of the subjects should be different. He thought that there was no need for the school committees to raise subscriptions for school equipment, as sufficient provision had already been made for it under the expansion scheme. They should instead try to supply books and proper food and clothing to poor students. He referred to the woeful condition of personal hygiene amongst the school children and suggested that the school committees should pay special attention to this question. The following further amendments to the recommendations of the sub-committee were proposed:—

1. A register of boys and girls of school-going age should be maintained in each village Primary School.

"The period of training for under-graduate teachers should be extended from one to two years"

This resolution was moved by Mr. Sardar Ali of the Training College. On the analogy of the system of teachers' training obtaining in other countries and on the basis of the importance of the work entrusted to teachers he expressed the opinion that one year was too short a period for Matriculates and Intermediates to acquire a fair grasp of the fundamentals of teaching and an adequate knowledge of the contents of the various subjects. Mr. Khaja Yusufuddin seconded the resolution. Mr. Md. Sultan, teacher, Govt. Nampalli High School, opposed it. He drew attention to the fact that an extension in the period of training would increase the financial difficulties of the teachers who had to take leave on half pay in order to undergo training. Nor did he think that the practical value of training would be enhanced. Mr. P. V. Subba Rao also opposed it on the ground that extending the period in the case of Intermediates was unnecessary as one year course prescribed for them in Madras for the last five or six decades has not proved insufficient.

The mover of the resolution then explained how the extension of the training period would curtail the period of probation in schools by many years and thus more than compensate for the extra year spent in the Training College. The resolution was put to vote and lost.

This was followed by a speech in Urdu by Mr. Khaja Yusufuddin, Lecturer, Training College, on 'Recent Trends in Indian Education.' He dwelt upon the merits and the demerits of the Wardha Scheme and described other recent developments in education in India in their various aspects. He then also dealt with the Re-organisation Scheme introduced in our State, which he thought to be sound in principle. He referred to the Osmania University's unique position in India and closed with the suggestion that a university corps might be started and that the curricula for boys and girls should be different. The opening session closed at 12-15 a. m.

Sir Mohammed Yakub then delivered his Presidential Address in Urdu. He paid a glowing tribute to the profession and referred to the high respect in which teachers were held in our country in the past. He observed that the process of educating was a very responsible task which could be entrusted only to persons actuated by a love of their pupils. He rightly remarked that the bane of our society at present was a feeling of inferiority complex and that the teachers should try to foster in their pupils courage and self-respect. He deplored the tendency to indiscipline among the present day students in the name of independence and exhorted the teachers to secure discipline by new methods and in co-operation with the pupils' parents to encourage constructive activities and discourage destructive tendencies. He brought to the notice of the teachers and the taught the valuable Firman in which His Exalted Highness had advised pupils to refrain from taking an active part in politics. He drew the attention of the Department to the inadequate salaries paid to teachers and hoped that the Government would not grudge expenditure in the matter of education. He commended the lines on which educational reform was being carried out in the State, emphasised the study of Religion and the need for a special Inspector for inspecting religious instruction in schools. He also urged that immediate steps should be taken to provide more schools and teachers for girls.

Mr. F. Weber, Principal, Government College of Physical Education, spoke on Social Hygiene-Education in Schools. He prefaced his speech with the remark of an Australian Parliamentarian about the value of teaching Biology to pupils in raising the standard of human life and observed that as Social Hygiene was one of the basic problems of life it was an important duty of teachers to give proper guidance to pupils in the matter of controlling their sex instinct in their family circles as well as society circles.

After this speech the following resolution was moved:

Now while that astounding growth is going on and probably there is the same mental growth, the child must need the right food and plenty of rest, relaxation, and activity.

Proceedings of the Fifth Annual Conference of the All-Hyderabad Teachers' Association.

BY

K. B. Aiyer

This year's Educational Conference which was held at the City College, Hyderabad, was the third of its kind to be held there. As usual, an Educational Exhibition had been organised along with the Conference. It was held at the Model Primary School and opened on Wednesday, the 31st December, 1941 at 5 p. m. by Sir Mohammed Yakub, Adviser for Reforms to H. E. H. the Nizam's Government and the President of the Conference.

A meeting of the Council of the Association was held on Thursday, the 1st January, at 10-30 a. m. at the Office of the Director of Public Instruction under the Chairmanship of Mr. Mohamed Hussain Jaferi, the President of the Association. At this meeting, besides other items of business, the resolutions to be moved at the Conference were decided upon and the Office bearers for the year 1942 were elected.

The Opening Session of the Conference.—The first plenary session of the Conference, held at 9-30 a. m. on Friday, the 2nd January, 1942 opened with the reading of the Welcome Address by Mr. Faizuddin, Divisional Inspector of Schools, Balda. It was a well-conceived and complete account of the recent educational developments in the State. He also dealt with the role of teachers as guardians of the future generation. This was followed by the General Secretary's report on the work of the Association for 1350 Fasli.

Absolute regularity should not be enforced in any nursery school. There are times when a mother must have her child to herself, to teach those things which only a mother can.

Suggestions.

1. Could a committee be formed to function throughout the coming year in collecting information about nursery schools here and abroad? In collecting information about Hyderabad things especially necessary under Hyderabad conditions should be noted, e. g.,

a. The districts which advocate wheat as the chief food.

b. In some districts the nursery school would need to function for a longer part of the day while the parents worked in the fields.

c. Around mills different hours and conditions would be necessary etc.

2. There should be a very close touch with the Medical Department in some way, or the controller of each nursery school should constantly consult a doctor who is interested in this work.

3. Nursery schools are very definitely women's work, but as in a few other things we can't get on without the help of men. We look to the men to finance this great project. Women are not at the helm of the good ship "Finance", (perhaps it is just as well they are not), so we appeal to the men of Hyderabad to become more interested and help forward this work of child nurture.

May I close with one instance to show how vital this work is?

In the nursery school of St. George's we have been recording the heights and weights of the children, every month so that now we have records for 4½ years.

From these records we have found that children between the ages of 3 and 4½ years grow ½ inch in a month.

Gardening and the singing of simple songs and games are included in the programme. Special attention is given to habit training and the children learn how to keep their own garden, their own hands, teeth and hair clean.

No formal lessons are given.—The teaching of reading and number work is not begun, but every chance is given to them to learn the use of their hands and senses by letting them draw on blackboards, model with clay, play with water in flat dishes, and dramatise stories, and by general conversation concerning the happenings in their surroundings.

The Teachers or those in Control.—Even in the smallest nursery school there should be at least two teachers. These should not be women who have been trained to teach in ordinary schools, but they should receive a special training. We must remember the nursery school must be more like a home than a school. Women should be chosen who have a special aptitude and love for small children. This training has been commenced in a small way by Miss Swinnerton in the Medak district and then especially for the nursery schools in her district and rural areas.

In the city, so far nothing has been done, but we trust that before long Government will be able to take up this piece of work for the very young that is urgently needed.

Nursery schools are needed is those districts where both parents go out to work all day.

Nursery schools are needed where mothers do not know how to care for their children properly. Here the nursery school could be the centre of welfare work, where the mothers could learn better ways of handling their babes.

Nursery schools are needed for children who spend a great deal of their time with ayahs, who are usually untrained, and often dirty in their habits, and who think their chief work is to keep a child quiet.

In the nurseries for the poor children, each child is provided with a set of clothes, a towel and comb, each clearly marked so that they can always use their own property. Bathing is included in the daily programme and arranged so that the children learn to do this themselves and enjoy learning to be clean.

In the nurseries for the children of well-to-do parents, the towels etc are provided by the parents.

A period of rest and sleep is arranged after midday.

In the poor districts, as far as is financially possible, the children are given some kind of nourishment. In some cases powdered milk is provided and a wheat *cungi* sweetened with brown sugar is given.

In the nurseries for well-to-do children the food is brought from home, with the exception of milk, which is provided by the authorities. In these schools the chief work is to cut down the amount of rich food, the total amount of food and to encourage the eating of more fruit and Vegetables. In one school during the year 1941 almost the whole junior school of 250 children, had a piece of fruit each day. This sounds an easy thing to accomplish, but was in fact a stupendous job. Some of these schools are beginning to arrange food for the midday meal to be bought by the children. The menu is to include simple rice and curry dishes, custards, junkets, raw and stewed fruits in season etc.

In order that the children may develop their powers of initiative and control, plenty of opportunity is given for play. Toys of a constructive variety such as bricks, cars, sand etc. are provided and the teachers are specially trained to watch the children in their play and encourage and help them when needed, but not to interfere if the children are happily occupied.

Report on "Nursery Schools in Hyderabad State"[1]

BY

Miss D. Webster,

Head-Mistress, Preparatory Section, St. George's Grammar School.

Very little work has been done along this line in Hyderabad State, but what is being done is being done well, and a good beginning has been made. The public, rich and poor, is learning something of the value of the Nursery School and beginning to use the existing ones. This will call for the opening of many more as their worth is proved.

Nursery Schools exist in the Aurangabad area, mostly carried on by private committees and friends. There are quite a number in the City and suburban areas of Hyderabad, and the Methodist Mission have some in Ibrahimpatnam, Karimnagar, Wadiaram, Medak and Masheerabad. There are also a few in Secunderabad under the Welfare Centre Committees. Having summed these up, one realises how many more are needed.

Age of Children.—The children are received from the ages of 2 to 5 years. Occasionally a child of under two is admitted with an elder sister or brother, but the admission of these babies is limited.

The average number of children on the roll in each school is about 30.

Aim of Schools.—To train the child in good habits of cleanliness, self-reliance, truth, honesty and helpfulness to others and each other. Simple religious teaching is given in some schools.

The care of the bodily health of the children is also considered an important part of the work.

---

1. This report was read at the Sectional Meeting on Nursery Schools at the Fifth Annual Conference of the All-Hyderabad Teachers' Association.

Another very complicated question which claims our serious attention is the question of students taking part in politics. There can be no objection to students of college classes taking interest in present-day politics and equipping themselves with the necessary knowledge of political science, but it has now been admitted by all thinking people in this country that it is highly dangerous and undesirable for students to take part in practical politics. Recently His Exalted Highness the Nizam has issued a Firman giving golden advice to the students of Osmania University on this question. This Firman of His Exalted Highness is worthy of being written in letters of gold, and students cannot find a better or a more even path to tread upon than the one which is laid down in the Firman of His Exalted Highness.

To-day we are assembled here at a momentous time in the history of the world. The conditions prevailing in the world to-day are causing the greatest anxiety. Crowns are tumbling down and thrones are being overturned, and the countries of Europe which were priding themselves upon their freedom are now slaves of brute force. Western education, which once dazzled the eyes of the world, seems now to be falling into the abyss of destruction. The war is now on the border of India and there is a fear that it may spread to our country. At a time like this it is our duty to do our utmost to help the cause of justice and righteousness.

is a good deal of heart-burning in India against the present system of education, and our experts have in their speeches and writing declared the crying need for reform in this matter. But the pace of reforms in our country is very slow. Moreover it is not easy to mend the blunders of about a century all of a sudden. There is no reason why in these Dominions where the ruler and the ruled belong to the same country and where we have full freedom in the matter of the administration of education, we should continue to tread upon the wrong path, and why a system of education should not be evolved which will have in it the good points of both the Western and Eastern systems of education. The courses of studies should be adapted to our peculiar needs. I am glad to learn, however, that attempts in this direction are being made.

The world is to-day enveloped in the darkness of materialism and indifference to religion. Nazism, Fascism and Bolshevism are all different phases of atheism.

In Europe, people, generally think that religion is only a contrivance for keeping ignorant people in good humour and that religion has no place in an increasingly scientific world. The result of this outlook is the present-day warfare with its indiscriminate butchering of men, women and children. The scientific researches on which the West has prided itself have now resulted in destruction and annihilation. As long as Hindus and Muslims in this country practised their religion in the right manner there were no such religious feuds and disturbances as we find in India to-day, and the bloodshed and riots which generally take place in the name of religion are in reality the results of neglect of religion. Therefore, religious instruction must necessarily find a place in our curriculum.

H. E. H. the Nizam has conferred a very great boon upon his people by making Urdu the medium of instruction in the schools in his Dominions, and, under the patronage of His Exalted Highness, Urdu is making rapid progress all round.

to realise that the future progress and welfare of a country depend upon the complete education and correct training of young men.

The system of education in India is based upon the passing of examinations, which depends on memorising. Every teacher and student considers the main object of education to be the passing of an examination and the obtaining of a degree; and neither students nor teachers take any interest in matters which are outside the orbit of examinations. Under our old system, education was imparted for the sake of knowledge and attention was paid to the development of the students' mind and character. This object is now altogether lost sight of.

Before the Mutiny of 1857 the official language in India was Persian, and education in Arabic and Persian was considered to be the hall-mark of a gentleman. After 1857 when the reins of the Government of India were taken over directly by Queen Victoria and the British Parliament, English was declared to be the court language of British India; and the Indian States also followed this system of education in their schools. In my opinion, it was sheer injustice to force the people of this country to acquire a knowledge of English for the convenience of a handful of Englismen who came out to India to serve here for a few years. Justice demanded that these people should have been made to learn the languages of this country, and before the Mutiny, during the time of the East India Company, all the high English officers knew Urdu and Persian very well and some of them even learnt Arabic; and even to-day the officers of the Political Department know Persian, Arabic, Pushtu and other languages very well. But even if it were permissible to make English education compulsory in British India, there can be no justification whatsoever for making English the medium of instruction in Indian States.

Our great misfortune is that we are made to put on the cast-off clothes of the British. The system of education which is obsolete in England is still prevalent in India. There

himself. Teachers should also pay special attention to removing the feelings of fear and timidity from the minds of children. Ignorant mothers implant the ideas of superstition and fear in the minds of their children. It ought, therefore, to be the particular concern of teachers to foster courage and cheerfulness in the minds of students. It is of the utmost importance that our young men should be trained to think nothing of death and to believe that the end of this happy life is the beginning of everlasting peace.

In the matter of the education and the training of children, co-operation between home and school is very necessary. Without this co-operation and mutual confidence between parents and teachers, the education and the training of a child cannot go on satisfactorily. In order to achieve this object ways and means should be devised for teachers and parents to meet each other and exchange views about the education of their children.

The maintainance of discipline amongst students is one of the most important and difficult duties of teachers. There are two ways of keeping discipline among students, the penal and the persuasive. There is no doubt that corporal punishment produces prompt results. Persuasiveness requires an environment which it is not always in the power of a teacher to create. In my opinion, the solution of this difficulty lies mostly in the establishment of good relations between the teachers and the taught. There should be cordiality between the teacher and the taught, and students should be encouraged to discuss freely with their teachers questions of importance. Youth is the spring time of habits and aspirations, and this is the time when students undertake difficult work without any fear. It will not be right to curb their aspirations. At the same time, it is the duty of teachers to make the boys understand that national problems have never been solved in other countries by revolutionary methods. Disobedience and law-breaking cannot bring about the solution of our problems. Students should be made

in their minds. The pleasure and satisfaction which one feels by doing constructive work cannot be produced by destructive activities, and once a taste for it is created it will produce in the minds of your children a sense of the useful, and would serve as a guide for their future lives. A feeling of individuality will also be created in their minds by doing constructive work. When children see the useful results of such work with their own eyes, they feel encouraged to go on with it, and destructive tendencies are left behind. But it is not an easy task to persuade the student to take to a constructive programme; it requires a great change in the attitude of teachers towards their students. It is obvious that destruction is much easier than construction and requires no great thinking and intelligence. Moreover, the results of destructive work are more visible than those of constructive work. But the pleasure derived from destructive work is momentary. To offer destructive criticism of the work of others has become the fashion in our country. We often focus our attention upon the faults and shortcomings of others and seldom make an effort to appreciate their virtues.

It is sometimes said that this is an age of freedom and every man has a right to express his ideas freely. But freedom is very often abused and is more often directed to fault-finding and backbiting. It is, therefore, necessary that children should from a very early age be taught to do some constructive work. For instance, to teach children in the lower classes the art of making wooden or clay cottages and to train them in the art of gardening are diversions which would instill in their minds love of constructive work. Another help in this direction is for every teacher to have a hobby of his own as a teacher's hobbies are easily picked up by the students.

There is one thing more which requires special attention on the part of teachers: they should not allow any inferiority complex to be formed in the minds of children. A student should always be encouraged to form a good opinion of

given to our children in the early period of their lives. Any mistakes in this respect cause irreparable loss and harm; therefore, the training of teachers and the supervision of the system of education demand the greatest care and attention. The All-Hyderabad Teachers' Association deserves all praise for having undertaken this important duty. Fortunately, your sphere of activities lies in a territory, the Ruler of which is renowned for his love of learning and for his appreciation of the services of scholars, and where the Government is in every way benevolent and sympathetic.

A teacher should first study his own character and see if there are any such shortcomings in him as would hinder the progress of the children. Before criticising the pupils and finding fault with them, he should set himself right, and although it is very difficult for every man to become perfect and free from shortcomings, a teacher should at least be able to make a scrutiny of his own vulnerable points before pointing out the weaknesses of the children.

There can be no doubt that the example of the teacher has a very great influence upon the character of children, who unconsciously copy his habits and qualities. A teacher is like a mason who undertakes the responsibility of moulding human beings in his factory, and, in my opinion, this art is as complicated and difficult as it is great and elevated. The duty of a teacher does not end with his pointing out to a student the mistakes he has committed. He should try and present in his own life a model for the young students to copy.

Unfortunately, students these days are showing an inclination towards destructiveness. The reason for this is not far to seek. We do not divert the attention of our students towards constructive work and we do not place before them a complete and correct programme of work. If a constructive programme is included in the every-day work of the students, destructive tendencies will have little chance to find a place

Presidential Address delivered at the Fifth All-Hyderabad Teachers' Conference

BY

Sir Mohammad Yakub,

Adviser for Reforms, H. E. H. the Nizam's Government.

(EXTRACTS: TRANSLATED FROM URDU.)

The present age can truly be called the age of conferences and national gatherings. In our country there are so many national institutions and organizations that it would be impossible to number them. But, in my opinion, your organization and your conference have a particular importance and distinction. It is you educationists who produce politicians, reformers, statesmen and leaders. You are the main-spring of all the movements which contribute to civilization and social welfare; and the foundations of public weal are laid by you. The status and position of a teacher have been held in such high esteem in every age and in every country that even crowned kings and mighty warriors have paid their homage to them. The position of a teacher was particularly exalted in oriental countries, and more respect and consideration were paid to him than even to one's parents.

But this status carries with it great and varied responsibilities. The work of nation building, which is ultimately the task of the teacher, is not an easy one, and to train the clay-made man to be the overlord of Nature is a piece of work which demands the finest workmanship. There is nothing in the world which calls for more brain-work and common-sense than to educate and give training to small children. The duty of a teacher is not merely to make children able to read and write, but to give them sound training and to improve their character, on which depend the welfare and prosperity of nations. Sometimes the slightest mistake or carelessness on the part of teachers can lead to the set-back not only of one individual and of one family but of an entire community. Our national evolution depends upon the education and training

conferences when the Inter-Primary and Inter-Middle School Tournaments and Sports were conducted. Along with the Subah Sports and Tournaments a very successful Trophy Scout Display was also arranged for. The Hon'ble the Education Member gave a rich donation to the Subah Teachers' Association Club at Warangal.

(12) *The Women Teachers' Association, Balda.*—The Headquarters Branch of the Association has seven centres of activity. While a common programme was followed in all the centres, the plan of deputing a teacher of one school to speak at another centre stimulated discussion, making it more useful and interesting than usual. The Warangal Branch held 12 meetings during the year. The Branches at Gulburga and Raichur did useful work. The Primary School teachers take part in the meetings specially arranged for them at certain special central places. The Annual Conference of the Association was held at Gulburga this year.

(13) *The Women Teachers' Association, Aurangabad.*—The programme drawn up by this Association was closely followed in all its centres of activities.

Finance :—The year 1350 F. opened with a balance of Rs. 184–2–10 and closed with Rs 236–10–5. Mr. Baqar Mohiuddin, Lecturer in Commerce, very kindly audited the accounts of the Association. He found that they were properly maintained and the instructions given in the previous year had been carefully carried out.

The Hyderabad Teacher: We are very grateful to the Editors of *The Hyderabad Teacher* who have been carrying on their honorary work with commendable zeal.

In conclusion, I thank the organisers of this Conference for the arrangements they have made, at such short notice, to hold the Conference here this year.

K. B. AIYER,
General Secretary.

schools followed the programme of work chalked out by the Association. Gulburga, Raichur and Mahboobnagar held their respective District Conferences which were all well-attended. A Mushaira was also held along with the Conference at Gulburga.

(8) *The Aurangabad College Association.*--The five Sub-Committees for English, Urdu, Mathematics, Science, History and Geography, which were formed last year, did very useful work during the present year. Papers on six different topics were read in each of the five sub-committees, thus making a total of 30 sittings. Each sub-committee has got its own library which consist of books on the technique of teaching.

(9) *The Aurangabad Division Association*—During the year under review discussions were held in the various centres on 10 educational topics chosen in common for all the centres and demonstration lessons suited to the needs of the different centres were also conducted. Special care was taken to make the discussions and lessons interesting and useful. Nanded and Nizamabad District Associations held their respective annual conferences and most of the High Schools and the Teachers' Training Schools celebrated their school days.

(10) *The Warangal College Association.*—To benefit all members of the Association monthly meetings are held when papers of general interest on educational topics are read and discussed or demonstration lessons given. Sectional societies also conduct meetings, their scope of work being limited to one particular subject or allied subjects. During this year there were seven monthly meetings and several meetings of the sectional committees.

(11) *The Warangal Division Association.*—During the year under report the Subah Conference was not held owing to the holding of the All-Hyderabad Teachers' Conference at Warangal. All the District Associations held their respective

(2) *The Training College Association.*—During the year 12 meetings of the Association were held when lectures were delivered both by members of the staff and outsiders on topics of educational and social interest. The meetings were well attended and the members showed their interest by participating in discussions.

(3) *The Citg College Association.*—The activities of this Association were confined to the practical problems which confront the teacher in his day to day work e. g., 'Freedom in Education', 'Discipline in Schools' etc. The Association also interested itself in the problem of Adult Education.

(4) *The Chaderghat High School Association.*—The Association held 6 meetings. Three papers on educational subjects were read and 3 demonstration lessons were given. An excursion was organised for the benefit of the members of the staff. The Reading Room and the Teachers' Club are serving their desired end.

(5) *The Secunderabad Teachers' Association.*—This Association works at two centres—one at Secunderabad and the other at Bolarum. The Association arranged for a dozen interesting addresses by local educationists. There were also certain demonstration lessons and excursions. The Association conducted a Badminton Tournament. A recurring annual grant of B. G. Rs. 150/- has been made to the Association by the authorities of the Administered Areas.

(6) *The Gulburga College Association.*—The Association works as usual under two sections, one controlling the curricular activities and the other, the leisure hour activities. It is also taking a lively interest in several activities which closely concern teachers and students.

(7) *The Gulburga Division Association.*—Many of the schools of the Division were closed during a part of the year on account of plague and the work of the Association was thereby interrupted. During the active part of the year the

3. Girls' Education—'Education of Adult Women'.

President—Miss J. Nundy, Inspectress of Girls Schools, Balda.

Secretary—Mrs. T. Akram.

Owing to the long absence of Miss J. Nundy on sick leave and the withdrawal of the Secretary from the Committee, no report was prepared on the subject. The Women's Section has, however, made arrangements to discuss certain topics connected with Girls' Education, at a Sectional Meeting of this Conference.

4. Nursery Schools.

President—Mr. Md. Osman, Divisional Inspector of Schools, Aurangabad Division.

Secretary—Mrs. Osman, Inspectress of Girls' Schools, Aurangabad Division.

As no report was received from Aurangabad, Miss D. Webster, Superintendent, Preparatory Section, St. George's Grammar School, was good enough to prepare one in consultation with Miss Swinnerton of Medak Mission. Miss Webster has also kindly consented to open a discussion on the subject under the chairmanship of Mr. Ali Akbar.

The reports of these committees will be placed before you for discussion in the sectional meetings.

(1) *The Balda Division Association.*—The number of constitutent Associations was 15 during the year, as against 14 in the previous year. The Executive Committee met five times and transacted routine business. The affiliated Associations arranged for discussions and demonstration lessons on the Play Way in Education and a list of 9 subjects was drawn up. Interesting discussions were conducted on suitable subjects. Annual Conferences were held in Balda and Medak.

with that Conference. The Association is thankful to the Reception Committee, particularly to its Chairman, Mr. Badruddin, Subedar, Warangal Division, and to the Presidents of the Local Associations, Messrs. Ahmad Husain Khan and Sheikh Abul Hassan, for the arrangements they had made and the hospitality they extended to the delegates. The proceedings of the Conference have appeared in the January—March 1941, issue of *The Hyderabad Teacher*.

It was originally intended to hold this Conference at Aurangabad, but owing to war conditions and other reasons it was subsequently decided to hold it here.

During the year under report four Sub-Committees were formed to draw up reports on the following subjects :—

1. Primary Education with reference to the formation of School Committees, their duties and responsibilities, and parental co-operation.

President—Mr. Sheikh Abul Hasan, B.A., L.T., Divisional Inspector of Schools, Warangal.

Secretary—Mr. S. Raheemuddin, M. A., Inspector of Schools, Warangal District.

Owing to the transfer of Mr. Ahmadulla from Warangal, Mr. Rahimuddin was requested to take his place as Secretary.

2. 'New Education' with special reference to the 'Play Way in Education'.

President—Mr. M. Faizuddin, M.A. (Cantab), Bar-at-Law, Divisional Inspector of Schools, Balda.

Secretary—Rev. G. Sundaram, M.A., Principal, Methodist Boys High School.

As Mr. Nurool Hasan, the Secretary of the Sub-Committee, was deputed to other duties, Rev. G. Sundaram was asked kindly to take his place.

Though he was a nationalist of nationalists, yet his sympathies transcended racial and geographical barriers. Despite his admiration of, and 'cultural sympathies with, Japan', he took the first opportunity to denounce her aggression-against the Chinese.

A Versatile Genius.—His genius was versatile. Not only did he rise to Olympian heights in poetry and give to the world a cycle of lyrics which she will not easily forget, but he was a playwright, a novelist and a short story writer of no mean merit. His plays have been staged in India and various countries of Europe, and his stories, such as the Mastu and the Kabuliwala, rank among the best of their kind. Besides this, he was a painter, a musician and an actor. It can truly be said of him 'that he did not touch anything which he did not adorn'.

He was the best embodiment of the cultures of the East and the West, and, now that he has broken the material bonds, his soul must have flown back to its Maker, the eternal fountain of Beauty and Love, of whom it sang so passionately while on earth.

All-Hyderabad Teachers' Association

Report for the year 1350 Fasli (1940—41).

I have great pleasure in submitting the Fifth Annual Report of the All-Hyderabad Teachers' Association.

The last Conference was held at Warangal on the 11th and 12th January 1941. The Hon'ble Mr. Syed Abdul Aziz, Member for Judicial and Ecclesiastical Departments, conducted the proceedings of the Conference and opened the Educational Exhibition which was organised along with it. The Warangal Subah Association and the Warangal Intermediate College Association, which had invited the Conference to Warangal, were responsible for the arrangements connected

reputation that the event of its publication is likely to mark a new epoch in English literature".

The whole amount of the prize (£ 8,000) was devoted to Shantiniketan, which remained one of the important objects of his life for two decades. His efforts bore fruit and the school developed into a 'world-renowned seminary to which scholars and savants have been drawn from all parts of the world'. Along with his great poems, plays, stories and novels, Shantiniketan will also remain a monument to his memory.

Viswabharati and Sriniketan.—Like the Shantiniketan, grew the Vishwabharati which came into existence later. It also has several original features, combining the best in ancient as well as modern education. To these institutions was added Sriniketan, which trains young people 'for agriculture, handicraft and rural uplift in general'.

Honours were showered on Tagore throughout his life. Many Universities, in India (including Osmania University) and abroad, conferred honorary degrees upon him. Wherever he went he was welcomed as a great poet, sage and philosopher. His photographs adorned the first pages of the newspapers, and men and women flocked in thousands to hear his addresses and to pay him their personal homage. The Government of India knighted him, but he resigned his title after the tragedy of the Jallianwala Baugh.

His Patriotism.—One of the most important features in Tagore's character was his intense patriotism. The miseries and the downtrodden condition of his fellow-countrymen had moved him as nothing else had. He invariably championed their cause and insistently advised them not to lose hope in the future of their beloved country. He resigned his Knighthood as a protest against the treatment meted out to his fellow-men in the Punjab; and shortly before his death, from his sick bed, he raised his voice against the charge of ingratitude levelled against the Indians by Miss Rathbone.

He proceeded to England in his seventeenth year with the object of studying law, but later he gave up this idea and studied English literature and European music instead. On his return home he wrote a musical play in which though the 'tunes were mostly Indian yet they were adaptable to a variety of treatment'.

During the years that followed he wrote a number of poems, including evening songs, morning songs, pictures, songs etc., into which, according to an admiring critic, he poured the melody of his heart. They were mostly concerned with love and the beauty of nature, and "stand supreme as examples of the best in lyrical poetry'. They very soon gained popularity in Bengal, which made him remark, "My poems have now come to the doors of men".

Now comes the short story period. In simple tales he wrote of what he saw around him in the villages of Bengal and "put in them the simplicity, the humanity and the faith that characterise the Indian peasant". His poetry, in the meanwhile, was growing deeper and acquiring a philosophical and religious character. His hymns, as can easily be seen, contain the essence of devotional poetry.

Shantiniketan. It is a well known fact that Tagore's experience of school life was not a happy one. He had a great desire to found a school which should bring the young into closer touch with nature and inspire them with nobler ideals. The result was Shantiniketan, about which he says, "I sold my books, my copyrights, everything I had, in order to carry on the school. I cannot tell you what a struggle it was and what difficulties I had to go through".

Gitanjali and the Nobel Prize.—After some time *Gitanjali* was written, and when translated into English it earned for Tagore world-wide fame which culminated in the award of Nobel prize. In the words of Mr. C. F. Andrews, "It has already been declared by men of the highest literary

passionately fond of nature. Oh, it used to make me mad with joy when I saw the clouds come up in the sky one by one. I felt even in those very childish days that I was surrounded with a friend, a companionship very intense and very intimate, though I did not know how to name it". Thus even in his childhood Rabindranath was revealing unmistakable poetic tendencies.

Education.—His education began at home under a tutor and then he went to school with his elder brother. "But what I learnt there I have no idea", says he in his reminiscences, and adds, "My initiation into literature had its origin in the books which were in vogue in the servants' quarters—chief among these were a Bengali translation of Chanaka's aphorism and the Ramayana of Kritivasa".

At the age of eight Rabindranath wrote his first poem, and encouraged by his elder brother 'launched upon the great adventure of being a poet'.

He acquired from his school and tutors whatever knowledge he could pick up, which included 'literature, mathematics, geography, history and Sanskrit grammar'. He had also lessons in English and music. Among the things that made a great impression upon his mind at this period of his life were certain poems by Kalidasa, Jayadeva's 'Gita Govinda' and the 'Old Curiosity Shop', none of which he fully understood, but, as he says, "Children and those who are not over-educated dwell in that primal paradise where man can come to know without comprehending each step".

His Early Attempts at writing Poetry.—The first poems of this budding poet were published in a new Bengali magazine, "Gyankur", and the literary qualities of these boyish attempts were sufficiently remarkable (though the poet later showed much diffidence about them) to merit the attention of a good many.

Rabindranath Tagore

BY

Khaja Yusufuddin, B. A., M. Ed. (Leeds),

Assistant, Osmania Training College.

By the death of Dr. Rabindranath Tagore mother India has lost a son who did much to place her prominently on the cultural map of the modern world. To millions in the Far East and the distant West, India is known largely by the names of Tagore, Iqbal and Gandhi. In the words of Mrs. Sarojini Naidu, he was the greatest ambassador that India could send to the four corners of the World.

Not only India but also the world is poorer by his death. He was one of those very few towering personalities of whom humanity can justly be proud. As a lover of nature and the singer of eternal melodies, he found his way to the hearts of millions all over the world, transcending the barriers of race, caste and creed. He was a poet of vision—a Rishi, who not only was concerned with the present but could look far into the future. His immortal poems struck the inmost chords in the human heart and made it long for the eternal, the all-pervading and the all-beautiful. The spiritual joy which his songs gave even to the learned and the wise, and the avidity with which they read them can best be described in the words of W. B. Yeats, who in his introduction to Gitanjali says, "I have carried the manuscript of these translations (The Gitanjali) about with me for days, reading in trains or on the top of omnibuses and in restaurants, and often had to close it lest some stranger should see how much it moved me".

Birth and Childhood.—The second son of Maharishi Devendranath Tagore, the great leader of Brahmo Samaj in Bengal, Rabindranath was born in 1861 and was destined to be 'the harbinger of a cultural and literary renaissance in India' and a prominent figure in the International world of letters. From his very childhood he had a great love of nature and revelled in communing with it. Says he, "I was

incomprehensible or even meaningless without reference to something higher. We live and move and have our being in the Deity." From a strong faith in God and trust in Him you will find that you derive great moral and spiritual strength in your daily work and support in the hour of trial and tribulation.

I am sure our Universities are capable of attaining to all these ideals. If they can produce men who are sportsmen and gentlemen in the best sense of the word, and at the same time men of high culture as well as erudition, the time, labour and money spent on the Universities will have been repaid a thousandfold.

One word about the war before I close. The war is our war as much as that of anybody else. We are fighting in defence of our country, our liberties and of the ideals for which our whole educational system stands. It is absurd to bargain or to propose any conditions for defending our own hearths and homes and everything we hold dear. This is no time for party strife or internal dissension. Let us unite and face the common danger. We must prepare and organise ourselves for defence, and all other considerations must be subordinated to this stern necessity. Education alone must go on, for to interrupt or retard it would be false economy. In the words of His Excellency the Viceroy, "Education is a vital service and it should not be interrupted."

I thank you again for having given me the opportunity of addressing you on this occasion.

---

centres of remarkable intellectual activity, and not seldom of original research; but what usually takes place in most Indian Universities is intensive cramming during term time followed by an orgy of examinations at the end of the term. The social amenities and cultural activities which one associates with 'varsity life are rarely to be found. Conditions, however, are now improving, and in most of our residential Universities attempts are being made with some success to interest the students in things other than their text-books. I am glad to see that in the Andhra University extra-curricular activities of a great diversity of interest are provided.

In a residential University much benefit can be derived by the students living in the same precincts with professors or dons of high character and great erudition. It is said about Erasmus that when he declined to lecture at the Leyden University on the ground that he was too old to do so, the University informed him that he need not take the trouble to lecture as his mere presence and inspiration were considered a liberal education for the young men.

In physical culture we may take a lesson from the Swedes and Czecho-Slovaks who have shown what a national system of such culture can do to make a people strong, and to reduce to a minimum disease and bodily infirmity. It should be possible for our Universities to take the lead in promoting a system of physical culture which would help our young men to become strong and capable of making good soldiers.

It has been well said that one of the surest marks of a gentleman is that he instinctively avoids hurting the feelings of others. I think this is an excellent test of the good manners that we have a right to expect from young men with a University training.

Finally, I do not believe in a godless education. Religion must be assigned its rightful place in any University scheme. To quote my own words in a speech delivered elsewhere, "Our life is not the alpha and omega of existence and would be

education. Unfortunately our University courses are too often dominated by examinations, and the interest of the student seems to him to lie in learning by rote such answers as he considers will "pay" in the examination. But, given enthusiastic teachers who enter into the spirit of their subject, the present defects can be overcome and the studies made both richer and more interesting. Perhaps examinations also can be so devised as to discourage cramming.

What is the aim of University education? This is a difficult question to answer as the aims and ideals of different nations and even of individuals differ in many respects. But probably no one will deny that, generally speaking, the aim of education should be to bring out what is best in us so that we may be able to discharge our duties in life in the best way possible. If this aim has been correctly stated, University education should be the final or highest stage in our preparation for life. Examinations are not an end in themselves. They are merely stepping-stones on the uphill road to the goal we have set before us. The road is long and the marching weary, and we shall have to do much besides passing examinations in order to reach our goal. Submission to discipline is essential to success as no University organisation is possible without it. The vital importance of discipline has been fully demonstrated in the present war among all nations. As for the young men in our Universities, discipline in their case should be as far as possible self-imposed. This means self-control; for surrender to one's own desires and passions is like being a slave to an evil master. A good rule of conduct is to do nothing that would bring discredit on the *alma mater*. We must judge our actions by this test.

There has been a tendency towards indiscipline recently in some of our Universities which is a danger sign in University education. Apart from this, I sometimes wonder whether as much cultural benefit as possible is derived by the students in these institutions. Our Universities have undoubtedly attracted young professors of great ability and have become

Your University is famous for its Science, and the researches of some of your professors have been published in countries outside India. Science possesses a high cultural value apart from its practical utility. It teaches us to observe accurately and to draw correct conclusions from observation and experiment. In a word, it promotes the spirit of intelligent enquiry into the truth which is the foundation of all knowledge.

At the same time, the value of a classical education is not to be underrated. Sanskrit scholarship, like Greek, Latin and Arabic scholarship, has cultural value of a very high order. The ancients were great thinkers and philosophers; moreover some of the best poetry ever written was composed by the ancients. The fine culture derived from the study of the classics has rightly been called "humanistic" as it humanises us. At the same time, it does not make us unpractical, for men with a classical education have over and over again proved their worth in many practical walks of life It would be a pity to allow this ancient learning to decline. Our University should have a strong classical side so that those who desire to pursue these humane studies may have ample opportunities for doing so.

The cultivation of the Fine Arts is often neglected in our Universities. Æsthestic taste—a love of what is beautiful—must be cultivated, for the cult of the beautiful refines and elevates human nature. There is in many people a latent talent for creative art. Their sense of beauty seeks to express itself in some form of Art, whether it be drawing, painting, music or architecture. Such talent must be discovered and encouraged. It should be remembered that the culture of a people finds expression in its works of art. The cultural value of Art is inestimable.

I have dwelt on the cultural aspect of some of the subjects that are taught, or can be taught, in our Universities. Each one of them contains in itself all the elements of a liberal

done great service to the Urdu language by adding materially to its stock of learned literature. It has translated many books and has compiled some books on subjects as varied as Mathematics, Science, Biology, Medicine, Law, History, Philosophy and Economics. Indeed the University would not have been able to go on with its work had not these books been available. The work of the Bureau is making further progress, and a rich glossary of technical terms has also been compiled under its auspices for publication.

This experiment—if experiment it can be called—has been successful as the students have shown a better grasp of their subjects than is possessed by those who use a foreign medium of instruction, and they have consequently developed greater originality. This is amply shown by the series of brilliant successes attained by Osmania students at other Universities in India and abroad, and by the sound scholarly work done by not a few of them after their University career.

The principle of imparting University education in an Indian language is likely to become popular as it gives a clearer grasp of the subject to the student who has not to struggle with the difficulties of a foreign tongue in the process of learning other subjects. I would not therefore be surprised if the Andhra University were found one day to have adopted Telugu as its medium of instruction. You would find the change conducive to original thought among the students and it would lead more surely to the realisation of your educational ideals. This does not mean the neglect of English; for I am one of those who believe that English would be better acquired if it were pursued as a separate subject by itself, its literature deeply studied and its grammar thoroughly mastered. I believe that such a specialised study would improve the knowledge of English and save those mistakes in English being made which are only too common in India today. The foundations of such a thorough study of English should be laid in the schools which feed the University although it need not necessarily form the medium of instruction.

Bengal. The Congress Governments aiming at evolving a common nationality through a commonly understood speech, tried to plant it under the name of "Hindi" in areas as remote from its home as Madras. Outside the borders of India, it is understood wherever Indians are to be found. Many of the best writers of Urdu, both in prose and poetry, have been and are Hindus, whilst some of the earlier writers of Hindi, like Abdur Rahim and Kabir, were Muslims. It will thus be seen that Urdu, so far from being a foreign tongue is a popular language of India. It is the result of intimate Hindu-Muslim relations and is now being affected by intercourse with Europeans. Nevertheless, it remains an Aryan tongue and it would be wrong to call it a Perso-Arabic language just as it would be wrong to call English a Greco-Latin language on account of the large number of Greek and Latin words found in it.

The Osmania University has taken the bold step of adopting Urdu as its medium of instruction not only because it is the official and generally liked language of the State, but also because owing to its vast mixed vocabulary it is understood throughout the greater part of India. Its adoption is one more step towards the evolution of a common *lingua franca.* The local or regional languages could not have been used for this purpose because there are three such languages in the Hyderabad State, which would have meant the creation of three or four Universities—a task which was obviously impossible. Moreover, none of them are suitable for a *lingua franca.* Nevertheless, the regional languages, including Telugu, are taught up to the highest University standards and through their own medium, as I have already stated, so that the M. A. examination of the Osmania University may be passed in any one of them. There are few Universities in India which impart education up to such a high standard in these or other Indian languages.

As regards the supply of standard books on the subjects taught in the University courses, the Bureau of Translation and Compilation attached to the Osmania University has

betrayed Persian as well as Hindu influence. The pictures of this school were flat in perspective but exquisite in the matter of detail. But it produced nothing so great as the Ajanta paintings which were probably the handiwork of Andhra artists.

The artistic sense of the Muslims found expression rather in their architecture. They built beautiful buildings, some of which are still extant in Hyderabad, Aurangabad, Bidar and other places, whilst many others are in ruins. The style of this architecture in the Deccan is somewhat different from that in the North and again shows Persian as well as Hindu influence; but nowhere is it purely Saracenic. On the Andhra side, as Longhurst points out in his book on the Hampi ruins, most of the civil buildings at Hampi—Vijayanagara—show the influence of the Islamic style. Thus, what may be called "Indian architecture," is one more example of the remarkable blending of the aesthetic tastes and the culture of the two peoples.

But most remarkable of all was the growth of a commonly understood language. The Muslims in addition to their Persian and Arabic adopted a North-Indian language which they called "Hindi" and which in Persian means the language of *Hind* or India. It has been linguistically classed by Grierson and others as "Western Hindi." With this language many Arabic and Persian words became intermixed. These were chiefly nouns or substantives, the verbs and other parts of speech remaining Hindi as well as the syntax. In course of time, this mixed dialect developed into a regular language and came to be known as *Urdu*. This new tongue showed remarkable virility and a capacity for absorbing words from all languages, including European languages, such as English, French and Portuguese. The simpler and less pedantic form of it (sometimes called "Hindustani") has come to be the *lingua franca* of practically the whole of India, more especially for those who do not understand English. It is understood from Kashmir to Mysore and from Bombay to

formed sects that were more or less monotheistic, and many Hindus venerated Muslim saints in common with the Muslims. Ramanand and Kabir in the North and Basav, the founder of the Lingayat sect, in the South, are examples of such religious reformers. The Muslims on their part adopted many of the habits and customs of the Hindus, such as marriage ceremonies, festivals, fairs and even certain popular superstitions.

The regular written history of the country was due to the Muslims. The history of the Deccan in particular owes much to the Muslim historians from the 9th century A. D. onwards. In this connection may be mentioned "Farishta," to whom we owe much of our knowledge of medieval Indian history. The Arabs were also great geographers and travellers.

In other sciences, however, such as mathematics and astronomy, the Hindus possessed highly developed systems of their own, and the Muslims owe a good deal to them in regard to these sciences. But the Arabs also had their own systems of science and the two peoples exchanged much knowledge, each side borrowing what it lacked from the other. Thus, the Hindus borrowed from the Muslims many astronomical technical terms and the calculation of latitudes and longitudes while the Muslims caused to be translated into Persian from the Sanskrit many recondite works on the different branches of mathematics. As regards handicrafts, the Muslims introduced the manufacture of paper, the art of enamelling and the process of damascening steel as well as the manufacture of certain kinds of woolen cloth. The two systems of medicine, the Ayurvedic and the Yunani, run parallel to this day and are availed of by the people of both races.

Music in India is entirely a Hindu art which the Muslims acquired although, strangely enough, some of the best musicians were Muslims. Among the fine arts, sculpture was forbidden to the Muslims by their religion. Painting was also neglected by them for similar reasons although a Moghul school of painting and portraiture did spring up which

military exploits he celebrated in a poem which is still extant. Indeed Ibrahim's accession to the throne was due largely to Hindu support. He was a popular monarch and was known to the Hindus as "Malik Ibharam." One of his officers, Amin Khan, stationed at Patancharu, followed his master's example and encouraged Telugu literature. His wife was known for her acts of charity to the poor in the district.

The Qutb Shahi armies were composed of both Hindus and Muslims who vied with each other in their loyalty to the Sovereign. The Andhras were advanced to high office in the Kingdom. The famous ministers, Yenkanna and Madanna, were all-powerful during the time of the last of the Qutb Shahi Kings. These monarchs were patrons of calligraphy among other arts, and during their rule Telugu calligraphy is said to have received a great impetus. Telugu had a status next to Persian in the State.

The Qutb Shahi Kings showed a catholic spirit of religious tolerance, and the Madhwa Brahmin monks enjoyed their especial favour and received generous gifts of land. The Muslim rulers of the Deccan as well as the Moghul Emperors made liberal endowments of land for the upkeep of temples. Many of these grants continue to this day; the temple at Bhadrachalam is a notable instance of a Hindu shrine which enjoys such a grant.

The commingling of the Hindu and Muslim civilizations into a harmonious whole is one of the most interesting phenomena of history. The Muslims brought about a different standard of living and introduced refinements in such matters as food and dress. They instituted a revenue and a judicial system and laid down a court ceremonial which is followed by Indian Durbars to this day. Muslim rule moreover strongly influenced the social life and religious thought of the time. Its tendency was to bring about a compromise between the Hindu and the Muslim beliefs. Thus Hindu religious leaders arose both in the North and the South who

wood, silk thread and ivory, coral, pearls and cut (precious) stones, indigo, fruits and condiments," on all of which duty was levied in kind. Some of the items in this list show the influence of women in creating a demand for articles that were aids to feminine beauty.

The ancient Andhra capital of Paithan or Pratisthanapura on the Godaveri in the north-eastern part of the Nizam's Dominions was an emporium of trade, where goods were imported through the port of Broach and exported *via* Masulipatam or *Masalia* to countries as far off as China. Ivory and muslin were exported to Rome through Vizagapatam and Masulipatam. The Roman gold and silver coins found in the Dominions bear testimony to this trade. Pliny complains that India drained Rome of wealth to the tune of £ 600,000 every year in return for luxuries. Petronius and Seneca also condemned the Roman fondness for muslin and ivory and laid the blame for such expensive tastes on the ladies.

Thus, the State of Hyderabad has indissoluble cultural and economic links with the Andhra people who have contributed not a little to the common culture and civilization. The Telugu language is one of the regional languages of the Nizam's Dominions, and its study has been provided for in the Osmania University up to its highest standards. It is taught through its own medium in keeping with the University Charter in the same way as the other languages spoken in the Dominions. In Mr. Subba Rao, the Telugu Reader, the Osmania University has a scholar and a poet whose name is known wherever the Telugu language is spoken. Facilities for original research in Telugu and the other local languages are provided by the University and scholarships for research awarded.

The Qutb Shahi Kings of Golconda were great patrons of Telugu learning. The Telugu poet Addanki Gangadhara Kavi received the patronage of Ibrahim Qutb Shah whose

objects of great interest like ancient coins, jewellery and pottery have been found which tell us something more about the ancient Andhra civilization. They form a fascinating subject of study and research.

About a year ago, a collection of 1,200 palm-leaf manuscripts, most of them written in Telugu, was acquired by the Osmania University. These ancient manuscripts open up another field of research and may prove of historical and literary value.

In times of which historical records exist, the Nizam's Dominions formed the seats of more than one dynasty of Andhra Kings, for instance, the Vakatakas, the Chalukyas, the Rashtrakutas and the Kakatiyas. The last-named dynasty reigned at Warangal. They were great builders and have left us monuments of their rule in the shape of forts and civil buildings which were repaired by their Muhammadan successors. They also constructed the great tanks at Pakhal and Ramappa which exist to this day. Of the temples built by them, the one of the "thousand pillars" near Warangal as well as those at Palampet and Pangal are the most famous.

Warangal was the "Andhra-nagari" of the Telugu poet Vidyanatha. It seems to have been a wonderful city. We are told that it had golden gates opening on the high road filled with a busy traffic. Along it marched picturesque processsions of gaily caparisoned horses and elephants and companies of foot-soldiers. There were cock-fights, ram-fights and other public amusements which attracted great crowds. The stately edifice of an Art Gallery adorned a portion of the city showing the love of the Andhra for the fine arts. Warangal was also the city in whose vicinity was composed and sung in Telugu the Maha Bhagwat which has become immortalised in Telugu literature.

An inscription found near Warangal gives a curious list of imported goods including such things as "perfumes, toilet goods, pepper, honey, zinc, copper and other metals, camphor, sandal-

Chancellor the allocation of the money. Later on, Dr. Reddy returned the compliment by visiting Hyderabad when he delivered with his customary eloquence and breadth of vision the Convocation Address of 1938 before the Osmania University. He had had contacts with some people in Hyderabad before, but the visit of which I am speaking marked the beginning of closer relations between the two Universities which I hope will continue to develop. As an instance of co-operation between the two institutions I may mention the proposed publication of Dr. Gangoli's book on Andhra Sculpture which is to be printed in Hyderabad and published conjointly by both the Universities.

I belong to Hyderabad which lies in the Telingana, a part of His Exalted Highness the Nizam's Dominions, which possesses great historical interest for the Andhra people. They are an ancient race, but no written chronicles exist of the earliest period of their history. What is known of it can be gathered from ancient inscriptions and archæological relics as well as from the notices of foreign travellers who have from time to time visited the country. For instance, the Andhra Kingdom is mentioned by Megasthenes and by Marco Polo and others. But His Exalted Highness the Nizam's Dominions are a veritable storehouse of archæological material which throws considerable light on remote times. Palæolithic and Neolithic remains are scattered all over the country. Pre-historic graves, technically known as cairns, cromlechs and dolmens have beeen discovered at Maula Ali, a few miles from the city of Hyderabad, and also at Dornakal and Hanamkonda. At Maski and its neighbourhood in the Raichur District, large quantities of beads have been found, some of them bearing a resemblance to those found at Mohenjo-Daro.

Quite recently the remains of an Andhra city of great antiquity have been brought to light at Kondapur some fifty miles from Hyderabad. Excavations are in progress and

ANDHRA UNIVERSITY

Convocation Address

BY

The Hon'ble Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, M. A. (Oxon)

Member for Education,
H. E. H. the Nizam's Executive Council and Vice-Chancellor,
Osmania University, December 1941.

YOUR EXCELLENCY, MR. PRO-CHANCELLOR, MR. VICE-CHANCELLOR,

LADIES AND GENTLEMEN,

First of all, let me express my thanks to His Excellency the Chancellor for having done me the honour of inviting me to deliver the Convocation Address at this young University. I am all the more grateful as it gives me the opportunity of visiting once more this enchanting spot with its cliffs and wide expanse of sea, a place so ideally suited to a seat of learning ; and to this is added the pleasure of meeting once again my friend, Dr. C. R. Reddy, your distinguished Vice-Chancellor, for whom I share in common with you a deep regard and affection.

I have a pleasant recollection of my former visit, and of the courtesy and hospitality of Dr. Reddy. He showed me round the University, and I remember admiring what I saw of it, more especially the Science laboratories where I was struck with the air of quiet and earnest work which prevailed in the place, while I was also deeply impressed by what I learnt of the achievements in Science of your University.

I was on a pleasant mission. As a token of its friendship and good-will the State of Hyderabad had made a small donation towards the objects of the Andhra University, and I was sent to Waltair in order to discuss with the Vice-

The Hyderabad Teacher

EDITORS' NOTICE.

Articles meant for publication in this Journal must be addressed to the *Editor-in-Chief.* They should be either typed or written legibly in ink and signed by the author giving in full his or her address. The *Editorial Staff* does not necessarily share the views expressed in the articles published, but it reserves to itself the right to make such alterations in the articles received as it may deem necessary and proper before publishing them, and also to withhold their publication without assigning reasons. Original articles containing practical suggestions bearing on topics of general or educational interest will be very much appreciated. When an article is not approved, it will be returned to the author provided it is accompanied by a stamped and addressed envelope. When it is approved, a complimentary copy of the issue in which it appears will be sent to the contributor.

MANAGER'S NOTICE.

Subscription Rates.

	For H. E. H. the Nizam's Dominions including postage.						For British India including postage.					
	Per annum.			Per copy.			Per annum.			Per copy.		
	O. S.			O. S.			B. G.			B. G.		
	Rs.	As.	Ps	Rs.	As.	Ps	Rs.	As.	Ps.	Rs.	As.	Ps
English & Urdu Sections combined ...	3	0	0	0	12	0	3	0	0	0	12	0
English Section separately ...	2	0	0	0	8	0	2	0	0	0	8	0
Urdu Section separately ...	1	12	0	0	8	0	1	14	0	0	8	0

Members of any of the Teachers' Associations affiliated to The All-Hyderabad Teachers' Association may obtain back numbers of *The Hyderabad Teacher* at concession rates.

Advertisement Rates.

Space.	Whole Year.			Six Months.			Per Issue.		
	B. G.			B. G.			B. G.		
	Rs.	As.	Ps.	Rs.	As.	Ps.	Rs.	As.	Ps.
Full page ...	12	0	0	6	0	0	4	0	0
Half page ...	6	0	0	3	8	0	2	0	0
Quarter page ...	3	0	0	1	12	0	1	0	0
Per line ...	0	10	0	0	8	0	0	6	0

Address.—

D. P. I's. OFFICE,

HYDERABAD-DECCAN.

The first thing necessary for fostering a broad and tolerant outlook among our students is that the teachers should be absolutely free from any communal bias. The greatest care should therefore be exercised in the selection of teachers. Secondly, the reading material prescribed should be so chosen as to promote better understanding between students of different communities. Thirdly, the school spirit should be developed by means of extra-curricular activities, of which social service should form an essential part. In this connection, we should like to stress the value of the Boy Scout movement. But even those boys who are not scouts can be trained to render social service to members of all communities, without any distinction, if, as suggested by Mr. Saiyidain, squads of senior students drawn from different communities are formed, pledged to do such service.

We trust that Mr. Saiyidain's appeal to educationists and leaders of public opinion to implement the resolution of the Conference will receive the attention which it richly deserves.

Ourselves

With the publication of this issue, *The Hyderabad Teacher* enters on the 16th year of its existence. We take this opportunity of thanking all those who have assisted the journal by contributing articles to it and hope that they will continue their interest in it. We are also grateful to Mr. Syed Mohamed Husain Jaffri, the Director of Public Instruction, H. E. H. the Nizam's Dominions, for his kind patronage and unfailing support.

---

outlook amongst the youth of the country in our educational institutions. Equally forceful was the appeal which Mr. Saiyidain made in his Welcome Address to educationists all over India for finding a solution of the Hindu-Muslim problem. He said:

"There is no greater duty before the true well-wishers of this country than to fight against all those forces which tend to create discord and bitterness in the hearts and minds of its citizens. Can there be a greater reason for national shame than the appalling fact that we who are the inheritors of a great cultural and humanistic tradition, who have always prided ourselves on our mellow wisdom and our breadth of vision, who claim allegiance to religious systems based on peace and tolerance, should be steeped in an atmosphere of mutual distrust and make the variety of our religious and cultural traditions an excuse for fractricidal dissensions instead of being a means for the enrichment of our life and culture? Whether the causes are purely economic and political as some contend, or are social and religious as others believe, it is certainly not easy to eradicate them, and nothing will be gained by an attitude of facile optimism. No doubt the entire trend of our history has been towards fusion and a synthesis of varying groups and cultures, but the last few decades have embittered and poisoned mutual relations to such an extent that only a radical, comprehensive and uncompromising crusade against intolerance and stupidity can produce any appreciable results. It is, of course, not possible for the educationists alone to bring about this great, psychological revolution; their efforts must be supplemented by the creation of a just socio-economic order and the proper adjustment of political rights. But is there any reason why leadership in this field should not be assumed by teachers of all grades who supervise the youth during the most impressionable years of their life? May this Conference succeed in offering the right guidance to them in this crusade!"

At a subsequent session of the Conference, an interesting symposium was held on this subject, at the end of which the Conference unanimously passed a resolution to the effect that an appreciation of the contribution of all races and creeds should be actively promoted by school and college assemblies, by class-room teaching and by the personal influence of teachers.

As Director of Education for Jammu and Kashmir, Mr. G. Saiyidain has lost no time in taking action on this resolution. Elsewhere in this issue appears the text of the circular issued by him to the educational institutions and officers under him. We are indebted to him for sending us a copy of this circular for publication.

differentiate between two apparently similar sounds with different symbols in the Urdu script, e.g. *h* which stands for ح as well as ه.

The writer has laid unnecessary emphasis on the subtleties of Grammar. Urdu, in fact, is not a difficult language and its verbs are regular except three—*hona, karna* and *jana*. But its acquisition has been made a Herculean task by overstressing the niceties of its grammar and giving undue importance to its accidence. In learning Urdu it is concord that matters and concord is not acquired by learning a set of rules, but it comes naturally through practice.

The book is on the whole useful and serves the purpose for which it has been written.

S. F. H.

Editorial

Education for Inter-Cultural & Inter-Communal Understanding.

One of themes for discussion at the 17th All-India Educational Conference held at Srinagar during the last week of September, 1941 was "Education for Inter-Cultural and Inter-Communal Understanding". Both Mr. Saiyidain, Chairman of the Reception Committee, and Mr. Amarnath Jha, President of the Conference, drew special attention to this important question in their Welcome and Presidential Addresses, respectively. While Mr. Amarnath Jha's Presidential Address, the full-text of which is published elsewhere in this issue, is thought-provoking and inspiring from the beginning to the end, perhaps the most eloquent part of it is that in which, after explaining the disadvantages of denominational institutions from the point of view of national unity, he has reminded the Hindus and Mussalmans of their common heritage and emphasised the need for developing a national

divided into five grades, each consisting of the life and work of one or more of the noted modern Indian leaders. They are written in a simple and fascinating style, and are undoubtedly a valuable addition to the literature meant for school children. No school library in India can be considered complete without a set of these interesting little volumes.

S. B. S.

"A Text-book of Urdu in the Roman Script", by Major J. Willat, M.C.,M.A.,A.F.C., Oxford University Press. Price Re. 1-4-0 B. G.

Though this little book has been written specially for those working for the Indian Army Elementary Urdu Test, it will be found useful by any one desiring to acquire a working knowledge of Urdu. It is divided into 3 parts: Part I deals with the Roman script and the essentials of Urdu Grammar and Part II with the fine subtleties of Urdu Grammar and idiom, while Part III is designed to teach Urdu conversation.

The Roman script used in this book is in use in the army, and is full of discrepancies. It does in no way help a learner to be told that the sound of e is that of *a* in 'fate' and the sound of o is that of O in note when he is already made acquainted with the short and long sounds of *a* and *i* and *u*. We wonder how he would pronounce words like دھرہ and سیرا without knowing the short sounds of O and e. It would have been more profitable to teach the short and long sounds of e and o as well, e.g.

e	as in English	e	in	fr*e*t, b*e*t
e	as ,,	,, a	,,	f*a*te
o	as ,,	,, o	,,	dec*o*rum
o	as ,,	,, o	,,	p*o*le, n*o*te.

The case of the consonants is worse. The double symbols have been retained and no device has been adopted to

the Department will try to pull their full weight in this noble cause.

The High Schools and Colleges will do well to consider a suggestion which I placed before the Conference, namely, the formation of specially selected squads of senior students drawn from all communities who would pledge themselves, and be trained, to render social service to members of *all* communities *without any distinction*, and work, in all possible ways, for the maintenance of peace and good relations amongst the different communities. In times of communal discord, they should strive actively to promote goodwill and arrest tendencies and forces likely to cause disharmony. The moral effect of students of different religious persuasions working shoulder to shoulder in this worthy cause would indeed be tremendous and if we can carry out the scheme, we shall be setting an excellent example to the rest of India.

I shall be glad to receive from educational officials and others interested in this question any concrete and practicable suggestions likely to further this cause and the reports of any work that may be done in this direction from time to time. My appeal is addressed primarily to teachers but I have no doubt leaders of public opinion will try, in their own way, to implement the resolution of the Conference.

(Sd.) G. SAIYIDAIN,
Director of Education.

Reviews

'Leaders of Modern India', Oxford University Press.

Grade I 2 as. 6 ps. Grade II 3 as. Grade III 3 as. 6 ps.
Grade IV 4 as. 6 ps. Grade V 5 as.

The Oxford University Press have brought out an extremely useful and interesting series under the title, 'Leaders of Modern India'. The books under the series are

Notes & News

The following circular has been recently issued by Mr. G. Saiyidain, Director of Education, Jammu and Kashmir to the Heads of educational institutions and other officers under him:—

The 17th session of the All-India Educational Conference has just concluded in Srinagar after discussing some very important educational issues, the most significant of which, undoubtedly, was the problem of "Education for Inter-Cultural and Inter-Communal Understanding". The Conference expressed the emphatic opinion that teachers and educational institutions should try intelligently and systematically to develop in their students a broad and tolerant outlook, an appreciation of the cultural achievements and traditions of all communities and a determination to work for justice and fair-play to all, rather than for narrow personal, communal or sectional interests.

Education is essentially a process of *releasing* children and adolescents from that narrowness and intolerance which are often fostered by ignorance or the pressure of an unfavourable environment. If our schools and colleges fail in this task of liberation, they will be traitors to the future of their country and their people.

As conveners of the Conference for this year, it is our duty, in a special degree, to try and implement the views of the Conference through our educational institutions. I would, therefore, ask all educational officers to think out carefully ways and means of instilling the right outlook and attitudes in school students and to impress upon the teachers the importance of stressing this fact not only by precept but also by the force of their personal example. There is enormous dynamic power in the human personality and, provided the teacher is sincere, the contagion of his own example can mould the minds and the hearts of his pupils. I trust all teachers in

stronger than kindred. He will succeed if he has freedom of mind, freedom of research, and freedom of opinion. He will succeed if he can show the way to noble action rather than the primrose path of sloth and ease; if he can teach his pupils

> "To suffer woes which Hope thinks infinite;
> To forgive wrongs darker than death or might;
> To defy Power, which seems omnipotent;
> To love and bear; to hope till hope creates
> From its own wreck the thing it contemplates;
> Neither to change, nor falter, nor repent."

Above all, he will succeed if he constantly remembers that a loving heart is the beginning of all knowledge and liberty the mainspring of life. If he goes to his task properly, he will turn out young men and women, burning with love for all mankind, intensely patriotic, eager to work, eager to know, regardful of the public good, keen on living a life of exertion, aware that true happiness lies not in the body or in wealth but in rightness and richness of understanding, striving for the good in all its forms, intent on the best of which their nature is capable—one unclouded blaze of living light. He must be conscious of the great work entrusted to him. He must have faith in the future of his pupils, in the essential nobleness of human nature, and in the oneness of mankind.

> "May He—who is one, and who attends to the inner needs of all peoples at all times, who is the beginning and the end of things—may He bring us together with the ties of Truth, of Common Fellowship, and of Righteousness."[17]

---

17 "य एको वर्णो बहुधा शक्तियोगात्
वर्णाननेकान् निहितार्थो दधाति।
विचैति चान्ते विश्वमादौ सदैव
स नो बुद्धया शुभया संयुनक्तु॥"

the jarring sounds of "the holy strife of disputatious men." We in India have all a common culture. Whether we came originally from our Arctic homes, or from Central Asia, or from Iran, or Balkh or Badakshan, we are, for better or worse, Indians. We all speak one Indian language or another. Our music is Indian; our food is Indian; most of our manners and customs are Indian. Hindus as well as Muslims speak and write in Urdu; Hindus as well as Muslims speak and write Bengali, Tamil, Canarese, and Gujrati, Hindi and Marathi. Parsis speak and write Gujrati even as the Hindus or Muslims do. Can we not realise the many points of similarity and unity and minimise such differences as unfortunately do exist? The points of difference are so few and relatively so insignificant that it is a thousand pities that in the press and on the platform they should loom so large and assume such enormous proportions. It is to the educationist that the country must look for the eradication of the canker that threatens to destroy the solidarity of the Indian nation. The teacher must himself be free from the cramping influence of narrow communalism; he must think in terms of India and of humanity; he must in his action and words demonstrate his complete impartiality as between creed and creed, sect and sect; he must encourage a nationalistic and humanitarian outlook. The teacher has to show the right parth. He can succeed only if he can inspire confidence by his sincerity and win respect by his conduct. He must uphold the dignity of his vocation by refusing to be made the agent for sectarian propaganda. He cannot serve his masters—the future citizens—aright unless he is above suspicion. Whether at the behest of the political party in power for the time being, or at the command of the bigots masquerading as communal leaders, or in obedience to the orders of Secretaries and Managers dressed in little brief authority, he must decline to be dragged down from his high position as the guide and the mentor who leads the way. He will succeed best when all his pupils of whatever community can come to him with the confidence that they will find there a generous friendship

atmosphere of free discussion without seeking to preach a dogma. The words of the Apostle Paul should be constantly recalled by him: "All scripture is given by inspiration of God, and is profitable for doctrine, for reproof, for correction, for instruction in righteousness; that the man of God may be perfect, thoroughly furnished unto all good works." He should remember also Dean Inge's remark that it is impossible for those who mix at all with their fellowmen to believe that the grace of God is distributed denominationally.

But while I advocate religious education, may I venture to say that denominational schools and colleges are an anachronism? They have had their day and should cease to be. They recognise, if they do not actively promote, religious differences. They impart to the young mind ideas of separatism rather than of solidarity. They teach the impressionable youths to look upon themselves as units distinct from the rest. They breathe the spirit of discord and faction. From very early youth the Musalman, the Christian and the Hindu is taught that he is Musalman, Christian and Hindu. As if that were not bad enough, there are even sub-denominational institutions now—the Shia College, the Kshattriya College, the Kayastha College, the Jat College, the Kanyakubja College. There is the Muslim Educational Conference,[16] there are Inspectors of Mohammadan Schools. I do not object to the existence of Sanskrit Pathshalas and Arabic Madarsas that impart education along traditional religious lines. But sectarianism in modern institutions spells disaster and may to a large extent be responsible for the separatist movements that are disturbing the harmony of national life. There are so many occasions for discord and misunderstanding later in life that at least while youths can still have ideals and generous impulses and noble desires, they should be spared

16 The need for a separate Mohammadan Educational Conference cannot surely exist now. The General President of the last Conference was a Mohammadan. At this session we find that the President and Chairman of the Reception Committec are Mohammadans. The Exhibition has been opened by a Mohammadan There are, among Sectional Presidents, 4 Mohammadans, 5 Hindus, and 3 others. The Mohammadans cannot complain that there is any risk of their point of view being ignored.

fragrant shadow of the dusk. During periods of revolution, religion is at a discount. Atheism flourishes. Churches and temples and mosques are deserted. A 'progressive' nation dismisses religion as an opiate. But religion appeals to something bound up with our life. It touches our innermost self. It satisfies our eternal craving for peace and tranquillity. It brings to us comfort and solace in moments of trial and grief. It moves our inner self. It does more. It teaches us to aspire to a certain level of moral excellence; it points to a certain level of conduct below which we dread to fall. In our action and in our thought it influences us and elevates us. It provides us with a safe and unchanging background; we are not cast adrift; we have a heaven of rest, when all else fails. How shall we train our youths so that they may grow to be God-fearing and God-loving? All religions are attempts to state and explain the problems of life, of the universe and of the real nature of man; they are all based on certain fundamental truths. Round these basic principles have grown, in course of centuries, accretions of commentary, gloss, explanation, elucidation. Shorn of these, the naked truths shine resplendent, serving as beacon lights on the path of enlightened progress. If the main principles of Christianity, Hinduism, Islam, Buddhism, Zoroastrianism and the other faiths are collected together[15] not only would much religious bitterness and misunderstanding disappear, but every young person would learn to have a wide, tolerant, and catholic outlook that would augur well for the future of mankind. There would then be no talk of Kafir, mlechha or heathen. Religion would then cease to be a pretext for preserving effete institutions and customs that smother Truth beneath their dead weight. "Religion has its own enlargement, and an elargement, not of tumult, but of peace." Attendance at the religious class should be compulsory in every institution. The teacher must be himself broad-minded and instil in the pupils a real reverence for all faiths and encourage an

15 They have been collected in Dr. Bhagvan Das': *The Essential Unity of all Religions.*

with new attainment new orders of beauty arise, in thought and art new values."[13]

On the other hand, there is Mr. Stephen Leacock who complains that education is getting longer and longer. "Life has too little evening. It has all run in arrears and never catches up." But even he pleads for education that does not end with college and for learning that never dies.

Religious and Sectarian Education.—Modern education is godless; it is entirely secular; it ignores the inner man. In greater or less measure it builds the body, it trains the intellect, it enables one to win one's daily bread. But it keeps society, science, and religion in separate and water-tight compartments, leaving the last to take care of itself. It takes no account of 'the inner law of the heart.' "The artist is taught to produce beauty, and the governor to govern well so as to produce a prosperous and well-ordered city."[14] But the teacher is afraid or unwilling to teach that nothing that we aim at, speed, beauty, prosperity or the like, is of value in itself, that they are all a means to an end, and that end the willing fulfilment of God's purpose. It is forgotten that mind and character must have a spiritual element. We have been educated and are educating in a very narrow groove. In most institutions religion has no place. There are, of course, historical reasons for it in India. The State, in accordance with its policy of religious neutrality, has not permitted religious instruction in its educational institutions. The local boards and private schools have also refrained from it as they have among their pupils students belonging to several denominations. Then those who belong to an earlier generation, brought up on the pure cream of the rationalist and positivist creed, have no use for religion. The Victorian agnostics are their masters and they know no prophets save Harrison and Comte. They take no account of the world of hints and half-lights, echoes and sounds from elfland, the

---

13 *The Testament of Beauty*, I.
14 Gibert Murray: *Stoicism.*

experts and specialists. As a competent worker in the field says: "Intellectual pursuits can suffer no depression. The ambition of adult education is to set men free—from governmental oppression, from materialism, from bad taste in living, in music, in drama, in recreation, and most of all free from the utter drabness of unfilled lives."[11] Adults learn more rapidly than children. The observations of Thorndike proved that even persons of fifty need not be deterred from trying to learn anything which they really need to learn by the fear that they are too old. Adult education should aim at continuing education throughout life for all types of adult individuals, for the University graduate as well as for the peasant, as much for the landlord and the mill-owner as for the factory labourer, as much for the legislator as for the office clerk. Education in maturity is of value to all: it recreates and provides new standards of value. Sir William Livingstone, in a recent thought-provoking book,[12] rightly says that experience of life is necessary for the full and fruitful study of subjects like literature, history, politics and economics, and that therefore the cultural education of the young is and must be very incomplete when they leave school and even when they have taken a university degree—not from any fault of their own but because they have very little fitst-hand knowledge of life. "Adult Education," he says, "is given to students who desire it, who have the mental development to receive it, and who have the experience of life necessary to value and interpret it." This throws open a limitless field; hitherto the Adult Education movement had embraced only the illiterate or the half-educated. But if it includes—as it should—even those who have in their youth received advanced education, how vast does the problem become and how heavy the responsibility of those in charge of the movement! As the late Poet Laureate said:

"Knowledge accumulateth slowly and not in vain;

11 M. A. Cartwright: *Ten Years of Adult Education* (Macmillan).

12 *The Future in Education* (Cambridge).

young designers based on the supplementing of studio work with actual production at the furnace and in the decorative workshops; and the further training of those already in the Industry either as designers or craftsmen. Some institution, like the Arts Schools at Lahore, Bombay, Lucknow, or Calcutta, might also organise an exhibition of Contemporary Art in Industry. Such an exhibition, organised in 1935, by the Royal Society of Arts in collaboration with the Royal Academy, was a great success as it raised the prestige of industrial art and gave both artists and industrialists new ideas as to the possibilities of co-operative action.

France used to have a Ministry of Fine Arts; its duties were the care and preservation of National monuments, the control of national museums and galleries, management of the Paris School of Fine Arts and School of Decorative Arts, supervision of the French Academy at Rome, the national factories at the Gobelins and Beauvais as well as the purchase of works by living artists.

I advocate the opening of schools of Arts and Crafts and Art Galleries and Museums because of the importance of art in any satisfactory scheme of education. Artistic talent can be put to use in providing grace and beauty to craft-work, in textile designs, in wood-carving and pottery, in typography and cabinet-making, in glass-engraving and theatrical costumes, in light metal-work and book-binding, and almost in every sphere of the life of the individual and society.

Adult Education.—In spite of some efforts here and there, Adult Education is still not attempted in India on any considerable scale. The percentage of literacy is still very low, and naturally our first endeavour should be to raise it. But that is not to say that the Universities and Local Boards should postpone to a distant future all attempts to work in the domain of Adult Education. The training of teachers for adults is a task which can best be performed by the Universities; they need to have a knowledge of adult psychology; they will have to deal with persons who in some repects are

region, and insensibly draw the soul from earliest years into likeness and sympathy with the beauty of reason."[10]

Music, song, painting, sculpture, aesthetic dancing, and monumental architecture, should be encouraged in all our institutions, even apart from their utilitarian value, as adjuncts or conditionings of objects, serving other utilities. Several aesthetic arts, either directly, or as adjuncts, have played an important part "in developing, extending, deepening, crystallising, and transforming into dynamic action many of the finer impulses or other qualities in human beings—qualities of courage, self-sacrifice, devotion, pure love, endurance, and the like." There should be, attached to every University, and if possible, every Municipal Hall, a museum illustrating the different aspects of Indian culture. Officials and private individuals can all unite in furnishing them. Examples of Indian painting and sculpture, plaster casts, objects of anthropological and ethnographic interest, articles of industrial and commercial importance, the arts and crafts, decorative art, should find a place there; as also manuscripts, examples of calligraphy and book-binding. There should be developed, with the assistance of ethnologists and archaeologists, an Anthropological Section of the Museum. But, in addition, there should be Arts Schools working in close collaboration with Industry. Some of these schools, at Stoke and Birmingham, for instance, have done much to help the industries of silver-smithing and metal-work, silk, pottery, and printing; classes are held in framework knitting, carpentry and joinery, plasterer's work, brickwork, decorating, dress design, stone-carving; photo-litho, posters, folders, Christmas Cards, woodcuts. At Stourbridge there is a School of Arts and Crafts, which has achieved remarkable results especially in relation to the Glass Industry; it imparts a pre-apprenticeship training in glass-making, design and decoration, confined mainly to boys of the age of 12 plus to 16; the training of

10 *Republic*, III, 401 (Jowett's translation).

action and thought; to say that art is simply beauty, and that in beauty there is no distinction of high or low, no preference of one kind above another."[8] According to this view the artist is just a picturesque figure, a freak, a person with no place in the realm of utility. To some extent, the poet is also similarly condemned. There was some excuse for this view in the passages in which Plato eulogises the artist. In one of his best known passages, he describes Art as

> "a madness of those who are possessed by the Muses; which enters into a delicate and virgin soul, and there inspiring frenzy, awakens lyrical and all other numbers with these adorning the myriad actions of ancient heroes for the instruction of posterity. But he who having no touch of the Muses' madness in his soul, comes to the door and thinks that he will get into the temple by the help of art—he, I say, and his poetry are not admitted; the same man is nowhere at all when he enters into rivalry with the madman."[9]

But the Greeks, though they thought thus, brought art into their daily life, and produced household crockery, pots, pans, clay figures, that are beautiful beyond compare. They identified the good with the beautiful. To quote Plato again:

> "We would not have our guardians grow up amid images of moral deformity, as in some noxious pasture, and there browse and feed upon many a baneful herb and flower day by day, little by little, until they silently gather a festering mass of corruption in their own soul. Let our artists rather be those who are gifted to discern the true nature of the beautiful and graceful: then will our youth dwell in a land of health, amid fair sights and sounds, and receive the good in everything; and beauty, the effluence of fair works, shall flow into the eye and ear, like a health-giving breeze from a purer

8 G. Lowes Dickinson.

9 *Phaedrus.* 24a (Translation by Jowett).

Nursery School provides conditions that promote and foster good growth and health, protective care against accidents and illness, regular medical inspection, and prompt treatment of maladies, defects, and tendencies towards ill-health. It is of course obvious that the teacher in an infant school—preferably a woman—should have a real love for children and be able to understand them and play and laugh with them. As Bertrand Russell says, "There is only one road to progress in education as in other human affairs: science, wielded by love. Without science love is powerless, without love science is destructive. All that has been done to improve the education of little children has been done by those who love them, and those who know all that science could teach on the subject." She should have been specially trained and have a full knowledge of child psychology. It may be hoped that this essential and basic grade of education will in future receive more attention from local boards and municipal corporations, and that philanthropists and the State will give adequate encouragement to the founding and maintenance of such institutions. Plato's words are still true: "Whatever the creature, be it plant or animal, tame or wild, if its earliest growth make a good start that is the most important step towards the consummation of that excellence of which its nature is capable."

Art Education —Another aspect of education which has been neglected in this country and the importance of which must be recognised is that connected with the teaching of Art. Art Education may comprise Art Schools, Art as a part of general education, and the training of teachers of Art. Some may attend Art Schools for pure culture; others because it may help them in their industrial and commercial occupations; yet others in order to earn a living in which artistic abilities are required. There has been a tendency in some quarters to set art "altogether outside the general trend of national life and ideas; to assert that it has no connection with ethics, religion, politics, or any of the general conceptions which regulate

In France, forty per cent of children between two and six years of age were receiving education in 1936-37 in Ecoles Maternelles and nursery classes. The Ecoles Maternelles are supported by State, Commune and voluntary subscriptions. The school arrangements are very flexible—a child may come to school for the whole day or a couple of hours in the morning and even then may be absent for a walk with his mother.[4]

Italy educates about 27 per cent of children of pre-school age in her "Opera Nationale per la Protesione Della Maternita e Dell' Infanzia." So far as possible the Welfare and educational work for young children is closely related to the home, and the family, the key word of Italian life, is carefully fostered."[5]

In some cantons in Switzerland attendance is compulsory for one pre-school year. In others, the pre-school course lasts three years and is organised by the State. In Germany, "it is not the intention of the Nazi Socialist State to deprive the children of family influence."[6]

In the United States of America, nursery schools were in the beginning run by Universities and Training Colleges, mainly for psychological research, for interest in studying the laboratory aspect, not only of the children, but also of their parents, and of their whole environment.[7]

It may be added that the Montessori Society of Germany was dissolved by the political police in 1935, and in 1936 Mussolini's Minister of Education decreed cessation of all official Montessori activity in Italy.

At the Infant School, special care is taken about diet and nutrition and every child gets the necessary quantity of vitamins, fluids, proteins, fats, and carbohydrates. The

---

4 **F. Hawtrey: *French Nursery Schools* (Dent).**

5 **Marrano: *New Education in Italy.***

6 **Dabney Davis: *Young Children in European Countries* (United States Department of the Interior).**

7 **M. Dabney Davis: *Nursery Schools, Their Current Development and Practice in U. S. A.***

in respect of infant and child education, Froebel, Dewey, and Madame Montessori, are all agreed in permitting the child to learn by observation and unorganised experience, in making adequate provision for individual occupation with as little attention as possible from the teacher, in treating the child as child, and in emphasising self-education, specially 'learning by doing.' It was only after the passing of the Education Act of 1918 that in England Local Educational Authorities were permitted to establish Nursery Schools and classes for children under the age of five. There has since then been a growing demand that these bodies should be compelled by legislation to provide adequately for children under five as they are required to do for those over that age. The Board of Education makes grants for Nursery Schools for children between the ages of two and five subject to certain conditions, such as open-air buildings, whole-day sessions with carefully planned meals and sleep; the daily visit of a nurse and medical inspection are provided. The words of Sir George Newman may be quoted: "Let us make clear, precise and definite these facts, (1) that the child under five stands at the gate of our whole educational system, (2) that the child is the seed-plot of everything medical, physical, mental, and moral, (3) that what happens to the child before it is five is bound inevitably to have results for good or evil—and finally that the child is not yet effectively provided for." In Russia, there is a special department for the Protection of Motherhood and Infancy: it organises crêches, nursery schools, and kindergartens. "A crêche may be attached to a factory or mounted on wheels and follow the harvest (this for nurslings only) . . . Soviet Russia believes strongly that the education of young children is the business of the State. The main sources for the financial maintenance of nursery institutions are the State Budget, the Local Budget, the funds of State Social Insurance, and miscellaneous sources, such as the contribution by the parents (according to a definite scale fixed by the State)."[3]

---

3 V. Fediaevsky and Hill: *Nursery Schools and Parent Education in Soviet Russia* (Kegan Paul).

Infant and Nursery Schools.—I purpose to refer very briefly to some gaps in our educational system. In this country little attention is paid to Infant and Nursery Schools, though it is here that the foundations of education can be well and truly laid. The training and teaching of children and the development of educational provision for them up to the age of 7 plus are urgently required in every state and province. It is at this age that the child's future is really shaped. He seems so happy sitting in the dust, playing with a broken twig all through the day that most parents are reluctant to send him to school: they imagine they are naturally best qualified to bring him up. In one of his matchless lyrics in "*The Crescent Moon*," Rabindranath Tagore says to the child:

> "The wind carries away in glee the tinkling of your bells.
>
> The sun smiles and watches your toilet.
>
> The sky watches over you when you sleep in your mother's arms, and the morning comes, tiptoe to your bed and kisses your eyes."

It is a pretty picture and most parents are not willing to send their children away from home. But in foreign countries one notices how happy these little children are while at the Infant School. There are activities, interests, experiments, but no 'subjects ot study.' They are taught grace of movement in the joyful dance. They are taught to sing folk-songs and nursery-rhymes. They are encouraged to do constructive work of many types. The three R's are taught whenever the child wants to learn them, whether at the age of three or of six. The children are encouraged to spend as much time of the day as possible in the open-air, surrounded by trees and birds, to explore as many places as they can, to ask what questions they like. Above all they are encouraged to have "delight and liberty, the simple creed of childhood, whether busy or at rest." The three main pioneers

utilitarin and practical aim or with a cultural aim, it should be possible for the teacher to give to it a direction and a shape in keeping with this ideal so that men shall have an opportunity to become the best of which they are capable and find in their daily tasks fulfilment and not frustration.

Every institution must impart some utilitarian education, some bread-winning education which will enable a person to live in reasonable comfort and freedom from economic worry. In order that education may not lead one to a blind alley or an over-congested field, it is necessary that it should be planned so as to be adjustable to the needs of society and suited to the natural talent of the individual. Therefore, at the end of the compulsory basic education, a teacher who has watched the pupil closely and is competent to judge, should decide which kind of training he should receive thereafter. Is he intellectually alert, more interested in thought than in action, fond of the humanities or of the sciences; or is he daring and adventurous, intrepid and capable of physical endurance; or do his gifts lie in the direction of exchange and barter, commerce and money; or is he mechanically skilled and deft of hand and eager to run errands and keen on carrying out orders rather than displaying initiative and originality? The teacher who is to watch these aptitudes of the pupil must possess sympathy and understanding and be watchful and observant. According to his judgment the child should be sent on to the subsequent grades of institutions to be fitted for the particular work for which he has a 'calling,' a 'vocation.' This should prevent the production of misfits, although there will still be a few who, either through the mistaken judgment of the teacher or a late development of their gifts, find themselves in institutions that do not suit them. It should be possible to repair the mistake before it is too late and divert the pupil to institutions better suited for him. It would prevent the blind rush towards only one kind of education. It would take into account both the needs of the country and the pupil's aptitude.

and aspiration. The oneness of life must be stressed : oneness with one's neighbours, oneness with environment, oneness with the human race, oneness with the Creator of all things. The young should be taught that the ultimate reality is joy. If all the world over, they can be brought up on this ideal, if strife and discord can be shown to be what they really are—the results of base ambition and want of respect for others,—if the youth can be imbued with the sense of the dignity of manhood and of the sanctity of human life, what a difference will it mean to the world! Will the teachers take up the challenge? The veneer of culture, of superficial refinement, all that art and literature and science have superimposed on us, has not really improved mankind to the extent that we desire. Our brute inheritance still drags us down. We cannot wholly banish from life envy, hatred, malice, and all the other baser motives; but what we can do is to practise virtue, kindness, and generosity, charity, mercy, and humanity, so that mankind may approximate nearer to the divine and be justified in looking upon itself as the chief of created beings.

Varieties of Education.—That being accepted as the ideal to be striven after and if possible attained, it is obvious that there can be no water-tight and mutually exclusive divisions between different types of education or among different types of men. Every kind of man, whatever his talent and aptitude, should be trained for the attainment of this ideal to the extent to which his *vertue* will allow. Not all will succeed; many will falter and fall; but the mere fact that one has striven for it and honestly sought to achieve it will be enough to make the world a better place to live in. In his own sphere of work and in his particular surroundings, an intellectual engaged in his special task of creative or critical work, a soldier obeying his officer, a politician commanding the listening senate's applause, a businessman engaged in the production or distribution of wealth, a labourer earning his bread by hard toil, can equally keep this ideal before him and in greater or lesser measure work towards it. Whether education is imparted with a

ual animal—is that all we seek to produce? Purely intellectual advancement has led to the poison-gases—the lachrymators which cause weeping and temporary blindness; the sternutators which cause sneezing and vomiting: the systemic toxics, which kill by paralysing the central nervous system; the lung injurants, which kill the victim very much as drowning does; the vesicants, which burn flesh. Is this achievement one to fill us with pride and satisfaction? "Know ye not that you are the temple of God and that the spirit of God dwelleth in you?" The *Taittiriyopanishad* says: "The purpose of education is the realisation of the divine in everything." Plato, in his *Laws*, says: "We have to fight an unceasing battle in which amazing watchfulness is needed. Gods and spirits are our allies, and we are the property of these gods and spirits. Wrong, arrogance, and folly are our ruin; righteousness, sophrosyne, and wisdom are our salvation: and these have their home in the living powers of the gods, though some faint trace of them is also plainly to be seen dwelling here within ourselves." That is also what Froebel means when he says in his "*Education of Man*": "All his activities, all his will must proceed from and refer to the development, the improvement, and the representation of the inner." In the world of today, everywhere we notice the greed of power. Power is good, but not for itself; it must be employed for worthwhile aims; it must be in the hands of the best and wisest, whose life and acts must be one continuous hymn to Providence: it must be exerted to obtain not human rights but rather the divine rights of man. Education should equip men so that their body, mind and spirit work in harmony for the glory and advancement of man as a creature of God. They should be trained for harmony and not for strife. They should be taught to work for Peace, for the Universe, and for the Soul of Man. That should be the teacher's great aim; towards that must all his efforts be directed. He should consciously and of set purpose put this ideal before himself. The young should be taught to aspire to harmony in bodily movement, harmony in thought, harmony in vision

emotional, mental, and physical health: to enable each child to share in the cultural arts which constitute humanity's heritage from the past; and to develop the sturdy personality and character without which all other education is useless; (2) *Economic efficiency*, to contribute gladly and effectively to the production of the goods and services which, taken together, make up the modern standard of living; (3) *Human relationships*, to develop the skill, the knowledge, and habits which make it possible for us to get along with other people; (4) *Civic responsibility*, to learn to respect the human soul as something sacred—a broad interest in the welfare of the other fellow; freedom of speech, religion, petition, assembly, and the press; the use of reason in composing differences. Hermann Leitz defined the aim of education as the development of the individual's nature, inherently good, in all directions—intellectual, spiritual, practical and physical. Simultaneously, since he is a social being, he is to be prepared for participation in the social, economic, vocational and religious life of the nation. Persons undergoing such an educational process can effect an amelioration of social, economic, and political conditions, and the regeneration of the race. Eric Gill said a few months ago that most educators have no idea of man except that his only reason for existence is to get on in this world and have as good a time as possible.

It is necessary that we should be clear in our minds about human destiny and be sure whether we are merely to earn our living and enjoy our life on earth or are a being nobler and higher than only a larger ape. Of course, the ability to live, and live well, must be acquired but the notion of the survival of the fittest and struggle for existence is responsible for giving to education a purely materialistic turn and for the loss of faith in a spiritual perfection of life. The proper care of the body and the training of the intellect are of course necessary; they are the foundation of all systems of education. But must the process stop there? Is it not to lead to something higher? The healthy animal, the intellect-

German nation as the master nation above all other races. Most of these qualities are the qualities of the soldier. The soldier is the new ideal of man."

In Italy the educator is constantly preaching the Fascist motto: "Work, obey, fight." In Soviet Russia, the underlying doctrine is that of Lenin, who said, "The school, apart from politics, is a lie and a hypocrisy." The walls of the nursery-infant schools used to be decorated with political posters and slogans, pictures of tractors, and Red Army soldiers; the education is frankly atheistic, religion being explained as something needed by the primitive man but now as being an obstacle to progress; at the University, everyone has to offer social science, with its two divisions of political economy and history of class-struggle;[2] manual labour is part of everyone's education. There are recent indications that even in Russia, popular education is now controlled by the belief that humanism and beauty must be the basis of education. In democratic countries, the aim is rather vaguely described. Thus, some of the leading American thinkers say in a book entitled "The Educational Frontier":

> "It is reasonable to expect the school to set up an environment in which all of its pupils, through active participation in its organisation and control, may move progressively to a more complete appreciation of the deeper significance of the democratic way of life."

There is an elaborate statement by the Educational Policies Commission of America, which mentions four ideals which education must cherish—(1) *Self-realisation*, to develop inquiring minds, to kindle imagination, to develop sound

2 According to Beatrice King, Political Economy includes a study of Marx, Engels, Lenin;—Stalin on Communism—Socialism and the Transition Period—Lenin and Stalin on the dictatorship of the proletariat—A critique of the views of the counter-revolutionary Trotskyism—The State of Military Communism—Lenin's plan for electrification—Lenin's plan for co-operation—Meaning of planning—Heavy machine industry as the material basis of Socialism—Result of First Five-Year Plan—Stalin's Six Points—Machine Tractor Stations—Obliterating-division between agricultural and industrial regions—Socialist organisation of labour, Socialist Competition and shock brigades—Stalin on Marxist meaning of equality as compared to petit bourgeois—Destruction of capitalist system through proletarian revolution.

about his goal. He cannot afford to drift. He must plan so that the world regains its equilibrium. In most of the countries that are under totalitarian authority, the initiative has been taken out of the teachers' hands and the aims of education defined in clear terms by the decree of State. General Chiang Kai-Shek thus declared in 1939 what China's educational policy and programme were to be :

> "Modern life is wartime life, and individuals and communities failing to adapt themselves to wartime conditions cannot escape extinction or elimination by others. Educators of today must regard themselves as warriors storming forts and braving death, as forerunners in social reform, as founders of a new nation who defy all hardships, as sages and heroes who play decisive rôles in critical moments of the nation. Today we cannot subscribe to the campaign for educational independence, which would place educators beyond the laws of the nation, as if they constituted an isolated group. Any discussions of education today should aim at providing a link between it and all other activities, be they military, political, social, or economic; education must become a vital and essential factor in the creation of a new Chinese nation."

In Nazi Germany, according to a competent observer,[1] a new ideal of man has been posited.

> "It is the ideal of the racially pure German, the Nordic, endowed with all the racial characteristics ascribed to him in national-socialist thought, to wit: a strong and beautifully-balanced body, untiring and resistant to any kind of hardship, and, chief of all, the hardships of warfare; loyalty and obedience to the appointed leaders rather than individual self-assertion; a passionate desire to help in the accomplishment of the

---

1 Dr. Walter Kotschnig, writing in the Proceedings of the Pennsylvania Schoolmen's Week Proceedings, 1939.

thinks to what use knowledge and the spirit of research are being put all over the world. Caliban, drunken monster, might well say, "You taught me language; and my profit on't is, I know how to curse." Man has known much and his profit on it is he knows how to destroy. Where does the Angel of death not strut in pride today? Life now more than ever before is a grim challenge to the educator. If man is to survive and regain his grandeur as the highest of created beings, the teacher must remould society, and fashion life anew, and restore a proper sense of ultimate values. A change must come over the spirit of men's dreams.

Ideals of Education.—There are times when it is best to act, to march onward, to accomplish; and there are times when it is wise to pause, to counsel, and to plan. This seems to be an appropriate moment for feeling our way patiently and with sagacity for the paths that will lead to peace and happiness, the true, the good, and the beautiful. In the last century, when popular education was supposed to be the panacea for all ills, one of the more thoughtful writers said: "Is it not far better and safer to refrain from committing ourselves to a given type of social reconstruction, and to work forward patiently upon the only principle that can be received with entire assurance: namely, that faithful cultivation of the intelligence, and open-minded investigation of all that the intelligence may present to us, is the only certain method of not missing the surest and quickest road to the manifold improvements of which the fundamental qualities of human nature, as well as the relations of man in society, are susceptible?" This glorification of the mind and pathetic faith in the beneficent nature of the intellect have been proved to be false. "The intellectual all-in-all" has brought us to the present testing time when the divinity of brute force is worshipped far and wide. Education must be planned afresh so that nothing may prevent the fruition of the dream that is scorned today. In a changing world education must hold fast to certain ideals and the educator must be quite clear

ALL-INDIA EDUCATIONAL CONFERENCE

SEVENTEENTH SESSION

Srinagar (Kashmir)

Presidential Address

BY

Amaranatha Jha

Vice-Chancellor, Allahabad University.

MR. CHAIRMAN, FELLOW-DELEGATES, LADIES & GENTLEMEN,

I am deeply grateful to you for the honour you have done me in calling upon me to preside over this Conference. I have long been connected with the Education Federation and it is naturally a matter of pride to me to have been asked to conduct its deliberations. We have, since the Conference last met, lost several distinguished countrymen whose death we deeply mourn. Dr. Rabindranath Tagore touched life at many points; but we wish to pay tribute to him specially as a pioneer in education; his great institutions, the Shantiniketan and the Shriniketan will, we trust, long continue to remind us of his high ideals and his splendid vision. In Sir Yajneshwar Chintamani the country has lost a fearless journalist, a great politician, and a far-sighted statesman who was responsible for initiating many educational reforms during his term of office as Minister of Education. Sir Shah Mohammad Sulaiman, my immediate predecessor in this chair, was an eminent lawyer and judge, a scientific investigator of rare merit, and a strong Vice-Chancellor. To the memories of all these I desire to pay respectful tribute.

We meet in times of exceptional difficulty, when the future of the human race seems grim and troubled and the dreams of the philosophers of old recede far into the background. It is not the gates of Eden that gleam, but rather the bottomless pit, the land of darkness, and the shadow of death. Human life appears to have no value. Individuals and masses of individuals are but food for powder. The educator may well abandon his work in despair when he

Academic -	35 %
Manual -	35 %
Physical Training	10 %
Opening Exercises	10 %
Recess -	10 %

(* Wallins-Problem of Subnormality)

It is desirable that the burden of expenses be reduced by providing opportunities for the students to acquire habits of utility. A part of the manual work should consist in the making of articles which will be of use to the pupils themselves or to the school or which can be sold. The final class should be a vocational or trade class providing useful forms of industrial training.

To facilitate supervision it is advisable to have residential institutions for the feeble-minded. Wherever financial and other difficulties prohibit the arrangement of their residence day-schools at least should be opened. In the evenings, it will be better if the pupils are retained in the school premises for relaxation and recreation. This will save them from the physical and moral dangers to which they will be exposed in the streets where many of them may spend their evenings, due to the inadequate care afforded at home. An assistant should supervise their activities.

Every child who fails should be given a mental examination. This test takes less than an hour; but the result contributes to the real understanding of the case. It is necessary to determine whether a given child is unsuccessful in the school because of poor native ability or because of a removable cause like carelessness.

Aims and Methods of Teaching.—Itard, Seguin and others demonstrated that the feeble-minded could be improved and rendered self-supporting and law-abiding by systematic training. The aim of the training is to provide such differentiated type of work as will meet the peculiar mental, pedagogical and moral needs of the feeble-minded. Such a training will develop those powers, aptitudes and interests which they possess. The school is not meant for coaching in literary branches, but for providing a programme of work so individualised as to meet the developing needs of each child. The need for differentiation, both in methods and contents, is greater here than for the normal. Such boys need more individual attention, yet it is possible to classify the feeble-minded children according to their aptitude for group instruction. *Feeble-mindedness is a permanent condition of mental feebleness and not a remediable malady.* It is not, therefore, the aim of these special schools to restore the feeble-minded children to normality or to a place in the normal schools.

The guiding principle of this course of study should be the practical utility of the subject-matter taught. Effort is concentrated upon increasing their productive efficiency.

These aims are realised by providing sensory, motor, physical, manual and vocational training, and a minimum of literary work of a distinctly elementary, concrete and practical nature. The relative amount of time devoted to the various activities is to be as follows:—

spent annually on re-teaching children what they had already been taught but had failed to learn. The first efforts at reform which resulted from these findings were based on the supposition that this could be remedied by the individualizing of instruction, increased attention to children's health, and reforms in school administration. The reforms along these lines have been productive of some good; but the results were not quite satisfactory. The trouble was that the reforms were all based on the assumption that under the right conditions all children are equally capable of making satisfactory school progress. Psychological experiments have proved that the feeble-minded cannot keep pace with normal children. This retardation is not due to their carelessness, but to their natural incapacity. Nature has distributed intelligence in a particular manner. Experiments made on a large number of unselected children show that this distribution conforms with the normal frequency which is as follows:—

7 %	of the children have	very high	intelligence
24 %	,,	high	,,
38 %	,,	normal	,,
24 %	,,	low	,,
7 %	,,	very low	,,

In these circumstances we cannot hold all children to the same standard of school progress. Acquisition of knowledge depends on intelligence. Instead of wasting energy in the vain attempt to hold mentally slow and defective children up to a level of progress which is normal to the average child, we should differentiate the course of study in such a way that each child is allowed to progress at the rate which is normal to him. This will stop the repeated failure of the feeble-minded children. Children do not enter with much zest upon school work in which they have once failed. Failure crushes confidence and destroys the spirit of work. This waste of energy has a bad effect on the efficiency and the finances of the school.

develop criminal tendencies owing to lack of proper moral training; but the predisposition to such habits found in the feeble-minded has not been traced in others. A nation can reduce the numbers of its future criminals by the training of its feeble-minded children. The expenditure on this account should be easily borne, for otherwise these children will become criminals and cause great harm.

Definition.—By feeble-minded children are meant children who are from their birth incapable of managing themselves or their affairs with ordinary prudence, and cannot learn along with normal children; but these do not include the imbeciles and the idiots. Another criterion is that the feeble-minded children, even when they grow up, possess intelligence commonly found in children of 8 to 10 years only.

The results of mental testing are expressed in accord with the classification of Intelligence Quotients.

The normal or average intelligence is represented by 90-110, whereas dullness and backwardness are represented by 80-90. Those with the range of 70-80 are included in border-line cases. These can be placed in normal schools but need more individual attention. After trial, they may be decided to be either dull or mentally deficient. The children whose range is between 50 and 70 are classed as feeble-minded. This article is concerned with the education of such children only.

The Present Situation.—Numerous studies of age-grade progress of children have shown that some of them are in the lower classes, considering their age. This offers convincing evidence of the importance of the problem of the educationally backward children. Statistics collected in an educationally advanced country like America show that about 15 per cent of the school children are retarded at least three years or more, and that about 10 per cent are retarded at least three years. It was estimated a few years ago that 40 million dollars were

change came over the boy. He could recognize objects, and read and copy words. He forsook isolation and gave preference to social life. This experiment demonstrated that a feeble-minded person could be improved by proper training.

In 1837 Seguin founded a private school in Paris for the training of the feeble-minded. Ten years later, when he went to America, he opened two such schools. His method is known as "Physiological Education". It is essentially a system of sensory-motor training designed to develop the sense organs, supplemented by moral training. The principle suggested by Madame Montessori is only a development of the "physiological education" founded by Itard and Seguin. She translated into Italian the works of both the authors and was influenced by them. This influence led her to the conclusion that "Mental deficiency presented chiefly a pedagogical rather than a medical problem", an opinion which she expressed at the Pedagogical Congress in Turin in 1898. The present day interest in the problem of mental deficiency in Italy is due to Madame Montessori's efforts. It is strange that the provision for training the feeble-minded is very meagre in France, the birthplace of the training of the mentally deficient. Separate schools have been opened for their special training in Denmark, Sweden, Germany and England. Residential institutions, special and night classes, have also been opened in these countries. Clinics have been established where educational and psychological experts measure the intelligence of the children and give the necessary directions.

The Moral Aspect.—There is also a moral aspect to the problem of training the feeble-minded. An inclination towards crime is their special weakness. The lives of hundreds of murderers, robbers, and criminals were studied, and the results of their mental tests statistically analysed. The experiments proved that more than 50% of these were feeble-minded. This shows that the feeble-minded have a special tendency to acquire criminal habits. No doubt some of these had normal and a few had high intelligence. Even a normal person can

one of superstitious reverence. They were regarded more or less as heavenly beings. The senseless silly chatter of the imbeciles was listened to as revelation of an emissary from heaven. They were allowed to roam about the streets and were offered alms, the acceptance of which was regarded as a blessing to the giver. This reverential attitude still survives in some oriental countries.

These cruelties were re-enacted after the Renaissance. Luther and Calvin openly denounced the feeble-minded as possessed of evil spirits. The feeble-minded were scourged and tortured. The process of purging was believed to torture the demons possessing the bodies of the feeble-minded. This cruel treatment proved fatal in some cases. As a result there came a great change of heart, and the crusade of cruelty was replaced by a campaign of beneficent protection. Public efforts were made for feeding, clothing and housing them. No attempt was, however, made to educate them till the eighteenth century. Bonet was the progenitor of the corrective pedagogy of the deaf, the blind and the feeble-minded. This led Pereira to experiment and find a practical solution. Their work was more or less limited to the Deaf and the Blind. These efforts influenced Itard to undertake the systematic training of the feeble-minded. His great interest in psychology led him to undertake the laborious training of the "Savage of Averon".

Pioneer Work in the Education of the Feeble-minded.—In 1800, this boy was accidently found in the woods of southern France. He resembled a wild animal. His cries were inarticulate. He selected his food by smell and drank like an animal immersing his mouth in the water. He evinced delight in the phenomena of nature, especially in thunder and lightning. He rolled nude with delight in the snow and would pick up hot coals. His sense of heat was very obtuse. It was a case of feeble-mindedness through isolation from human intercourse. Itard laboured for five years continuously. A big

Before I conclude this article, I should like to remind teachers what Goethe has said about them. 'Nothing is more frightful than a teacher who only knows what his scholars are intended to know'. We may depend upon it that the teacher who knows his subject thoroughly is the one who will succeed in stimulating interest in it in the minds of his students.

The Education of Feeble-minded Children

BY

Habeeb Ahmed Faruqi, B. A., B. T., M. Ed. (Osmania).,

Member,

National Institute of Industrial Psychology (London).

The treatment which society accorded its feeble-minded members has varied from time to time. During the ancient times the feeble-minded were regarded with indifference, contempt or aversion. They became the objects of ridicule and even cruelty. They were regarded as persons who stood outside the pale of humanity, being "accursed of God" and possessed by demons and having therefore forfeited all human rights. In Greece and Rome the feeble-minded were deliberately neglected and abandoned. Their death was considered a blessing, as it prevented racial degeneration.

Great teachers of various religions put an end to this cruel neglect. Christ pitied the feeble-minded children and St. Paul urged people to comfort the feeble-minded. The care of the feeble-minded was also enjoined by Confucious and Zoroaster. The feeble-minded thereafter became the object not only of commiseration and pity but also of tender solicitude and care.

During the Middle Ages the court-jesters were recruited from the feeble-minded. They furnished a good deal of entertainment in the castles of the rich. This attitude changed to

one should not begin with the Battle of Buxar as the starting point of the British Period, as it misleads the boys; instead it would be better to trace the rise of the British from the days of Akbar, Jehangir, and Shah Jehan. To my mind this is the correct procedure, because it provides the necessary background and lays a strong foundation to build upon.

It passes one's understanding why the Indian history books should be split up into three broad divisions as the Hindu period, the Muslim period and the British period. It would be simpler and more correct to divide our history into the Ancient, the Medieval and the Modern periods, as is done in the case of European history books.

In our State the study of history and geography received a temporary setback when these subjects were made non-examination subjects for the H. S. L. C examination. Before long, however, they were restored to their legitimate place in the school curriculum. We are grateful to our Government for its praiseworthy efforts in the direction of "decommunalizing" the teaching of history by means of text-books written with a view to presenting facts in their true perspective.

The study of history all over the world lost much of its charm owing to circumstances beyond human control. The ever increasing cry of technical and commercial education is telling very much upon the study of history. Students in every country desire to have only that knowledge which pays them. To them 'Knowledge is business'. That is the main reason why it is extremely difficult to make the students evince any real interest in history, for they think it has no direct bearing upon the practical side or work of everyday life. This mistaken notion needs to be removed. Hence falls the onerous duty upon the history teacher to make his subject very interesting. The students should be told that 'restraint and discipline, virtue and justice, form the education of the world'.

interest should be not in the dead past but in the living present, in the great human movements leading to liberty of speech and action and the reign of international peace and prosperity, which are the true measure of the world's progress and greatness.

I submit that a commission of historians of international repute should rewrite the history of India in order to ward off the effects and dangers of the communal canker which unfortunately exist at present. History books, if written without bias, can do much to unify our people. They will raise the hearts of our people to a common level of life and also tend to promote good relations with people who dwell in other parts of the world. They will be one of the best means of bringing about peace and goodwill between the different communities inhabiting our country. Further the history syllabus should be so broadened as to include a short and concise history of the world. This change will have a beneficial effect upon our students, who will know and appreciate the true worth of our civilization and its place in world culture.

In our middle school classes, history should be taught in the light of the principle enunciated by Carlyle, namely, HERO WORSHIP. Here too one should be careful not only to show the good and the bad points of the hero, but one should mix freely the topical method so as to give a complete picture by filling up the gaps. It is only in the top classes of our high schools that the students should be allowed to study history from a critical point of view. Only in these classes can one trace the constitutional development and make a more detailed study of the cultural development.

Boys should be induced to read a number of books so as to get a comprehensive picture and acquire an abiding interest in the subject. Tutorial work should be encouraged by allotting one period for it every week; one should always go back to get a complete picture of the subject; for instance,

'I want to plead for commonsense in Indian historical writings. Why are we so queasy and squeamish where India is concerned? Why do we insist on investing Indian History with the atmosphere of a boy's story? Why not regard everything, not as something to be hotly attacked or defended, but as what happened at a time when similar things were happening all over the world? We write frankly about British or European history, but in writing about India we whitewash or blackguard. And that is one reason why India bores our public more than any other subject, so that it is impossible to interest our people in anything Indian'. This remark applies equally well to some Indian historians also.

Thus we see how very important is the basis of our teaching, viz., text-books. The foundation of our national unity is undermined by the insidious statements of biassed authors who write with an ulterior motive. The wrong ideas which thus take root in the minds of our pupils in their formative and impressionable period cannot easily be rooted out afterwards. There is no doubt that the majority of our books need to be rewritten. Scientific and impartial history text-books must confine themselves to facts, and to causes and effects.

The point of view is now gaining ground that school text-books should avoid certain facts, not because they are untrue but because they are calculated to rouse passions in the boys. While the text-books should not deliberately cause ill-feelings, the facts must not be hidden from the boys, as one of the objects of teaching history is to inculcate in their minds love of truth, right and justice, and aversion to untruth, wrong and injustice; and this can be done only by placing before them a true picture of the lives and actions of the people of the past.

Now what one expects of the history teacher is that he should look to history as a beacon by which he could see the panorama of today and illuminate its meaning. His real

his stamp. The keynote of the schools is the propagation of his pet gospel, however bad it may be.

With the war looming large and the poisonous propaganda of our enemies increasing every day, India is passing through a critical period. Provincial autonomy has already been introduced. With the growth of democracy, the importance of the teaching of history has increased. Our students are the future leaders of our country, and they should be trained to be real citizens, capable of shouldering responsibilities. Eminent thinkers like Prof. E. Barker, Prof. Trevelyan and Mr. H. G. Wells have often laid emphasis on the fact that history must be approached without any dominating passion, that it should not be used as a means of propaganda even in the best cause and that in the matter of education for citizenship the teaching of history is of primary importance, but it is a pity that the subject is not properly handled in schools.

One can imagine no greater error than the one made in the teaching as well as in the writing of history, particularly the History of India. It is the clear duty of the teacher to place before his students only plain facts without allowing his point of view or prejudice to intrude. He should do nothing to rouse the passions or to embitter the feelings or strain the relations subsisting between the two major communities.

Supposing that for all practical purposes the teacher remains neutral, will that be of any use? We doubt it very much, as the text-books in use in our schools possess one great drawback. They were written with a definite object in view and so they are not useful. There are some European, Hindu and Muslim historians who have risen above the narrow confines of prejudice and passion, and have furnished a wonderful example of impartiality. Among them stands Prof. E. Thompson, the well-known joint-author of the 'Rise and Fulfilment of the British Rule in India'. With reference to the history books written by European scholars, he says:

The Teaching of History in India

BY

K. Sajun Lal, M. A., Dip. Ed., F. R. S. A.,

Assistant, Govt. High School, Chaderghat.

History means the narrative record of the course of the world's affairs. In its original and strict sense History means 'Enquiry or learning by enquiry, or knowledge gained by a process of enquiry'. It enquires into all such relics and records of the past as seem likely to assist in the explanation of the present.

With the growth of an impartial spirit, a marked change has taken place in the conception and the function of history. Carlyle's conception of HERO WORSHIP was predominant for a period. In the mid-Victorian period there arose a new cry, 'History is past politics, politics is present history'. Thus a narrow conception of history continued up to the time of Lord Acton, who propounded a new conception. 'Ours is a domain,' he said, 'that reaches farther than the affairs of the state and is not subject to the jurisdiction of government. It is our function to keep in view and to command the movements (of ideas) which are not the effect but the cause of public events'. 'The study of history', says Prof. Allen, 'is capable of stimulating, of widening and assisting thought in many ways'. He, however, deprecates the attempt to use it for emotional, ethical or political ends. The result of this is that history acquired a wider and loftier conception. Its study widens the mental outlook and elevates character by bringing the students into contact with the great and high. Hence a knowledge of history is necessary in order to possess a balanced conception of the world, taken as a whole. Therefore, the teaching of history should be based on a wider conception of the subject.

In a Totalitarian state the Dictator commandeers the universities and the schools, and orders the writing of history books according to his pet theory. The history books bear

The above Table will give the relation between the *Mean Time* and the *Apparent Time* shown by the sun-dial in any part of India. If you want to observe the local time only, all you have to do is to set your watch faster or slower than the sun-dial according to the figures given for different dates. But if you want to observe Indian Standard Time you will have to correlate these figures with the differences due to longitude. For example on the 1st of January the dial time in Raichur will be 3 minutes behind the mean time (according to Table given above); but Raichur mean time is itself 20 minutes behind Madras or Standard Time. So the dial time in Raichur on the 1st of January will be 23 minutes behind Indian Standard Time. With similar calculations a Table of Figures can be prepared giving the direct relation between the dial time and Indian Standard Time, by which on any day of the year a watch can be set with the help of the readings shown by the dial.

In order to show the Standard or Local Mean Time along with the Dial Time we have found a simple device quite effective: We had a tin sheet prepared with a simple revolving hand in the centre. This is posted on an Iron rod close to the sun-dial and the man responsible for striking the hours sets it every three or four days according to the Table which is written on a plate below, so that any observer by seeing the shadow of the style and the face of this clock can at once ascertain for himself the Apparent Time, Local Mean Time as well as Indian Standard Time.

Conclusion.—Perhaps all this looks too complicated a business when you are reading it. But try to put it into practice and you will find the whole process as simple as playing marbles. Let us hope that in the next two or three years every village school in the Dominions will be able to observe the hours as correctly as the Railways!

the difference of longitude between Madras and Raichur is approximately 5 degrees, and the difference between the mean local times of the two places will be 20 minutes. If you want to observe the local mean time in Raichur all you have to do is to set your watches 20 minutes slower than the Indian Standard Time.

But the problem brought to you consists of ascertaining the *Local Mean Time* and the *Standard Time* from the Local Apparent Time as shown by the sun-dial which differs from season to season, sometimes running behind and sometimes in advance of the Local Mean Time. Fortunately mathematicians have given us a table of figures showing the difference between the mean time and apparent time on any day of the year, so that by merely adding or substracting figures we can keep our watches correct even with the help of the inconsistent sun-dial. This Table is given below.

Table giving for every third day in the year the correction to the nearest minute to be added to or substracted from Local Apparent Time according as the sign is + or − in order to get Local Mean Time.

Date	January	February	March	April	May	June	July	August	September	October	November	December
1	+ 3	+14	+13	+ 4	− 3	− 3	+ 4	+ 6	0	− 11	− 17	− 11
4	” 5	” 14	” 13	” 3	” 4	” 2	” 4	” 6	− 1	” 11	” 17	” 10
7	” 6	” 14	” 11	” 2	” 4	” 2	” 5	” 6	” 2	” 12	” 16	” 9
10	” 8	” 15	” 11	” 2	” 4	” 1	” 5	” 5	” 3	” 13	” 16	” 7
13	” 9	” 15	” 10	” 1	” 4	0	” 6	” 5	” 4	” 14	” 16	” 6
16	” 10	” 15	” 9	0	” 4	+ 1	” 6	” 4	” 5	” 15	” 15	” 5
19	” 11	” 14	” 8	− 1	” 4	” 1	” 6	” 4	” 6	” 15	” 15	” 3
22	” 12	” 14	” 7	” 2	” 4	” 2	” 6	” 3	” 8	” 16	” 14	” 2
25	” 12	” 14	” 6	” 2	” 4	” 3	” 7	” 2	” 9	” 16	” 13	0
28	” 13	” 13	” 5	” 3	” 4	” 3	” 7	” 1	” 10	” 16	” 12	” 2
31	” 14		” 5		” 3		” 6	” 1		” 17		” 3

correct your watch every day in spite of the misleading shadows of the sun.

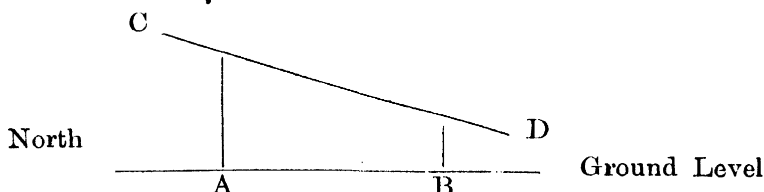
The Finer Corrections.—Now let me address myself to the Inspectors of Schools. I shall not try to give you, gentlemen, a lecture on elementary astronomy. For I myself know precious little about it except what I have gathered after I began my trials with simple sun-dials.

You probably know already that there are three kinds of time: *Apparent Local Time* as indicated by the Sun-Dial; *Mean Local Time* which is the average time of the year and lastly the *Standard Time*, out of which if any *one* is known, the other two can be calculated with the help of figures that astronomers supply us. You also know what Standard Time is: for the convenience of railway timings the Local Mean Time at Madras has been fixed as the Standard Time for the whole of India, and that is what is known as the Indian or Railway Standard Time In other words, the local mean time differs from the Indian Standard Time in all places except in Madras and along the longitudinal meridian which passes through that city; and the difference amounts to 4 minutes for every degree of longitude that the place in question is away from Madras. For example according to the Indian Standard Time the sun rises 40 minutes later in Bombay than in Madras because Bombay is about 10 degrees away from Madras.

So let us return to our uncorrected sun-dial. Suppose a schoolmaster comes to you from a village near Raichur and complains of the misbehaviour of his sun-dial. He is sure that his watch runs correct to the second and yet the sun-dial does not show the same time. What would you do?

You will first look up a map or better still ascertain the longitude of Raichur from a gazetteer. You will find that the figure given is 77° 24′ 37″. Now the longitude of Madras, upon which is based the Indian Standard Time, is 82° 30′, so

grooves so that this points exactly to the North Star. When finished, the structure will be somewhat like this :

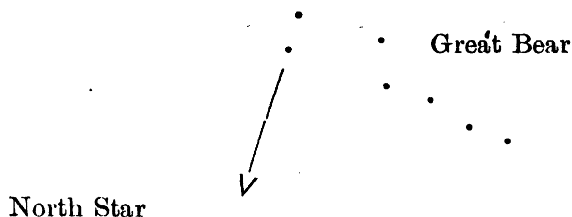


Now you may go to sleep and come and see what happens the next morning and at each hour during the day. If you are early enough you will see the sun rise in the East. The shadow of the rod CD will at first be blurred, and only gradually—say at seven o'clock—will it become more or less distinct. But don't do anything yet. Wait till noon and when the shadow of the rod CD corresponds with the shadows of the verticals then make a mark with chunam on the ground.* Then keep looking at your watch every hour and mark every hour: one, two, three and so on just as you marked 12. Then if you can be sure of your watch for one day, come next morning and mark out 7 a. m. till noon.

If you keep watching this for two or three days you will think that you have obtained a perfect clock ; but no, in a week or so you will discover that you have to correct your pocket watch every day. But don't throw away that watch : it is the dial that is showing the incorrect time. So instead of going to a watch-maker go to your Inspector of Schools and complain against the vagaries of the Sun. He will tell you that the Sun is not as punctual as he seems : he sometimes comes up a few minutes earlier than he is expected and sometimes is a few minutes late. And that having caught the Sun being unpunctual, he has himself made up a table showing how much grace should be allowed to that heavenly body on every day of the year. So you can go home with that and

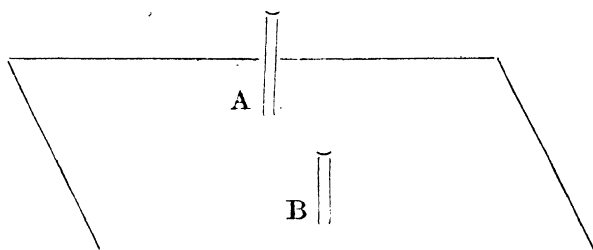
*You will be surprised to learn that there are only four auspicious days in the year for marking the hours of your dial ! They are 15th April, 13th June, 1st September and 25th December. If you mark it on other days the dial will not always show the perfectly correct time. The explanation of this is given in the latter part of this paper.

Then if you look again say at 10 at night they will be like this :



Now what you have to notice is that the two end stars of the Great Bear always point to the North Star. So if you have once discovered the Great Bear you can easily discover for yourself the North Star.

Once having discovered the North Star our next problem is to obtain a line on our cleared space pointing to it. Suppose the rectangle below represents a side view of the rectangle you have cleared :



Then take one of those wooden beams 1″ by 2″ by 4 ft. or iron rods* and stick one vertically in the ground at A. See that there is a little groove as shown, on the upper end of the verticals. Then take the other piece of wood or iron and stick it likewise at B, that is, in such a position that the two verticals are in line with the North Star. What you have to try and do is to see the North Star through the grooves of these verticals. For this you will have either to choose a smaller beam for position B or bury it deeper in the ground. Then all you have to do is to put in a third straight beam on these two

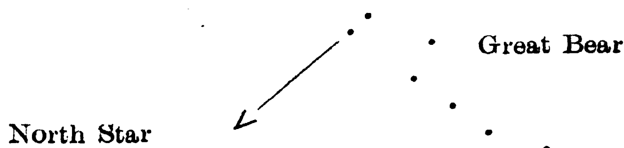
*Two iron rods with loops above serve the purpose even better; you can see the North Star through the loops before putting in the rod.

it, and also because it is he who will have to do the initial laying out, I will first address myself to the village school teacher himself.

The matter is very simple. Any space of level ground of any size can be used for the purpose. The larger the better—the most convenient size being anywhere between 5 to 15 feet in breadth and 10 to 30 feet in length—the length being along the east-west direction.

After this space is cleaned and fairly levelled comes the problem of constructing the style. Take two pieces of wood say 1″ to 2″ thick, or better still iron rods of ½″ diameter, and in either case 3 to 4 feet long. You have now to stick these upright a little distance from each other, in the centre of the cleared space and parallel to the north-south line. A small compass will help but is not accurate enough, and of course you do not possess engineering instruments. So after we have cleared the space let us postpone our work to the evening when the stars come out, and we will invite the help of the North Star.

Can you recognize the North Star ? Well, you can easily discover it. It shines every night on the Northern horizon, and for all practical purposes never changes its position. The Great Bear (I do not know why it is given that name), consisting of a group of seven bright stars, revolves round this in the opposite direction to the hands of a clock. If you look, say at 8 in the evening, you will find their relative positions something like this :



Simple Sun-Dials for Village Schools

BY

Dr. Amir Ali, Ph. D.

Chief Marketing Officer, Hyderabad Deccan.

Introduction.—Keeping regular hours is one of the big problems of small schools. In out-of-the-way village schools there is no bell to muster the pupils and no bell to announce the end of the school hours. And this for the simple reason that there are no means to correct watches or clocks even if there are any. In villages that see the trains or motor buses go by, the school master can, perhaps, keep a watch; but there are many more villages that do not have these visitors from the outside world than those that have.

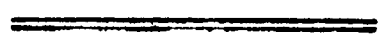
The time of attendance in such out-of-the-way schools is therefore haphazard. The children straggle in after they have had something to eat in the morning and the school closes for mid-day when the school teacher begins to feel hungry: the same thing is repeated in the afternoon. Lessons naturally have to be repeated to children who come late.

In a country like ours where the sun shines almost every day of the year, sun-dials would solve the problem, but these are not used, either because the teachers do not know about them or because constructing them is considered too intricate or too costly a problem. What is intended in this article, therefore, is to show how, with hardly any or no cost at all, a sun-dial can be made by the village teacher himself and, with a simple table of figures that could be supplied by the inspector of schools, the time of day can be read in every village almost to the minute.

The Clock which the Schoolmaster can Make.—Since a cursory understanding of the principles involved is necessary for the schoolmaster in order that he may take interest in

'I never had heard my father's or mother's voice once raised in any question with each other; nor seen an angry, or even slightly hurt or offended glance in the eyes of either. I had never heard a servant scolded; nor suddenly, passionately, or in any severe manner, blamed. I had never seen a moment's trouble or disorder in any household matter; nor anything whatever done either in a hurry or undone in due time. I had no conception of such a feeling as anxiety;......... my father's occasional vexation in the afternoon was never manifested to *me*'.

Is there any chance for us Indians to secure, on this side of eternity, such a serene and heavenly atmosphere in our homes?



About discipline in boys' schools the less said the better. Thomas Love Peacock says in his well-known poem, *The Priest and the Mulberry Tree*, 'Much that well may be thought cannot wisely be said'. Nevertheless, I beg leave to draw the attention of all those interested in the question to the series of articles which I have been contributing to *The Hyderabad Teacher* under the caption *"Some Aspects of School Discipline, Punishments and Organisation". I wish to point out in passing that it is only an educational fiction which says that every child is an angel as it is only a human frailty which imagines that every woman is a goddess of beauty. An Irish humorist says that every human being—consequently, every child—is made up of *the pig*, *the pirate* and *the poet.* This, I suppose, means that in every child is to be found some perversity, the depredatory instinct, and probably also a touch of insanity : 'insanity' because the dramatist, Shakespeare, proves conclusively in his play, [1]*A Midsummer Night's Dream*, that *the lunatic*, *the lover* and *the poet* are all first cousins, if not blood brothers. Even such a refined and delicately formed educationist as John Ruskin and other Victorian writers[2] like the Brontë sisters have owned their reluctant faith in the ultimate efficacy and triumph of the rod.

Talking of Home Environment, I may say that the Greek philosopher, Diogenes, who lived in the third century B. C., slapped a father in the face for his son swearing in the father's presence as a result of bad training at home. Irresponsible parents are now safe from being treated in this way for the reason that there is no Diogenes in the world today.

I shall conclude my talk with a few lines from John Ruskin (1819-1900), on *Serenity.*

---

*Vide Vol. XIV No. 4 and Vol. XV Nos. 1, 2, and 4.

1. Act V. Sc. 1. ll. 7 to 18.

2. Please see, 'Stories of the Victorian Writers', by Mrs. Hugh Walker, (Cambridge University Press).

I think that the educational theory that Education is a preparation for life has been blown up sky high in recent years.* The average life of an Indian is 21 years and, if this theory holds, then few Indians will have the life or the time needed to get educated. *Education is living life.* It must be related to the child's life and it must help him to make it richer and fuller. This naturally takes us on to the question of punishments. School punishments are, I submit, a necessary evil. If there is to be no punishment, there can be no forgiveness. One is the antithesis of the other. Like the quality of mercy, the quality of forgiveness also '*is not strained*'.

The moral conscience of the world has not yet enabled nations to abolish capital punishment. Russia abolished it a few years ago but has revived it now. The substitution of the electric chair for the rope does not mark an advance in civilisation or a rise in the standard of morality. It has probably made death alluring and multiplied capital crimes. Corporal punishment in schools must be resorted to at least as sparingly as courts resort to a death sentence. By dispensing with the cane altogether we have little reason to feel complacent and to consider ourselves virtuously modern. It must be a rare school indeed where the headmaster could always wear the white gloves.

In the European schools in India discipline is of a very high order, but caning is by no means infrequent. In other Boys' schools in India, the authorities seem to be '*willing to wound but afraid to strike*'.

In girls' schools discipline is as a rule exemplary, not because of the matronly treatment of the mistresses, but because girls are by nature more modest and responsible, and know, by instinct, how to look after their interests better.

---

*Please read in this connection the article, 'Peace Through Education', by Dr. Maria Montessori, reprinted in *The Hyderabad Teacher*, Vol. XIV No. 1, from the Visva Bharathi Quarterly, February—April, 1939.

the headmaster of Eton when the battle of Waterloo was won and he ceased to hold that office just 90 years ago.

The school at Rugby was raised to the status of a Public school only during the time of Dr. Thomas Arnold (1795-1842), who was its headmaster from 1828 to '42. Before him there was another who used to shout to his pupils: 'You are all very bad and mischievous. God Almighty is displeased with you, and *so am I!*' Thus he arrogated to himself a seat next to Almighty God in heaven. In any case, he wished to inspire in them the same degree of fear for him as for God.

Bernard Shaw is now 85 and he claims to be the best educated man today because he ran away from school before he was 14!

Coming to the teacher of the present day, I may recall what Charles Lamb says in his essay, *The Old and the New Schoolmaster* (Essays of Elia). He remarks 'that a teacher is awkward, out of place, and not at all at ease in the presence of his equals. ....He comes like Gulliver from among his little people........and is so used to teaching that he wants to be teaching them'. I am not sure whether the position today is in any way different. There is certainly an aloofness on his part, a withdrawing into himself as God Almighty into heaven. Stanley Baldwin declared a few years ago that democracy was two years behind the Dictators. We are, I fear, constrained to admit that schools are at least half a century behind the world outside. Let us hope that when Washington Irving wrote his *Rip Van Winkle*, he did not have any schoolmaster in his mind. A writer of this century opines that a schoolmaster is only a grown up, not a growing, schoolboy. He passes out of the school, enters the college, then again is back at school. He is unreceptive, unprogressive and retrograde in actual deeds.

Discipline at the present day seems to be based on the *Casket Theory*, the theory of chance and the policy of drift.

commanded the respect of his pupils, who used to peep through the key-hole and listen to him calling his 48-year-old bride by the endearing appellation of *Tetty or *Tetsy.

Mr. Wilder was an usher when Oliver Goldsmith (1730-74) was a sizar in Dublin University. Goldsmith was always in penury. But when on one occasion he had some money, he invited some women of the city for a party which proved too noisy and unwelcome to Mr. Wilder. He ran up, broke up the party and flogged Goldsmith, which made him leave the University immediately. His experience with school-masters has given us the 20 immortal lines in his poem, *The Deserted Village*, beginning with :

'A man severe he was, and stern to view'.,

John Keate (1773-1852) was appointed headmaster of Eton in 1809, which post he held for 43 years This gentlemen not only considered the flogging block a necessary station on the road to perfection but beat hollow Nicholas Udall, Richard Busby and Hunter. For while they acted on the advice of Solomon the Wise—*Spare the rod, spoil the child*—this unique little man seems to have acted on the well-known saying,

'A woman, a spaniel, and a walnut tree,
The more you beat them, the better they be!'

He prided himself upon having flogged half the number of ministers, bishops, generals and dukes in the land! There existed a family resemblance between Hunter and this man. John Keate used to threaten his students saying, 'Now, boys, be pure in heart! For, if not, I'll flog you until you are!' To his credit or otherwise it must be said that on one occasion he flogged 80 students at a sitting, and on another he marched all the students of the school into the quadrangle and flogged every one of them! It is of special significance that he was

*Like *Betty* or *Betsy*, a provincial contraction for *Elizabeth*.

very great man. I should have gone to him myself, if I had not been a blockhead: a very great man '"

Dr. Johnson (1709-84) had an instructor in English by name Tom Brown. This gentleman published a spelling-book and dedicated it to the UNIVERSE. But the copies of the book became extinct in his own time!

In Lichfield he studied Latin under Mr. Hunter, 'who was very severe, wrong-headedly severe'. He used to flog his students unmercifully, not distinguishing between their ignorance and negligence, saying that he flogged them 'to save them from the gallows!' Dr. Johnson himself owned that Mr. Hunter whipped him very well and that without it he could not have managed to acquire so accurate a knowledge of Latin as he possessed.

In Lincolnshire he once noticed the behaviour of some young ladies to be exceptionally good. He thought it must have been due to the strict discipline and severe correction of their mother at home. Then he expressed himself thus: 'O rod, I honour thee for this, thy duty!' Educational psychology insists upon the appeal to the child's imitative instinct and competitive spirit, but Dr Johnson says: 'The rod produces an effect which terminates in itself. A child is afraid of being whipped, and gets his task done, and there is an end of it; whereas, by exciting emulation and comparisons of superiority you lay the foundation of lasting mischief; you make brothers and sisters hate each other'. It must be borne in mind that no man has studied so much of literature or seen so much of life as Dr. Johnson.

Dr. Johnson opened a private school at Edial and called it an *'Academy'. The only pupils he had were the celebrated Shakespearean actor, David Garrick, and his brother, George, and a Mr. Offley. Dr. Johnson does not appear to have

*Originally, the garden near Athens in which the Greek Philosopher, Plato (428-347 B. C.), taught.

(Mrs. Page, William—her son, Sir Hugh Evans—William's Teacher).

Mrs. Page. Sir Hugh, my husband says my son profits nothing in the world at his book. I pray you, ask him some questions..............

Evans. Come hither, William; hold up your head; come.

Mrs. Page. Come on, sirrah; hold up your head; answer your master, be not afraid.

Evans. ......What is 'lapis,' William?

William. A stone.

Evans. And what is 'a stone,' William?

William. A pebble.

Evans. No, it is 'lapis'; I pray you, remember in your brain.

William. Lapis.

Evans. That is a good William.

Can anything be more damaging or more scathing?

'Lapis is stone, stone lapis—that is all

William knew on earth, and all he needed to know'*—

according to his master, Sir Hugh Evans, of course!

Richard Busby (1606-95) was the headmaster of the Westminster school from 1638-95, that is, for nearly 60 years! He was the greatest beater of his time. The poet Dryden, the philosopher John Locke, and Francis Atterbury, the bishop of Rochester, were among the great men who had the honour of tasting his big rod. He was buried, not in St. Peter's as a criminal nor in the street corner as an untouchable, but in Westminster Abbey, among the celebrities of England. The respect he inspired even among the people of the next century may reasonably be inferred from the words which Joseph Addison (1672-1719) puts in the month of Sir Roger de Coverley when the latter visited Westminster Abbey. Standing before Busby's tomb, the Knight ejaculated: "Dr. Busby, a great man: he whipped my grandfather: a

*In feeble imitation of Keats's famous lines:
'Beauty is truth, truth beauty—that is all
Ye know on earth, and all ye need to know.'

Some Facts about School Life.

It is the Englishman's boast that the battle of Waterloo was won on the playing fields of Eton. Waterloo was won on 18th June, 1815, while Eton College was founded by Henry VI in 1441. Consequently, this saying, which is ascribed to the Duke of Wellington, must have gained currency only in the nineteenth century. One must not forget, however, that great battles have often been won in spite of the commanders, even as some schools manage to produce good results in spite of the arrangements in force.

Nicholas Udall (1505-56), scholar and dramatist, was successively headmaster of Eton and Westminster. He used to flog his students 'for faults but small or none at all'. He is not known to have spared the rod and consequently to have spoilt the children in his care. While at Eton he got into grave trouble—not for flogging, though, which was the order of the day—and was sent to the *Marshalsea by the Privy Council. While at Westminster he wrote *Ralph Roister Doister*, the earliest known English comedy.

We may reasonably infer from Shakespeare's works that in his days the schools were very unattractive, teachers ignorant and the methods of teaching crude. He says in *As You Like It:*

'Then the whining schoolboy, with his satchel
And shining morning face, *creeping like snail*
Unwillingly to school'.

Elsewhere he says:

[1] 'Love goes from [2] love as schoolboys to schools with heavy looks,

[1] Love goes to [2] love as schoolboys from their books!'

Then this is what we find in *The Merry Wives of* Windsor, Act IV., Sc. 1.

---

* The prison of the Royal Household which existed from the time of Edward III and was abolished in 1842, by Queen Victoria.

1. Lover.
2. Beloved.

*phoenix, that every street swarms with children, that the poorest people have them in most abundance, that every marriage is blessed with at least one child, that they often turn out ill and take to vicious courses in after life and so there can be no cause for pride in having them!' But, of course, he does not intend his readers to take him seriously.

As against this, I shall now give the opinion of George Eliot (1819-80), a virtual spinster, who married at the age of 61 and died a few months afterwards. According to her, a married man is absorbed in his own children, whereas a bachelor has the freedom and the imagination to look upon the children of his relations and friends as his own. Therefore she says:

'A bachelor's children are *always* young; they are *immortal*, always lisping, waddling, *with a chance of turning out good*'. As every one knows, it is one thing to be blessed *with* children and quite another to be blessed *in* them.

Leaving these bachelors to their 'single blessedness', if we turn to the American Philosopher-Poet, Longfellow (1807-82), we have something very pleasing and refreshing. He says:[1]

'Children are living poems
And all the rest are dead:
What would the world be to us
If the children were no more?
We should dread the desert behind us
Worse than the dark before'.

Coming to our own times, the genesis or the birth of a child is still a purely private and domestic affair; but his upbringing and education are beginning to be looked upon as an international concern.

---

*A mythical bird, the only one of its kind which, after living 5 or 6 centuries in the Arabian desert, burnt itself on a funeral pile and rose from the ashes with renewed youth to live through another cycle.

1. In his drama, *The Spanish Student*.

company exceedingly unpleasant. Soon after murdering Duncan, Macbeth entered his wife's room with the bloody dagger still in his hand and cried in a frenzy:

'I'm afraid to think what I have done;

Look on't again I dare not'.

Supposing a parent is to have the company of his little one only on the condition implied in Boswell's question to Dr. Johnson, I wonder whether his feelings would be any way different from Macbeth's. In plainer words, will he not be tempted to say that he has made a mistake and that he will not repeat it?

According to Oliver Goldsmith (1730-74), the contemporary and friend of Dr. Johnson, it would seem that the man with a number of children breathes the true patriotic spirit; not only that: the number of children a person has is a direct and correct measure of this spirit. For this is what he says in his *Vicar of Wakefield*. 'I was ever of opinion that the honest man who married and brought up a large family did more service to his country than he who continued single.....', and further on: 'when I stood in the midst of my little circle,........ I could not avoid repeating the famous story of the German Count who, during the Emperor's progress through the country, while other courtiers came with their treasures, brought *his thirty-two children* and presented them to his sovereign as the most valuable offering he had to bestow etc.'

Goldsmith was an Irish bachelor, and his sentiments naturally reveal the broad human sympathy and sincerity characteristic of his nation.

An English bachelor, Charles Lamb (1775-1834) in his essay, *A Bachelor's Complaint of the Behaviour of Married People* (Essays of Elia), remarks that 'a child is not a

The Hyderabad Teacher

CONTENTS

VOL. XVI. No.

THE HYDERABAD TEACHER

APRIL—JUNE 1942

Quarterly Magazine of the All-Hyderabad Teachers' Association
Under the Patronage of
SYED MOHAMED HUSSAIN JAFERI, Esq., B. A. (Oxon).
Director of Public Instruction.

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD
1942

The Hyderabad Teacher

CONTENTS

The Hyderabad Teacher

EDITORS' NOTICE.

Articles meant for publication in this Journal must be addressed to the *Editor-in-Chief*. They should be either typed or written legibly in ink and signed by the author giving in full his or her address. The *Editorial Staff* does not necessarily share the views expressed in the articles published, but it reserves to itself the right to make such alterations in the articles received as it may deem necessary and proper before publishing them, and also to withhold their publication without assigning reasons. Original articles containing practical suggestions bearing on topics of general or educational interest will be very much appreciated. When an article is not approved, it will be returned to the author provided it is accompanied by a stamped and addressed envelope. When it is approved, a complimentary copy of the issue in which it appears will be sent to the contributor.

MANAGER'S NOTICE.

Subscription Rates.

	For H. E. H. the Nizam's Dominions including postage.						For British India including postage.					
	Per annum.			Per copy.			Per annum.			Per copy.		
	O. S.			O. S.			B. G.			B. G.		
	Rs.	As.	Ps.	Rs.	As.	Ps	Rs.	As.	Ps.	Rs.	As.	Ps
English & Urdu Sections combined ...	3	0	0	0	12	0	3	0	0	0	12	0
English Section separately ...	2	0	0	0	8	0	2	0	0	0	8	0
Urdu Section separately ...	1	12	0	0	8	0	1	14	0	0	8	0

Members of any of the Teachers' Associations affiliated to The All-Hyderabad Teachers' Association may obtain back numbers of *The Hyderabad Teacher* at concession rates.

Advertisement Rates.

Space.	Whole Year.			Six Months.			Per Issue.		
	B. G.			B. G.			B. G.		
	Rs.	As.	Ps.	Rs.	As	Ps.	Rs.	As.	Ps.
Full page ...	12	0	0	6	0	0	4	0	0
Half page ...	6	0	0	3	8	0	2	0	0
Quarter page ...	3	0	0	1	12	0	1	0	0
Per line ...	0	10	0	0	8	0	0	6	0

Address.—

D. P. I's. OFFICE,

HYDERABAD-DECCAN.

VOL. XVI. No. 3

THE

HYDERABAD TEACHER

JANUARY—MARCH 1942

Quarterly Magazine of the All-Hyderabad Teachers' Association

Under the Patronage of

SYED MOHAMED HUSSAIN JAFERI, Esq., B. A. (Oxon).

Director of Public Instruction.

SECUNDERABAD-DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD

1942

The Hyderabad Teacher

CONTENTS

The Hyderabad Teacher

EDITORS' NOTICE.

Articles meant for publication in this Journal must be addressed to the *Editor-in-Chief.* They should be either typed or written legibly in ink and signed by the author giving in full his or her address. The *Editorial Staff* does not necessarily share the views expressed in the articles published, but it reserves to itself the right to make such alterations in the articles received as it may deem necessary and proper before publishing them, and also to withhold their publication without assigning reasons. Original articles containing practical suggestions bearing on topics of general or educational interest will be very much appreciated. When an article is not approved, it will be returned to the author provided it is accompanied by a stamped and addressed envelope. When it is approved, a complimentary copy of the issue in which it appears will be sent to the contributor.

MANAGER'S NOTICE.

Subscription Rates.

	For H. E. H the Nizam's Dominions including postage.						For British India including postage.					
	Per annum.			Per copy.			Per annum.			Per copy.		
	O. S.			O. S.			B. G.			B. G.		
	Rs.	As.	Ps	Rs.	As.	Ps	Rs.	As	Ps	Rs.	As.	Ps
English & Urdu Sections combined ...	3	0	0	0	12	0	3	0	0	0	12	0
English Section separately ...	2	0	0	0	8	0	2	0	0	0	8	0
Urdu Section separately ...	1	12	0	0	8	0	1	14	0	0	8	0

Members of any of the Teachers' Associations affiliated to The All-Hyderabad Teachers' Association may obtain back numbers of *The Hyderabad Teacher* at concession rates.

Advertisement Rates.

Space.	Whole Year.			Six Months.			Per Issue.		
	B. G.			B. G.			B. G.		
	Rs.	As.	Ps.	Rs.	As.	Ps	Rs.	As.	Ps.
Full page ...	12	0	0	6	0	0	4	0	0
Half page ...	6	0	0	3	8	0	2	0	0
Quarter page ...	3	0	0	1	12	0	1	0	0
Per line ...	0	10	0	0	8	0	0	6	0

Address .—

D. P. I's. OFFICE,

HYDERABAD-DECCAN.

VOL. XVI NO. 2

THE

HYDERABAD TEACHER

OCTOBER—DECEMBER 1941

Quarterly Magazine of the All-Hyderabad Teachers' Association
Under the Patronage of
SYED MOHAMED HUSSAIN JAFERI, Esq., B. A. (Oxon).
Director of Public Instruction.

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD
1941

The Hyderabad Teacher

CONTENTS

PAGE

Vol. XVI N

THE

HYDERABAD TEACHER

JULY—SEPTEMBER 1941

Quarterly Magazine of the All-Hyderabad Teachers' Association
Under the Patronage of
SYED MOHAMED HUSSAIN JAFERI, Esq., B. A. (Oxon).
Director of Public Instruction.

Editorial Staff

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD
1941

THE HYDERABAD TEACHER

OL. XVI. NO. 1.

SECUNDERABAD-DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD

1941